سندھی ادب
کی
مختصر تاریخ
ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی

انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی پبلیکیشن نمبر ۹۸

سندھی ادب کی مختصر تاریخ

ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی (تمغۂ امتیاز)

ایم. اے (سندھی)، ایم. اے (اسلامک کلچر)،

ایم . اے (رلیجن)، ایل ایل . بی، پی ایچ . ڈی

مترجم

حافظ خیر محمد اوحدی

ناشر

انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی - سندھ یونیورسٹی - جام شورو

اشاعت اول

جولائی ۱۹۸۳ع
شوال ۱۴۰۳ھ

تعداد ایک ہزار

کور ڈزائن: خدابخش ابڑو

قیمت: ۶۰-۰۰ روپئے

اعجاز محمد صدیقی، منیجر، سندھ یونیورسٹی پریس، حیدرآباد سندھ نے طبع کیا
اور ڈاکٹر غلام علی الانا، پروفیسر انچارج، انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی،
سندھ یونیورسٹی، نیو کیمپس، جام شورو نے شایع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف ناشر

انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی کے اغراض و مقاصد میں ایک اہم مقصد یہ بھی شامل ہے کہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں قربت اور ہم آہنگی کے فروغ کے لئے کام کیا جائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر یہ ادارہ نہ صرف سندھی زبان میں کتب شایع کرتا ہے بلکہ اس ادارے نے اب تک اردو، پنجابی اور انگریزی زبانوں میں بھی کتابیں شائع کی ہیں۔ اردو میں جو کتابیں شایع کی گئی ہیں ان میں سندھی زبان کے دو اہم شعرا شاہ عبداللطیف بھٹائی اور شیخ ایاز کے کلام کے منظوم اردو تراجم شامل ہیں۔

اردوداں طبقے کی یہ دلی خواہش رہی ہے کہ سندھی ادب کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائیں جس کا اس ادارہ کو پورا احساس رہا ہے۔ وقتاً فوقتاً اس انسٹیٹیوٹ سے گذارشات بھی کی گئیں کہ اردو زبان میں ایک ایسی کتاب شائع کی جائے جو سندھی ادب کا مکمل احاطہ کرتی ہو۔ چنانچہ اس خلا کو پر کرنے کی غرض سے "سندھی ادب کی مختصر تاریخ" شائع کی جا رہی ہے جو سندھی زبان کے مشہور محقق، نقاد اور علمی حلقوں کی معروف شخصیت ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی کی تصنیف کردہ ہے۔

کتاب کی افادیت کے پیش نظر اس میں ایک جامع اور مفید اشاریہ شامل کیا گیا ہے جو جناب اعجاز محمد صدیقی، منیجر، سندھ یونیورسٹی پریس کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلے میں یہ ادارہ جناب اعجاز محمد صدیقی کا مشکور ہے۔

ہمیں امید ہے کہ اس مشترکہ کوشش کو ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور اس پر از معلومات کتاب کو قارئین میں مقبولیت حاصل ہوگی۔

ڈاکٹر غلام علی الانا
پروفیسر انچارج۔ انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی
سندھ یونیورسٹی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

سندھی ادب ایک وسیع سمندر کے مانند ھے، جس کا احاطہ کرنے کے لئے کئی ضخیم جلدیں درکار ھیں۔ لیکن موجودہ تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس وسیع ذخیرہ کو اِس ایک جلد میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کو لکھنے کی اصل غرض یہ ھے کہ سندھی ادب کے تدریجی ارتقاء کا مختصر خاکہ اور موثر جائزہ زمانۂ حال تک پیش کیا جائے۔ اس کے ساتھہ یہ وضاحت بھی کی گئی ھے کہ ایک عھد کے اثرات دوسرے عھد پر کیا پڑے اور ایک شاعر نے دوسرے شعراء سے کیا اثر قبول کیا اور ھم عصر شعراء کے باھمی روابط کس نوعیت کے تھے۔ اس سے مختلف ادوار کی مختلف ادبی خصوصیات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اس کے ساتھہ ھی یہ بھی پتہ چلے گا کہ ایک دور کی روایات دوسرے دور میں کس طرح کارفرما رھی ھیں۔ نیز مختلف تحریکوں، اصناف سخن اور اسلوب بیان کی ابتدا اور ان کا ارتقاء کس طرح ھوا، اور ان میں انفرادیت، اجتماعیت اور روایات کا امتزاج کس صورت میں رونما ھوا ھے۔ اس کے ساتھہ ھی تاریخی حالات و واقعات کو بھی مختصر طور پر مگر جامع انداز میں پیش کیا گیا ھے۔ اُن تصورات اور خصوصیات کو بھی ظاھر کرنے کی کوشش کی گئی ھے، جن کا اثر زمانہ نے قبول کیا تھا۔

میں نے کوشش کی ھے کہ ادب کو سیاسی، سماجی اور تھذیبی پس منظر میں پیش کروں، جس سے سندھ کے معاشی اور معاشرتی حالات کی عکاسی بھی ھو۔ پیش کش کا انداز زیادہ تر تاثراتی اور تجزیاتی ھے۔

وضاحت کے لیے، اور اپنی بات کو مدلل بنانے کے لیے مختلف شعراء کے اشعار اصلی حالت میں سندھی زبان میں درج کیے گئے ھیں، اور پھر ان کا اردو ترجمہ دیا گیا ھے۔ یہ لفظی ترجمہ ھے۔ اس سے شعر کا صحیح مفہوم سمجھنے میں مدد ملے گی۔ مترجم نے سندھی ابیات کا ترجمہ کرتے وقت مجھ سے مشورہ کیا تھا۔ اشعار کا نثری ترجمہ ھم دونوں کی ملی جلی کوششوں کا نتیجہ ھے۔

میری اس تالیف کا مقصد یہ ھے کہ اردو داں طبقہ سندھی زبان و ادب کی ارتقائی تاریخ، خصوصیات اور نقطۂ نظر سے واقف ھو۔ اگر میں اس کوشش کے ذریعے اردو داں طبقہ کے دلوں میں سندھی ادب کی جامع صفات و خصوصیات کو جاگزیں کر سکا، تو میں سمجھوں گا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ھو گیا ھوں۔ اس طرح اردو داں طبقہ سندھی ادب کی تاریخ اور خصوصیات سے باخبر ھوکر ھمارے اور قریب آئے گا اور محبت اور اخوت کی فضا سازگار ھوگی اور نشو و نما پائے گی۔ میری مخلصانہ رائے یہ ھے کہ وطن عزیز میں باھمی اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کا ایک مؤثر ذریعہ یہ ھے کہ ھم پاک وطن میں بولی جانے والی مختلف زبانوں کو اور ان کے ادب کو صحیح طور پر سمجھیں۔ اسی مقصد کے پیش نظر میں نے اپنی اِس کتاب کے حوالے سے سندھی ادب کو سمجھانے اور اس سے مستفیض ھونے کی بنیاد ڈالی ھے۔ مجھے امید ھے کہ اس سے ادبی دنیا میں صحت مند روایات کو فروغ حاصل ھوگا۔

کتاب کی طباعت مکمل ھونے تک سندھی ادب کی کئی قدآور شخصیتیں اور بلند پایہ ادیب، محقق اور شاعر اِس جھان فانی سے رخصت ھوکر خالق حقیقی سے جا ملے ھیں۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ھیں:-

رشید احمد لاشاری، حنیف صدیقی، میر رحیمداد خان مولائی شیدائی، سید عبدالحسین شاہ موسوی، محمد بخش مجنون، مولانا غلام محمد گرامی، عبداللہ اثر، ثمیرہ زرین، محمد عثمان ڈیپلائی، قاضی علی اکبر درازی، سید حسام الدین شاہ راشدی، ڈاکٹر عطامحمد حامی، سید خادم حسین شاہ، ڈاکٹر شیخ محمد ابراهیم خلیل اور قاضی فیض محمد۔

چوں کہ کتاب کو لکھے ہوئے کافی عرصہ گذر چکا ہے اس لئے قارئین کو کچھ نوجوان شعراء اور نثر نویسوں کے نام نظر نہیں آئیں گے، جو اِس عرصہ کے دوران سندھی ادب کے افق پر پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوئے ہیں۔ خاص طور پر افسانوی ادب میں انہوں نے بڑی جدت اور انفرادیت پیدا کی ہے اور خارجیت کے ساتھ داخلیت کو بھی بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ بلاشبہ ان ہونہار نوجوانوں کی تخلیقات قابل تعریف ہیں اور دنیا کے معیاری ادب کے ہم پلہ ہیں۔

سندھی ادب کی تاریخ پر، اردو زبان میں یہ پہلی کاوش ہے، جس میں جامعیت کے ساتھ سندھی ادب کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ اس میں کچھ خامیاں رہ گئی ہوں۔ بہرحال میں نے اس کتاب کو مختصر ہونے کے باوجود جامع بنانے کی کوشش کی ہے۔ میں اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ اہل علم ہی کرسکیں گے۔ البتہ مجھے اپنی فروگزاشتوں کا اعتراف ہے۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں سندھ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر سید غلام مصطفیٰ شاہ، ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، موجودہ وائس چانسلر پروفیسر محمد الیاس ابڑو اور پروفیسر انچارج، انسٹیٹوٹ

آف سندھیالوجی، سندھ یونیورسٹی، ڈاکٹر غلام علی الانہ کا تہہ دل سے شکریہ ادا نہ کروں کہ جنھوں نے اس کتاب کو طباعت و اشاعت کے لیے منظور فرمایا اور کتاب کو آپ کے ھاتھوں تک پہنچانے کے لیے مخلصانہ سعی فرمائی۔ میں ان صاحبان کا بے حد ممنون ہوں۔

کتاب کے مترجم حافظ خیر محمد اوحدی مرحوم کی محنت قابل ستائش ھے۔ انہوں نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے اس کتاب کا ترجمہ کیا اور سچ تو یہ ھے کہ ترجمہ کا حق ادا کردیا۔ میں نورچشم ڈاکٹر عبدالوحید میمن اور عزیزی میمن عبدالغفور سندھی کا بھی شکرگذار ھوں کہ انہوں نے کتاب کا مسودہ نقل کرنے میں میری مدد کی۔ میں سندھ یونیورسٹی پریس کے منیجر، جناب اعجاز محمد صدیقی اور عملہ کے دیگر افراد کا بھی ممنون ھوں جنھوں نے اس کتاب کی طباعت کا اہم کام سرانجام دیا۔

بہرحال میری یہ ناچیز کوشش اب آپ کے ھاتھوں میں ھے۔ یہ کتاب کیسی ھے، اس کا صحیح فیصلہ آپ ھی کریں گے۔ میری تمنا تو یہی ھے کہ میری یہ کوشش سندھی ادب کی ترقی میں کچھ کردار ادا کرسکے اور افراد وطن کے لیے اتحاد و محبت اور اخوت و یگانگت کی بنیاد بنے۔

گر قبول افتد ز ھے عز و شرف

ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی
تمغۂ امتیاز

میمن محلہ، لاھوری
لاڑکانہ۔ سندھ

جمعہ، ۲۰- رجب المرجب ۱۴۰۳ھ/ ۶- مئی ۱۹۸۳ء

فہرست

باب چہارم

ارغون، ترخان اور مغل ادوار

باب پنجم

کلہوڑہ دور

باب ششم

ٹالپوروں کا دور

باب اول

سندھی زبان کی تاریخ

سر زمین سندھ کی قدامت اب عالمگیر حیثیت اختیار کر چکی ہے. قدیم دور میں جبکہ علمی اور تہذیبی نقطۂ نگاہ سے تمام دنیا پر تاریکی کے بادل چھائے ہوئے تھے، اس وقت بھی یہ سر زمین تہذیب و تمدن کی مہک سے معطر تھی. اِس، شہد و شکر سے زیادہ مٹھاس بھرے ملک کے باشندے تمام فنون میں ماہر، پیارے، با اخلاق، سچے، سیدھے، لیکن سمجھدار اور شہریت کے شعور سے اچھی طرح آگاہ تھے. بڑے ہنرمند تھے اور مختلف ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات رکھتے تھے. صرف یہی نہیں، بلکہ حرف شناس بھی تھے، ان کی اپنی تحریر تھی اور اسی کی بنا پر اپنا کاروبار چلاتے تھے. اُن قدیم سندھی حروف کے اِملا کے آثار ہمیں "موئن جو دڑو" سے مہروں کی صورت میں ملے ہیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ قدیم تحریر ابتک پورے طور پر پڑھی نہیں جاسکی ہے. تاہم متعدد بین الاقوامی اداروں کے ماہرین اسے پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں. "اسکنڈے نیوین اسٹڈیز" والوں نے بعض الفاظ کی نشاندھی کی ہے، جن میں سے ایک لفظ ہے "ڪڌي" (شانہ) اور دوسرا ہے "ڪرائي" (بانہہ یا ہاتھ). تلفظ کی ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ ان الفاظ کا مفہوم بھی وہی بتایا گیا ہے، جو اس وقت بھی ہماری زبان میں مروج ہے.

چیکوسلواکیہ کے ایک ماہر "بیڈرک ہرزونی" کا خیال ہے کہ اہل سندھ موئن جو دڑو کے زمانہ عروج میں ایک ایسے دیوتا کی پرستش کرتے تھے، جسے "آنؔ" کہا جاتا تھا (۱) یہ لفظ اب بھی ہماری زبان میں موجود ہے، اور ممکن ہے اُس زمانہ کے لوگ آنؔ (غلہ) کو دیوتا سمجھکر اس کی پرستش کرتے ہوں، جس پر انسانی زندگی کا دار و مدار ہے. یہ آنؔ کے پرستار سندھی جب سندھ سے نقل مکانی کرکے قدیم عراق (بابل) میں جا بسے تو وہاں انکو "انوس" کہکر پکارا جانے لگا. بعد میں جب ان میں سے بعض لوگ مصر گئے تو وہاں بھی انہیں اسی نام سے پکارا گیا (۲).

اس سے معلوم ہوا کہ بعض اہل سندھ نقل مکانی کر کے بابل میں جا بسے تھے. بابل اور موئن جو دڑو سے قدیم دور کی جو چیزیں ملی ہیں اور ان میں جو یکسانی پائی جاتی ہے، وہ بھی اسی بات کی گواہی دے رہی ہے. پنجا کا کہنا ہے کہ بابل میں سندھیوں کی کالونی کو "عدن" یا "عتن" کا باغ کہا جاتا تھا (۳). چینی سیاح ہون سانگ نے سندھ کو "ادین" یا "اوتن" بھی کہا ہے.

معلوم ہوتا ہے کہ "عدن" "عتن" یا "اوتن" سندھی زبان کے لفظ "آتن" کی بگڑی ہوئی (۴) صورت ہے. روئی کی کاشت سندھ میں موئن جو دڑو کے دور سے ہوتی آ رہی ہے، کیونکہ موئن جو دڑو سے کپڑے کی موجودگی کا ثبوت مل چکا ہے اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ جس طرح آج سے چند برس پہلے عورتیں آتن

---

(۱) "سندھو کی جھلک" ص ۱۳، از لیلو رچمدانی، احمدآباد.

(۲، ۳، ۴) از رگھوناتھ پنجا، بحوالہ "سندھو کی جھلک" ص ۱۳، ۱۵، ۱۶.

میں بیٹھکر سوت کاتتی تھیں ، اسی طرح موئن جو دڑو کے تہذیبی دور میں بھی عورتیں آتن میں بیٹھکر سوت کاتتی ہوگی . اس دور کے سندھی جب بابل میں جا کر بس گئے ہوگے تو وہاں بھی لوگوں نے آتن کا منظر دیکھا ہوگا اور اسی لئے سندھیوں کی کالونی کو آتن، عتن یا عدن کہتے ہونگے .

اِدھر سندھ میں "سوسی" (ایک قسم کا رنگین دھاریدار کپڑا جس سے عموماً عورتوں کی شلواریں بنتی ھیں) کا رواج قدیم زمانہ سے چلا آ رہا ھے، اور اُدھر عراق کے قدیم شہر بابل کے قریب "سوسہ" نامی ایک شہر کے آثار پائے گئے ھیں . اس سے ظاہر ھے کہ جب سندھیوں نے بابل کے اطراف میں جا کر سکونت اختیار کی ہوگی اور وہاں سوسی بنتے ہونگے تو سوسی کی شہرت کی وجہ سے ان کے شہر کا بھی سوسہ نام پڑگیا ہوگا .

قدیم بابل کی قوموں میں ایک قوم سمیری تھی . سمیری اور "سومرو" میں مناسبت پائی جاتی ھے، اگرچہ یہ بات ابھی تحقیق طلب ھے، تاہم سمیری تہذیب اور قدیم سندھ کی تہذیب کے درمیان یگانگی ضرور نظر آتی ھے، یہ یگانگی محض تہذیب ھی پر موقوف نہیں، بلکہ سمیری زبان کے جو الفاظ دریافت ہوئے ھیں ان سے ظاہر ہوتا ھے کہ سندھی زبان اور سمیری زبان میں بھی یکسانی ھے. ایک ماہر لسانیات اے. ایس. ڈائمنڈ نے سمیری زبان کے جو الفاظ پیش کئے ھیں، ان میں سے حسب ذیل الفاظ اب تک سندھی زبان میں ان ھی معنوں میں مستعمل ھیں (۱):-

۱- ابا = پیءُ (باپ)

۲- اما = ماءُ (ماں)

---

(۱) از رگھوناتھ پنجابی بحوالہ "سندھو کی جھلک" ص ۱۳، ۱۵، ۱۶.

۳- ما، می = مان (میں) (ضمیر متکلم)

۴- موں = مونکي (مجھے) (فاعلی خواہ مفعولی صورت اضافی)

دو صدی قبل کی سندھی زبان میں لفظ "موں" (میں) 'مونکي" (مجھے) کے معنوں میں استعمال ہوا ہے:-

"میان مار مَ موں، متان تنھنجوئي توکي لڳي"

(دوست! مجھے مت مار، مبادا تیرا تجھے ہی لگ جائے)

۵- تگ = کپڑے کی دھجی.

سندھی زبان میں انہی معنوں میں "تھگڑی" مستعمل ہے.

اس سے ظاہر ہے کہ سمیری اور سندھی زبانوں میں کوئی نسبت ضرور تھی. سمیری زبان معدوم ہوچکی ہے، لیکن سندھی بدستور موجود ہے اور خوب پھل پھول رہی ہے، سندھی کی دیگر ہمعصر زبانیں صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہیں، لیکن سندھی سخت جان ہے اور اپنے اندر کوئی ایسی قوت پوشیدہ رکھتی ہے کہ اس دور میں بھی اپنی اصل صورت اور ہیئت میں اپنا وجود قائم رکھے چلی آرہی ہے.

ہمارے اس دعویٰ کی دلیل سندھ کے شہروں اور دریاؤں کے قدیم نام ہیں. مثلاً بھنبھور (پنیور)، یہ سندھ کا ایک قدیم شہر ہے، لفظ بھنبھور کے خاندان سے متعلق دیگر الفاظ یہ ہیں:-

۱- بھنبھرو (پنیرو) ایک قوم کا نام.

۲- بھنبھو (پنیو) آدمی کا نام - بھنبھو کے معنی سانولے کے ہیں، ایک کافی کے مطلع کا مصرع اولیٰ ہے:-

پنیا وار تنھنجا کاربھر کان کارا

(تیرے سیاہ بال کالے سانپ سے بھی زیادہ کالے ہیں)

۳- بھنبھرکو (پنیرکو) پربھات یاطلوع سحر سے پہلے کا ھلکا اندھیرا.

معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی لفظ ہے "بھنبھو" یعنی سانولا، اور اسی سے دیگر الفاظ بنے ہیں۔ کیونکہ بھنبھر کو میں بھی سیاہی کا مفہوم موجود ہے۔ آدمی کا نام بھی "کالا" رکھاجاتا ہے اور اسی طرح بھنبھو یا بھنبھوخان نام بھی رکھے جاتے ہیں۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ آریوں کی آمد سے پہلے سندھ کے باشندے رنگ کے سانولے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آریوں نے انہیں "داس" کہکر پکارا، آریوں کی زبان میں داس کے معنی سانولے کے تھے۔ رگ وید میں اس قسم کی دعائیں موجود ہیں جن سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے مثلاً:- ہے اندرا، ان داسوں کے مضبوط اور فولاد جیسے قلعوں کو برباد کر۔" غالباً بھنبھور پر بھی یہ نام اسی وجہ سے پڑا ہوگا کہ یہ سندھ کے اصل باشندوں کا قدیم شہر تھا جو رنگ کے سانولے تھے۔ بھنبھور پر یہ نام پڑنے کی ایک وجہ اور بھی معلوم ہوتی ہے اہل عرب کسی شہر کی سرسبزی و شادابی کو جو اس کے نواع میں کھیتوں اور باغات کی کثرت سے ہوتی ہے، "سواد" (سیاھی) کہتے ہیں۔ ایرانی بھی اس بات میں عربوں کے ہمخیال ہیں، وہ ایسے شہر کو "مینو سواد" کہتے ہیں یعنی بہشت جیسا سر سبز و شاداب۔ ممکن ہے یہی خیال قدیم سندھ میں بھی موجود ہو اور بھنبھور پر اسکی غیر معمولی سرسبزی و شادابی کی وجہ سے یہ نام رکھا گیا ہو۔ ویسے بھی "سبزی" اور "سیاھی" کے درمیان فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ ادب میں ایک کا اطلاق دوسرے پر ہوتا رہتا ہے۔ اسکے علاوہ سواد کا اطلاق ایسے شہروں اور علاقوں پر بھی ہوتا ہے جن کی آبادی گنجان اور غیر معمولی کثرت رکھتی ہو۔ کثرت ہی کے معنوں میں امت محمدی کی اکثریت کو اصطلاحاً "سواد اعظم"

کہا جاتا ہے ۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ بھنبھور پر یہ نام اسکی سر سبزی و شادابی کے علاوہ اسکے وسیع و عریض ہونے اور گنجان اور کثیر آبادی رکھنے کی وجہ سے پڑا ہو۔

(ب) سندھ کا دوسرا قدیم شہر ہے "اروڑ"۔ یہ لفظ بھی سندھی ہے اور اب تک مستعمل ہے ۔ اروڑ کے معنی ہیں اناج کو ایک جگہ، پر جمع کر کے اس کا ڈھیر بنانا ۔ دیہات میں کہا جاتا ہے "اروڙيون ٿي ويون" یعنی اناج کے ڈھیر لگ گئے ۔ حضرت سچل سرمست نے بھی یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال فرمایا ہے:-

"تاپي ۽ ڏٿ ڏپ جا آڻي ڪن اروڙ"

(خود رو جنگلی پودوں سے حاصل شدہ خوراک لاکر اسکے ڈھیر لگا دیتے ہیں)۔

اروڑ چونکہ اناج کی بڑی منڈی تھا اور آسودہ اور خوشحال شہر تھا ، اسی لئے اس پر یہ نام رکھا گیا ہوگا۔

(ج) سندھ میں موجودہ دریائے سندھ کے علاوہ ایک اور دریا بھی تھا ، جسے "ھاکڑو" کہا جاتا تھا ، اور جو بعد میں خشک ہو گیا ۔ لفظ ھاکڑو سے تعلق رکھنے والے دیگر الفاظ یہ ہیں:-

۱ــ ھاک = ناموری ، شہرت ، تعریف ۔

۲ــ ھکڑو = ایک قوم ۔

معلوم ہوتا ہے کہ ھاکڑو کی بنیاد لفظ ھاک ہے ۔ ھاکڑو = ھاک والا ۔ ھکڑا قوم کا تعلق ھاکڑو دریا کے ساتھ ہے ۔ وہ لوگ جو دریائے ھاکڑو کے خشک ہوجانے کے بعد نقل مکانی کرکے دیگر مقامات پر جا کر بسگئے ، انہیں ھکڑا کہا گیا ۔

ان الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ سندھی زبان کی ساخت آج بھی

ویسی ھی ھے، جیسی قدیم دور میں تھی اور اس میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ھوئی۔ آریوں کی آمد کے بعد دو قوموں، دو زبانوں اور دو تہذیبوں کے درمیان زبردست تصادم ھوا، لیکن اس کے باوجود یہ کہنا بے جا نہ ھوگا کہ سندھی زبان صفحۂ ھستی سے نہ صرف معدوم نہیں ھوئی، بلکہ اپنی ھیئت کو بھی جوں کا توں قائم رکھنے میں کامیاب رھی۔ کیونکہ اس میں ھمالیہ جیسی پختگی، منچھر (سندھ کی مشہور جھیل) جیسی وسعت اور پاتال جیسی گہرائی ھے۔ موجودہ دور کے ماھرین لسانیات کی رائے ھے کہ ویدوں کے وجود سے پہلے سندھ اور ھند کے مختلف خطوں میں مختلف زبانیں مروج تھیں اور ویدوں کو مرتب کرنے والوں نے ان زبانوں سے بھی استفادہ کیا تھا۔ اسی بنا پر لیلو رچندانی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ھے کہ "سندھی پراکرت صدیوں سے موجود تھی"(۱)۔

سندھیوں کی نرم مزاجی اور امن پسندی سے فائدہ اٹھاتے ھوئے کئی اجنبی قوموں نے یہاں آکر ڈیرے ڈالے۔ ابتدا میں اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کے لئے بڑی کوششیں کیں، لیکن بالآخر باھمی ربط و ضبط بڑھ جانے سے سندھیوں میں جذب ھوگئیں۔ اس اثنا میں سندھی زبان جوں کی توں اٹل اور مستحکم رھی اور اپنا وجود قائم رکھنے میں بہر صورت کامیاب ھوئی۔ سندھ کی قدیم تاریخ کے ماھر اور سندھی زبان کے محقق لیلو رچندانی تحقیق و جستجو کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ھیں:-

"یہ بات صاف اور واضح ھے کہ زبان کی ھیئت میں کوئی قابل ذکر تبدیلی واقع نہیں ھوئی اور سندھی صدیوں سے اپنی اصل صورت میں موجود ھے(۲)۔

(۱) "سندھو کی جھلک" ص ۸۳ (۲) "سندھو کی جھلک" پیش لفظ ص ۲۔

آریوں کے علاوہ یونانی، ایرانی اور عرب بھی سندھ میں آئے، لیکن رفتہ رفتہ وہ بھی سندھی ہوگئے اور اپنی زبانیں بھلا کر سندھی کو اپنا بیٹھے۔ البتہ انہوں نے اپنی زبانوں کے کئی الفاظ سندھی میں ضم کرکے سندھی زبان میں وسعت پیدا کردی۔ آریوں کے بعد آنے والی اِن قوموں نے اِس سلسلہ میں جو رویہ اختیار کیا اسے دیکھہ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آریوں کی آمد پر بھی یہی کچھہ ہوا ہوگا، یعنی اس یلغار میں سندھی زبان نے اپنے وجود کو قائم رکھا ہوگا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ آریہ جب یہاں آئے تو یہیں پر بیٹھہ نہیں گئے، بلکہ آگے بڑھتے گئے یعنی سندھ میں دم لے کر ھندوستان کے مختلف علاقوں میں منتشر ہوگئے، اور جس طرح انہوں نے سندھ میں دراوڑ قبائل سے جنگیں کیں، اسی طرح ھندوستان میں بھی انہی کے ساتھہ جاکر لڑائیاں لڑیں، جن میں سے رام اور راون کی لڑائی کو بڑی اهمیت حاصل ہوئی۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ وید سندھ میں لکھے گئے کیونکہ وید سنسکرت میں لکھے ہوئے ہیں، اور سنسکرت آریوں کی اپنی اصلی زبان نہیں ہے، سنسکرت ھند۔ آریائی خاندان کی شمال مغربی شاخ ہے، جسے شروع میں بھاشا، اور بعد میں سنسکرت (اصلاح و ترقی یافتہ) کہا گیا(۱)۔ رگ وید میں جو "سندھو" کا ذکر موجود ہے اور اس کی تعریف کی گئی ہے، وہ سندھ میں سکونت کے دور کا تأثر ہے۔

آریوں نے سندھ کو اپنا مسکن ضرور بنایا، لیکن یہاں ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ یہاں سومرہ، سماٹ ور لوھانہ قوموں کی

---

(۱) ملاحظہ ہو مقالہ "سندھی" از خواجہ غلام علی الانا، ماھنامہ "نئین زندگی" "سندھ نمبر" ۱۹۶۰ع۔

بہت بڑی تعداد آباد تھی. یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آریوں اور ان قوموں کے درمیان باھمی اختلافات تھے. تاریخ گواہ ہے کہ ان قوموں کو جب بھی موقعہ ملا، انہوں نے آریوں کے مخالفین کی مدد کی اور مذھب بھی آریوں کے مذھب سے مختلف اختیار کیا. یہی وجہ ہے کہ بدھ مت اور اسلام کے مبلغین کو تھوڑے عرصہ میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی. یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس ملک میں اسلام کی آمد سے پہلے بدھ مت کے پیرووں کی اکثریت تھی اور بعد میں مسلمان مبلغین کی کوشش سے مختصر عرصہ میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگئی.

عربوں کی بیانات سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوچکی ہے کہ اس دور میں یعنی پہلی صدی ھجری کے آخر اور آٹھویں صدی عیسوی کے شروع میں سندھ میں بدھ مت رائج تھا(۱). ایلٹ نے بھی لکھا ہے کہ اس حقیقت کے کئی ثبوت موجود ہیں کہ اس زمانہ میں سندھ میں بدھ مت پھیلا ہوا تھا(۲).

اِن باتوں سے سمجھا جاسکتا ہے کہ سندھی زبان پر آریوں کی زبان کا اثر ضرور ہوا ہوگا لیکن اس قدر نہیں کہ سندھ کی اپنی زبان مٹ گئی ہو اور اس کی جگہ نئی زبان نے لے لی ہو. اِسی وجہ سے اب یہ نظریہ غلط ثابت ہوچکا ہے کہ سندھی زبان سنسکرت سے نکلی ہے یا سامی خاندان کی زبانوں میں سے ہے. جدید تحقیق یہ ہے کہ سندھی زبان اپنے طور پر ایک مستقل اور خود مختار "سندھی پراکرت = سندو پراکرت" زبان تھی جو سندھ میں بولی

---

(۱) "عرب و ھند کے تعلقات" از علامہ سید سلیمان ندوی، ھندوستانی اکاڈمی ۱۹۳۰ع ص ۱۹.

(۲) ایلٹ- ج ۱، ص ۱۳۸.

جاتی تھی (۱)۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ سنندو پراکرت ہند۔ آریائی خاندان کی شاخ تھی (۲) یعنی سندھی زبان قدیم آریائی زبان سے نکلی تھی۔

یہ نظریہ ہم اس وقت تسلیم کرسکتے ہیں، جب ہم یہ تسلیم کرلیں کہ آریوں کی آمد کے بعد قدیم سندھی زبان بالکل ختم ہوگئی اور آریائی زبان سے ایک نئی زبان وجود میں آئی، جو آگے چل کر "سنندو پراکرت" یا "سندھی زبان" کہلائی۔ حالانکہ مذکورہ بالا حقائق کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوا، کیونکہ سندھ کی تہذیب پر آریائی تہذیب کا نہ تو اس قدر اثر ہوا اور نہ ہی سندھ کے قدیم باشندے ختم ہوگئے۔

سندھی زبان اور اس کی ہمسایہ زبانوں کے درمیان جو لسانیاتی تعلق نظر آتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آریہ سندھ اور ہند کے ہر حصہ میں گئے، اور جہاں جہاں گئے، وہاں اپنی تہذیب اور زبان کے انمٹ اثرات چھوڑتے گئے۔ سندھی زبان کی بنیادی ساخت کو دیکھا جائے تو اس میں ایک انفرادیت اور مخصوص قسم کی خصوصیت نظر آئیگی، جو دوسری زبانوں میں نظر نہیں آتی۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ سندھی زبان کا اپنا مزاج ہے اور اپنی دنیا، یہی وجہ ہے کہ تمام اہل علم سندھی کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرتے رہے ہیں۔ عرب سیاحوں کے سفرناموں سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ سندھ میں سندھی زبان بولی اور لکھی جاتی تھی۔ ابوالحسن علی معودی (وفات ۳۴۶ھ/۹۵۷ء) "مروج الذھب و معاون الجوہر" میں لکھتے ہیں:

(۱،۲) مقالہ "سندھی زبان کی بنیاد" از خواجہ غلام علی الانا، سہ ماہی مہران، ۳/۱۹۶۷ء۔

سندھ کی زبان ہندوستان سے مختلف ہے اور سندھ اسلامی ممالک سے قریب ہے (۱).

محمد بن احمد بشاری مقدسی اپنی تصنیف "احسن التقاسیم فی معرفہ الاقالیم" میں لکھتے ہیں:-

دیبل ایک بحری شہر ہے ..... اسکے باشندے تجارت کرتے ہیں اور سندھی اور عربی زبانیں بولتے ہیں (۲).

ابن حوقل لکھتے ہیں:-

منصورہ، ملتان اور ان کے گردو نواح میں عربی اور سندھی زبانیں بولی جاتی ہیں (۳).

ان حوالہ جات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی صدی ھجری کے آخر اور آٹھویں صدی عیسوی کے شروع میں جب عرب، سندھ میں آکر آباد ہوئے، تو سندھی زبان ھی بولی جاتی تھی لیکن جہاں جہاں عرب سکونت رکھتے تھے وہاں عربی بھی رائج ہوگئی تھی پھر کچھ عرصہ کے بعد جب عرب سندھیوں میں ضم ہوکر سندھی ہوگئے تو اپنی زبان بھی بھلا بیٹھے.

عربوں کے دور میں سندھ کی کئی کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں ۱۵۶ھ میں ایک سندھی پنڈت کے توسط سے علم حساب کی ایک کتاب "سدھانت" کا عربی میں ترجمہ کیا گیا. اسی طرح اور بھی کئی کتابوں کا ترجمہ ھوا. ممکن ہے سندھی اہل علم کے توسط سے جن کتابوں کا عربی ترجمہ کیا گیا ان میں سنسکرت کے

(۱) بحوالہ "ہندوستان عربوں کی نظر میں" ج اول، ص ۳۸۱ - دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۶۰ع، ص ۲۸۸.

(۲) بحوالہ "ہندوستان عربوں کی نظر میں" ج اول، ص ۳۶۵، ۳۸۶.

(۳) سفر نامہ ابن حوقل، ص ۲۳.

علاوہ سندھی زبان کی کتابیں بھی ہوں. آن سندھی پنڈتوں اور طبیبوں کے نام بھی عربی کتابوں میں ملتے ھیں. مثلاً منکہ، پلہ، دھن اور بازیگر (۱).

"منکہ" سندھی زبان کے نام "مانک" کی بگڑی ہوئی صورت معلوم ھوتا ھے. اور "پلہ" بھلو (پلو) کی، اور "دھن" دھنو (ڈنو) کی، اور "بازیگر" قوم سندھ میں اب بھی موجود ھے.

اسکے علاوہ سندھی میوہ جات کے نام مثلاً لیمون (لیمو) اور انب (آم) اور سندھی کھانے پت (بھات) کا نام، سندھی کپڑے چیٹ (شیٹ) کا نام اور پنسار کی چیزوں کے نام مثلاً سُنید (ادرک)، بھیڑا (ہلیلہ) اور ھریڑ (ہلیلہ یا ھڑ) وغیرہ کچھ بگڑی ہوئی صورت میں عربی کی کتابوں میں ملتے ھیں (۲).

عربوں کے دور میں اروڑ کے ایک عالم نے سندھی کی تاریخ سے متعلق ایک کتاب تصنیف کی جو فتح نامہ عرف چچ نامہ کے نام سے مشہور ھے. اس میں عربوں کے سندھ کو فتح کرنے کا حال درج ھے اور عربوں کی فتح سے پہلے کے سندھ کے حکمرانوں کے حالات بھی بیان کئے گئے ھیں. یہ کتاب سندھ کی تاریخ پر پہلی کتاب ھے، جس کا فارسی میں ترجمہ سنہ ۶۱۳ھ میں علی کوفی نے کیا. اس کتاب میں بھی سندھی کے الفاظ اور فقرے تھوڑی سی بدلی ہوئی صورت میں ملتے ھیں. مثلاً لاکا (لاکھا)، ٹکر (ٹھکر)، جت، سما، سھتا (سہتا)، لوھانا (لوھانہ)، بانیا (بھاٹیہ)، چنبر(چاند). ڈاھر (ڈاھر)، موکہ (موکھہ) جو دراصل موکیو (موکھیو) ھے، بسایہ (وسایو)، وکیہ (وکیو، وکیو)، کاکہ (کاکو، کاکو) مھران (مہران)، خلوائی، ساکرہ (ساکرو، ساکرو)، موج،

---

(۱) "عرب وہند کے تعلقات" از علامہ سید سلیمان ندوی ص ۱۳۱ تا ۱۳۳-
(۲) " " " " " " " ص ۶۹ تا ۷۲-

اول، عنب، (انب، آم)، دنده (ڈنڈ، جھیل) اور بیت (بیٹ، جزیرہ) وغیرہ۔

عربی تصنیفات میں درج شدہ سندھی نام اور الفاظ، اور چچ نامہ میں درج سندھی الفاظ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے زمانہ میں خواہ ان سے پہلے سندھی زبان کی ہیئت و صورت اور لسانیاتی مزاج بالکل وہی تھا جو آج ہے. اس بات کا مزید ثبوت بھنبھور کے ویران شدہ شہر کی کھدائی سے بھی ملا ہے. بھنبھور کی کھدائی کرتے ہوئے چند ٹھیکریاں دستیاب ہوئی ہیں، جن پر عام استعمال کی چیزوں کے نام سندھی زبان میں، لیکن قدیم سندھی رسم الخط یعنی قدیم ترین ناگری میں ثبت ہیں. سندھی املا کے یہ نمونے اسلام کی اشاعت سے قبل والے دور کی سندھی زبان کی ٹھوس علامات ہیں (۱).

جس طرح آریوں کی آمد کے بعد سندھی زبان پر آریائی زبان کا اثر ہوا، اسی طرح عربوں کی آمد کے بعد عربی زبان کے اثر سے کئی عربی الفاظ سندھی زبان میں اس طرح ضم ہوگئے جس طرح صراف زیورات میں جواہرات کا جڑاؤ کر کے ان کی زیب و زینت کو دوبالا کرتا ہے.

عربوں کی آمد کے بعد سندھی زبان میں صرف عربی زبان کے الفاظ ہی داخل نہیں ہوئے بلکہ اس میں مزید گہرائی، وسعت اور مرکزیت بھی پیدا ہوئی. زبان کی نفسیاتی کیفیت بدل گئی. اس کے تمدنی سرمایہ میں اضافہ ہوا، اور اس کی ہیئت، املا اور صرف و نحو پر بھی اثر پڑا (۲). اسکے علاوہ سندھی زبان

---

(۱) مضمون، "سندھی زبان کی حیثیت اسلام کی آمد سے پہلے" از خواجہ غلام علی الانا، نئی زندگی ستمبر ۱۹۶۸ع.

(۲) "سندھی زبان کی مختصر تاریخ" از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ۱۹۶۳ء، ص ۵۰

پہلی مرتبہ عربی املا میں لکھی جانے لگی، اور آگے چکر سندھی زبان نے مستقل طور پر سندھی۔ عربی رسم الخط کو اپنایا، جس کی بنیاد عربی رسم الخط پر ہے۔

عربوں کے دور کی بعض ایسی شہادتیں ملی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سندھ میں سندھی زبان ہی لکھی پڑھی جاتی تھی۔ جس کا ذکر آگے چلکر کیا جائیگا۔

رچرڈ برٹن انگریزوں کے ابتدائی دور کے مصنف ہیں۔ انہوں نے سندھی زبان، ادب اور سندھ کی قوموں اور انکی بود و باش کے متعلق تحقیق و جستجو کی ہے۔ سندھی زبان کے عمل و دخل اور جغرافیائی حدود، جہاں وہ بولی جاتی تھی، بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

> سندھی ایک خاص اور جدا گانہ زبان ہے۔ یہ درست نہیں ہے کہ وہ کسی ہندوستانی زبان کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ سندھی زبان کاٹھیاواڑ کی حدود سے بہاولپور تک اور بروھیوں کے پہاڑ سے لیکر ہندوستان کے مغربی ریگستان تک بولی جاتی ہے۔ سندھ کی یہ حدود، ان حدود سے مطابقت رکھتی ہیں، جنہیں مسلمان مؤرخین نے رائے خاندان کے ہندو راجاؤں کی سلطنت بتایا ہے (۱)۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رائے خاندان کے زمانے میں جو حدود سندھ کی تھیں، وہی حدود سندھی زبان کی بھی تھیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ رائے خاندان کے زمانے سے یہی سندھی زبان رائج ہے۔ البتہ عربوں کی آمد کے بعد اس میں پہلے عربی اور بعد میں فارسی زبانوں کے الفاظ داخل ہونا شروع ہوئے۔

---

(۱) "سندھ اور وادی سندھ میں بسنے والی قومیں" از رچرڈ برٹن، ترجمہ سندھی از محمد حنیف صدیقی، سندھی ادبی بورڈ- ۱۹۷۱ع- ص ۶۳۔

باب دوم

ابتدائی دور۔ عرب دور (۷۱۱ع-۱۰۵۰ع)

سیاسی صورت حال

چچ نامہ سے معلوم ھوتا ھے کہ عربوں نے سندھ کی حکومت برھمن خاندان سے حاصل کی. اس سے پہلے رائے خاندان کی حکومت تھی. اموی خاندان کے خلیفہ ولید بن عبدالمالک کے عہد میں حجاج بن یوسف کی جانب سے بھیجے ھوئے سپہ سالار محمد بن قاسم نے سنہ ۹۲ھ (۷۱۱ع) میں راجہ داھر کو شکست دیکر سندھ میں عرب حکومت قائم کی. یہ ملک تقریباً سوا سو برس تک پہلے دمشق اور بعد میں بغداد کے ماتحت رھا. البتہ محمد بن قاسم کی وفات کے دو برس بعد عربوں کا اثر کم ھوگیا. اس کے باوجود مسلمانوں کی مرکزی حکومت کی جانب سے سندھ میں گورنر آتے رھے(۱). خلیفہ سلیمان بن عبدالمالک کے عہد میں یزید بن ابی کبشہ صرف اٹھارہ دن گورنر رھے. ان کے بعد حبیب بن المھلب گورنر ھوئے. ان کو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے معزول کر کے عمرو بن مسلمہ الباھلی کو گورنر بنا کر بھیجا، اور ساتھ ھی ساتھ سندھ کے غیرمسلم اُمرا و رؤسا کے نام تبلیغی دعوت نامے بھی ارسال کئے، جن سے متاثر ھو کر بہت سے لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ھوئے. اِن نومسلموں میں راجہ داھر کے فرزند جے سنگ بھی تھے (۲).

---

(۱) تفصیل کیلئے ملاحظہ ھو مقالہ "سندھ اور ملتان کی عرب حکومتیں" از میمن عبدالمجید سندھی، سہ ماھی مہران ج اول ص ۱-۲.

(۲) بلاذری ص ۴۴۱، نزھۃ الخواطر ص ۹۳، تحفۃ الکرام ج ۳، ص ۲۳.

خلیفہ ولید بن ھشام کے عہد میں یزید بن کرار سندھ کے گورنر ہوئے۔ بنو امیہ کے آخری خلیفہ مروان الحصار کے عہد میں منصور بن جمہور کلبی بغاوت کر کے سندھ میں آئے اور سنہ ۱۳۰ھ میں ابن کرار کے ساتھ مقابلہ کر کے ان کو قتل کیا اور خودمختار حکمران بنکر بیٹھ گئے (۱). یہیں سے سندھ میں عرب حکومت کا دوسرا دور شروع ہوا. اس دور میں خلافت عباسیہ کی جانب سے ابو مسلم عبدالرحمان بن مسلم نے سندھ پر چڑھائی کی، دیبل میں انکو فتح حاصل ہوئی لیکن منصورہ میں شکست ہوگئی، اور گرفتار ہوکر قتل ہوئے. ان کے بعد موسیٰ بن کعب تمیمی نے بارہ ہزار فوج کے ساتھ چڑھائی کی، اور منصور کو شکست دی. اس طرح سنہ ۱۳۴ھ سے سندھ خلافت عباسیہ کے زیر اقتدار آ گئی (۲). منصور کو شکست دینے کے بعد موسیٰ سندھ کے ان علاقوں کو فتح کرنے کی جانب متوجہ ہوئے جو خودمختار ہوگئے تھے. کچھ عرصہ کے بعد وہ اپنے بیٹے عینیہ کو اپنا قائم مقام بنا کر خود عراق کو واپس چلے گئے. عینیہ کے بعد عمر بن حفص گورنر ہوئے. ان کے زمانہ میں خارجی اور شیعہ مبلغ سندھ میں آئے. خارجی مبلغ حسام بن مجاھد سنہ ۱۴۲ھ میں سندھ میں آئے تھے لیکن انہیں چونکہ کوئی کامیابی نہیں ہوئی، اس لئے واپس چلے گئے. انھی دنوں میں شیعہ مبلغ عبداللہ بن محمد المعروف بہ اشتر سندھ میں وارد ہوئے. عمر بن حفص چونکہ سادات کے حامی تھے، اس لئے سندھ میں تحریک تشیعت کو خوب تقویت حاصل ہوئی.

خلیفہ مہدی کے عہد میں سنہ ۱۵۹ھ میں روح بن حاتم مہلبی

(۱) ابن اثیر، ج ۵، ص ۱۷۲ - یعقوبی، ج ۲، ص ۴۷، نزھۃ الخواطر، ص ۹۴.
(۲) ابن اثیر، ج ۵، ص ۱۷ - یعقوبی، ج ۲، ص ۹۴۲.

سندھ کے گورنر ھوئے. ان کے زمانہ میں ھندوستان کے خلاف بحری مہم جاری ہوئی. عربوں کا جنگی بحری بیڑا گجرات کے ساحل پر آکر لنگر انداز ھوا. خلیفہ ھارون رشید کے عہد میں سنہ ۱۷۰ھ میں سالم یونسی کو گورنر بنا کر بھیجا گیا. ان کے بعد خلیفہ ھارون ھی کے عہد میں اسحاق بن سلیمان، ان کے بیٹے یوسف اور پھر طیفور بن عبداللہ سندھ کے گورنر ہوئے. ان ھی ایام میں خلیفہ ھارون کے برمکی وزرا کی دلچسپی کی وجہ سے متعدد سندھی پنڈتوں اور طبیبوں کو سندھ سے بغداد بلوایا گیا، جن سے سندھ کی کتابیں عربی میں ترجمہ کروائی گئیں.

خلیفہ مامون کے عہد میں سنہ ۲۱۶ھ میں موسیٰ بن یحییٰ برمکی سندھ کے گورنر ہوئے. انھوں نے سنہ ۲۲۱ھ میں انتقال کیا تو خلیفہ معتصم باللہ نے ان کے بیٹے عمران کو گورنر بنا کر بھیجا. عمران کے زمانے میں سکھر کے مید اور جت قبائل نے بغاوت کی. میدوں اور عمران کے درمیان بڑی خونریز جنگ ہوئی جس میں تیس ہزار مید قید ہوئے. عمران نے ان سے سکھر کے ارد گرد پتھروں کا بند تعمیر کروایا اور اس پر "سکتہ المید" نام رکھا. بعض حضرات کا خیال ھے کہ سکتہ المید بگڑ کر سکھر بنا ھے.

یہ بغاوتیں ختم ہوئیں تو سندھ میں یمنی اور نزاری عرب قبائل کے درمیان نزاع شروع ھوا. عمران کو پھر اس طرف توجہ منعطف کرنی پڑی. نزاری قبیلہ کی قیادت عمر بن عبدالعزیز ھباری کر رہے تھے، جن کا بڑا دادا منذر بن ھباری سندھ کے گورنر حکم بن عوانہ کلبی کے زمانہ میں سندھ میں آکر بس گیا تھا. عمران اور عمر بن عبدالعزیز کے درمیان زبردست جنگ چھڑ گئی

جس میں عمران بن موسیٰ برمکی ذوالحج سنہ ۲۲۷ھ میں قتل ہوئے اور یمنی قبائل کو شکست ہوگئی۔ اس کے بعد عینیہ بن اسحاق حنبلی کو گورنر بنا کر بھیجا گیا لیکن عمر بن عبدالعزیز کی شان و شوکت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ خلیفہ المتوکل علی اللہ کے قتل کے بعد انہوں نے سنہ ۲۴۷ھ میں سندھ میں ایک آزاد و خود مختار حکومت کی بنیاد ڈالی۔ ان کے عہد میں سندھ میں امن قائم ہوا اور خوشحالی بڑھی۔ یہ عرب خاندان سندھ کے شہر "بانیہ" میں سکونت رکھتا تھا، لہٰذا حکمران بننے کے بعد بھی بانیہ ھی کو اپنا مرکز بنایا۔ سنہ ۲۷۰ھ میں عمر بن عبدالعزیز کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے عبداللہ حکمران ہوئے انتظامی امور کے نقطۂ نگاہ سے انہوں نے منصورہ کو اپنا دارالحکومت بنانا مناسب سمجھا۔

رفتہ رفتہ عرب حکومت کمزور ہوتی گئی۔ اس لئیے مقامی لوگ موقعہ سے فائدہ اٹھا کر ریاستیں اور جاگیریں قائم کرنے لگے۔ اروڑ پر راجہ دلورائے نے قبضہ کیا۔ اب عرب حکومت محض منصورہ تک محدود ہوکر رہ گئی۔ ملتان میں ایک علحدہ اسماعیلی حکومت قائم ہوئی منصورہ پر هباری خاندان بدستور قابض رہا۔ سنہ ۱۰۲۵ع میں سلطان محمود غزنوی نے ملتان کے اسماعیلی حکمرانوں کو شکست دیکر ملتان پر قبضہ کر لیا۔ محمود غزنوی نے سومنات کی فتح کے بعد منصورہ پر بھی قبضہ کیا، اس طرح سندھ غزنوی قلمرو میں شامل ہوگئی (۱)۔ غزنوی خاندان کے آخری حکمران سلطان عبدلرشید کو کمزور دیکھکر سنہ ۱۰۵۰ع میں سومرہ خاندان نے

---

(۱) تاریخ الکامل از ابن اثیر، ج ۹، ص ۱۱۹۔

سندھ پر قبضہ کر لیا ۔ ان کا ابتدائی مرکز سندھ اور کچھ کا درمیانی علاقہ تھا اور انکی تمامتر توجہ اور سیاسی اور فوجی طاقت کا رخ کچھ، کاٹھیاواڑ اور گجرات کی سرحدوں کی جانب رہا. اس سے فائدہ اٹھا کر سلطان شہاب الدین غوری نے ملتان اور اچ پر قبضہ کیا. سنہ ۱۲۰۱ع میں ناصرالدین قباچہ شمالی سندھ پر قابض ہو گئے اور سلطان شہاب الدین غوری کی طرف سے اچ اور بکھر کے گورنر ہوئے. سلطان التمش کے عہد میں قباچہ نے بغاوت کی. انکے مقابلہ پر سلطان نظام الملک بھیجے گئے. قباچہ بکھر کے قریب دریائے سندھ میں ڈوب کر مر گئے. زیرین سندھ پر سومرہ خاندان کا تسلط قائم رہا اور کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے تمام سندھ پر قبضہ کر کے اچ تک اپنی طاقت بڑھالی.

عربوں کے دور میں سندھ کی حالت

عربوں نے سندھیوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کی کوشش کی اور سندھ کی تہذیب و تمدن اور رسم و رواج کو اپنایا. صرف یہی نہیں، بلکہ سندھ کی تہذیب و تمدن نے اسلامی اثرات کے باعث ایک نیا اور پاکیزہ روپ اختیار کیا، اور یہی روپ آگے چلکر مستقل طور پر سندھی ثقافت بنگیا. بشاری مقدسی نے منصورہ کے باشندوں کے متعلق لکھا ہے:-

یہاں کے باشندے با مروت اور با اخلاق ہیں. اسلام نے انہیں تازگی اور بالیدگی عطا کی ہے. یہاں علما کی تعداد زیادہ ہے. ان میں ذہانت اور ذکاوت ہے، اور نیک اور مخیر ہیں (۱).

---

(۱) احسن التقاسیم، ص ۴۸۱.

منصورہ کے متعلق ابن حوقل اور مقدسی وغیرہ کے بیانات کی روشنی میں منصورہ کے باشندوں کی اخلاقی اور معاشی حالت کا نقشہ اس طرح کھینچا جاسکتا ھے :-

یہاں کئی منزلہ عمارات ھیں . بدکاری اور شراب نوشی نہیں ھے. شادابی اور دولتمندی زیادہ ھے. تجارت کا حال بھی بہت اچھا ھے. تکلف نمایاں ھے. حکومت انصاف پسند ھے- بازار میں کوئی بنی سنوری عورت نہیں ملیگی اور نہ ھی علانیہ ان سے کوئی بات کی جاسکیگی . یہاں کی زندگی عیش، مسرت، خوشدلی اور مروت سے بھرپور ھے. لوگوں کی جسمانی صحت اچھی ھے لیکن شہر صاف نہیں ھے. مکانات تنگ ھیں. ھوا گرم اور خشک ھے- رنگ گندم گوں اور سیاھی مائل ھے (۱) .

سندھ کی سرسبزی اور شادابی کے متعلق مسعودی کا بیان ھے کہ :-

یہاں کھیت بہت زیادہ ھیں اور درخت اور آبادیاں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ھوئی ھیں (۲) .

علمی حالت

عرب سیاحوں اور تاریخدانوں کی تصنیفات سے معلوم ھوتا ھے کہ سندھ کے باشندے علم و ادب میں بڑی مہارت رکھتے تھے- سندھ نے اس دور میں بہت سے باکمال عالم و فاضل پیدا کئے جنہیں مختلف علوم و فنون میں خاص درجہ حاصل تھا- مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، صرف، نحو، منطق، فلسفہ، تاریخ، ریاضی، طب،

---

(۱) ابن حوقل، ص ۲۳۲، احسن التقاسیم، ص ۴۸۰ بحوالہ عرب وھند کے تعلقات.
(۲) مروج الذھب، ص ۳۷۸ .

ادب، شعر، عروض، معانی، بیان وغیرہ میں غیر معمولی ملکہ رکھتے تھے۔ منصورہ علم و فضل کا مرکز تھا۔ دیبل، اروڑ اور سہون میں بھی منقول و معقول کے بڑے ماہر اور صاحب کمال لوگ رہتے تھے. ان شہروں میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا. منصورہ میں علم و فضل کا اسقدر چرچا تھا کہ عرب سے کئی عالم و فاضل اور شاعر و ادیب کھنچکر سندھ میں آتے تھے۔ مشہور عرب شاعر مطیع بن ایاس ھشام تفلبی کے زمانہ میں منصورہ آئے اورکافی عرصہ تک ٹھیرے رہے (۱). قدیم عربی شاعری کےماہر اور صاحب حماسہ ابو تمام کے ھمعصر ابو عبادہ ولید بن عبیدالبحتری سنہ ۲۸۴ھ میں سندھ میں وارد ھوئے (۲). مشہور عرب شاعر فرزدق سن رسیدہ ھونے کی وجہ سے سندھ خود نہیں آسکے لیکن کسی کام کے سلسلہ میں والیٔ سندھ تمیم بن زید عتیبی کے نام اپنا قصیدہ ارسال کردیا.

شعرا کے علاوہ مذھبی فرقوں کے مبلغ بھی سندھ میں وقتاً فوقتاً آتے رھے. خارجی فرقہ کے مبلغ حسام بن مجاھد اور شیعہ فرقہ کے مبلغ عبداللہ اشتر کے بعد سومروں کے عہد حکومت میں اسماعیلی فرقہ (شیعہ) کے داعی آنا شروع ھوئے. سنہ ۱۰۷۹ع میں سید نورالدین آئے جنھوں نے اسلام کے اصول و عقائد مقامی زبانوں میں بیان کئے جس کی وجہ سے اسماعیلی دعوت اسقدر پھیلی کہ سندھ کے سومرہ حکمران اسماعیلی ھوگئے اور ملتان کے حکمران نے بھی یہی مسلک اختیار کرلیا.

عربوں کے دور حکومت میں سندھ کی زرخیز زمین سے ایسے

---

(۱) الاغانی، ج ۱۲ ص ۲۷۰.
(۲) معجم البلدان، ص ۵۱.

جید اور صاحب کمال اہل علم و فضل پیدا ہوئے جنہوں نے دنیائے اسلام میں بڑی شہرت حاصل کی اور عرب و عجم سے خراج تحسین وصول کیا. ان میں سے حسب ذیل علما و فضلا کے نام تاریخ میں ملتے ہیں:-

(۱) مولانا اسلامی جو محمد بن قاسم کے حملہ کے وقت مسلمان ہوئے اور پھر اسلامی تعلیم حاصل کرکے بڑے متبحر عالم ہو گئے. (۲) قاضی موسیٰ (۳) محمد بن ابی شوراب (۴) علی بن ابی شوراب (۵) سطیع بن اباس (۶) ابوالعباس احمد بن صالح التمیمی المنصوری، یہ داؤدی مذہب کے امام تھے (۷) ابراهیم بن محمد بن ابراهیم بن عبداللہ دیبلی (۸) شیخ علی بن موسیٰ (۹) ابو محمد عبداللہ بن جعفرالمنصوری (۱۰) شیخ ابوتراب تبع تابعی (۱۱) شیخ ابوالقاسم شعیب بن دیبلی (۱۲) شیخ ابو العباس احمد بن عبداللہ دیبلی (۱۳) شیخ ابوالعباس محمد بن محمد عبداللہ دراق دیبلی (۱۴) شیخ ابو علی سندھی جو مشہور صوفی بزرگ، عارف کامل شیخ بایزید بسطامی (وفات سنہ ۲۶۱ھ) کے پیران طریقت میں سے تھے (۱۵) منصور بن حاتم نحوی (۱۶) شیخ ابو جعفر محمد بن ابراہیم دیبلی.

عربوں کے دور حکومت میں متعدد سندھیوں نے عرب میں جا کر سکونت اختیار کی اور ان میں سے کئی متبحر عالم اور نامور شاعر ہوئے جن میں سے ابو معشر کا نام سرفہرست ہے جنہیں حدیث، فقہ، اور مغازی میں بڑا کمال حاصل تھا. انکے فرزند ابو عبدالملک محمد (وفات سنہ ۲۴۴ھ) بھی بڑے مشہور عالم ہوئے. اِن دو باپ بیٹوں کے علاوہ شیخ الاسلام عبدالرحمان بن عمرو امام اوزاعی، حافظ ابو محمد بن سالم السندھی، ابوالعباس فضل بن سکیف السندھی اور ابو نصر فتح بن عبداللہ السندھی کے اسما قابل ذکر ہیں.

سندھیوں نے عربی شاعری میں بڑا نام پیدا کیا، چنانچہ ابوعطا سندھی عربی زبان کے بہت بڑے شاعر گذرے ہیں۔ ابوعطا کے علاوہ اس سلسلہ میں ہارون بن عبداللہ ملتانی، سندھی بن صدقہ، کشاجم سندھی، ابو ضلع سندھی، منصور ہندی اور اسحاق مستوفی کے نام بھی ملتے ہیں۔

سندھی زبان و ادب

عرب حکمراں اور علما سندھ کے علم، ادب اور زبان سے بیگانہ نہیں رہے۔ انہوں نے سندھی پنڈتوں اور ویدوں کی مدد سے سندھ کی کئی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کروایا جو طب، جوتش اور ریاضی وغیرہ علوم سے تعلق رکھتی تھیں۔ صرف یہی نہیں، بلکہ سندھ میں رہنے والے عربوں نے سندھی زبان کو اپنایا اور سندھی ادب میں بھی اضافہ کیا، حالانکہ ان کے دور حکومت میں سرکاری اور تعلیمی زبان عربی تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہارون رشید کے وزرا (برامکہ) کی قدردانی کے باعث متعدد سندھی عالم و ادیب عرب پہنچے اور اپنے علمی جوہر دکھائے۔ ان میں سے ایک سندھی شاعر نے ایک روایت کی رو سے فضل بن یحییٰ برمکی کے سامنے اور دوسری روایت کی رو سے یحییٰ بن خالد برمکی کے سامنے حسب ذیل شعر پڑھا:-

اره بره کنکره۔ کرا کری منندره

یا

اره اصره ککرا۔ کی کره منندره (۱)

ابن نورالدین المکی کی کتاب "نزھۃ الجلیسا" سے پتہ چلتا ہے کہ مندرجہ بالا بیت حضرت بلال نے حضور انور رسول اکرم

---

(۱) ملاحظہ ہو "سندھی زبان کی مختصر تاریخ" از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، ص ۴۵ تا ۴۷۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے مدح میں اپنی افریقی زبان میں کہا تھا(۱).
مذکورہ بیت میں چونکہ سندھی زبان کی کوئی علامت نہیں
ھے، اور پھر حضرت بلال کی جانب بھی منسوب ھے، لہذا اسے
کسی سندھی بیت کی بگڑی ھوئی صورت نہیں کہا جاسکتا.
البتہ اس روایت کو صرف اس حد تک صحیح سمجھنا چاھئے کہ
سندھی شاعر نے برمکی وزیر کے سامنے جو شعر پڑھا ھوگا
وہ سندھی زبان میں ھوگا. عربوں کے لئے چونکہ سندھی زبان بھی
ویسی ھی اجنبی تھی جیسی افریقی زبان، اس لئے ھوسکتا ھے کہ
دونوں روایتوں میں ایک ھی بیت نقل کیا گیا ھو.

قرآن مجید کا سندھی ترجمہ

مذکورہ روایت اس امر کا ثبوت ھے کہ عربوں سے قبل یا
عربوں کے دور میں سندھی زبان میں شعر کہا جاتا تھا. ایک
اور روایت سے ثابت ھوتا ھے کہ سندھی زبان لکھی پڑھی جاتی
تھی اور سندھی شعر موجود تھا. عربی کی ایک کتاب "عجائب
الھند" میں مذکور ھے کہ منصورہ کے حاکم عبداللہ بن عمر ھباری
کے زمانہ میں منصورہ کے ایک عالم نے شمالی سندھ کے ایک ھندو
راجہ کے کہنے پر قرآن مجید کا سندھی زبان میں ترجمہ کیا اور
سندھی ھی میں اسلامی تعلیمات سے متعلق ایک نظم کہی (۲).
یعنی قرآن مجید کا ترجمہ سب سے اول سندھی زبان میں ھوا.
اس سے معلوم ھوتا ھے کہ سندھی زبان میں اس وقت بھی ایسی
خوبیاں اور خصوصیات پائی جاتی تھیں جن کی بنا پر اسے علمی
اور ادبی مقاصد کیلئے استعمال کیا جاسکتا تھا.

---

(۱) ملاحظہ ھو "سندھی زبان کی مختصر تاریخ" از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ،
ص ۴۵ تا ۴۷.

(۲) "عجائب الھند" از بزرگ بن شھریار، ص ۴۴.

سومرہ دور ۱۰۵۰ع - ۱۳۵۱ع

فارسیِ زبان کا اثر

سندھ میں سومرہ قوم کے عہد حکومت میں عربی کے ساتھ فارسی زبان کا اثر و نفوذ بھی نظر آتا ھے. بشاری مقدسی لکھتے ھیں :-

ملتان میں اگرچہ عربوں کی بڑی تعداد ھے تاھم فارسی زبان عام طور پر سمجھی جاتی ھے (۱).

ابن ابی اصیبعہ لکھتے ھیں :-

منکہ ھندی (مانک سندھی) بڑے طبیب، فیلسوف اور دانا تھے. ھندی (سندھی) علوم و فنون میں بڑے ماھر اور ھندی (سندھی) اور فارسی زبانوں کے عالم تھے. انھوں نے سمیات کے متعلق "شاناق" ھندی کی کتاب ھندی سے فارسی میں ترجمہ کی. وہ ھارون رشید کے ھمعصر تھے. انھی کے زمانہ میں ھند (سندھ) سے عراق آئے، اور ان کا علاج کیا. وہ سلیمان بن علی ھاشمی کے ساتھ ملکر ھندی سے فارسی اور عربی زبانوں میں ترجمے کرتے تھے (۲).

اس زمانہ میں ایک اور سندھی طبیب شرک ھندی (چرک سندھی) کی کتاب جو علم طب میں تھی پہلے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئی اور بعد میں عبداللہ بن علی فارسی نے عربی میں منتقل کی (۳).

---

(۱) "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم" از بشاری مقدسی بحوالہ ھندوستان عربوں کی نظر میں- ج اول، ص ۳۸۹،۳۹۰.

(۲،۳) "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" ج دوم از ابن اصیبعہ بحوالہ ھندوستان عربوں کی نظر میں- ج دوم، ص ۲۲۷.

ان حقائق سے معلوم ہوتا ھے کہ عربوں کے آخری دور میں اور سومروں کے عہد حکومت میں سندھ میں فارسی نے علمی زبان کی حیثیت اختیار کرلی تھی. سومروں کے عہد میں سندھ کا شمالی حصہ کچھ عرصہ تک ملتان اور آچ کے توسط سے دھلی کی حکومت کے زیر اثر رھا. دھلی کی حکومت کی دفتری اور تعلیمی زبان چونکہ فارسی تھی، اس لئے بھی سندھ میں فارسی رائج ھوئی.

سندھی زبان

سومروں کے عہد میں اگرچہ عربی اور کسی حد تک فارسی بھی دفتری اور تعلیمی زبانیں رھیں لیکن سومروں کی مادری زبان چونکہ سندھی تھی، لہذا سندھی خوب پھلی پھولی اور تجارت پیشہ لوگوں کے یہاں خط و کتابت کی زبان رھی. مشہور سیاح ابن بطوطہ (۱۳۷ع) لکھتے ھیں :-

> لاھری بندر میں کئی دیواروں پر ھندی (سندھی) زبان اور تحریر میں کتبے لگے ھوئے تھے (۱).

اس کے علاوہ سومرہ حکمران سندھی زبان و ادب کے محافظین بھٹوں، بھانڈوں اور چارنوں کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کرتے رھے. سومرہ حکومت کا مرکز زیریں سندھ میں تھا اس لئے سندھی زبان اور کاٹھیاواڑ اور گجرات کی زبانیں ایک دوسرے پر اثر انداز ھوتی رھیں. اس کے ساتھ ھی ساتھ سندھی زبان اور تھر اور ڈھٹ کے علاقوں کے محاوروں میں بھی ایک دوسرے سے قریبی تعلق پیدا ھوا، اور تھر اور ڈھٹ کے محاورے معیاری سندھی زبان کے اور بھی قریب تر آئے. صرف یہی نہیں، بلکہ کچھ کے علاقہ میں

---

۱) "رحلہ" ابن بطوطہ" ار ابن بطوطہ اردو ترجمہ، ج ۲، ص ۲۶۱.

سومروں نے بستیاں قائم کیں جس کی وجہ سے سندھی زبان کچھ میں بھی پھیلی (۱) .

یہ دور سندھی زبان کی بیداری اور ترقی کا دور تھا . اس دور میں اسلامی تبلیغ کا ذریعہ بھی سندھی ھی کو بنایا گیا. اور فطری سندھی شاعری بھی ارتقائی منازل تیزی کے ساتھ طے کرنے لگی . عرب تاریخوں کے علاوہ ایک ثبوت اور بھی موجود ھے جس سے معلوم ھوا ھے کہ اس زمانہ میں سندھی ایک ماجھی ھوئی اور ترقی یافتہ زبان تھی, اور اس میں ادبی مواد موجود تھا. آٹھویں صدی عیسوی میں ایک سیاح عالم آچاریہ ادیوتن سوراشٹر کے دربار سے سندھ اور سندھی زبان کی تحقیق کے سلسلہ میں سندھ میں آئے , اور سنہ ۷۷۸ع میں واپس جاکر اپنی تحقیق کی بنا پر "کولیہ مالھا کہا" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جس میں سندھی شاعری کے متعلق اظہار خیال کرتے ھوئے لکھتے ھیں:-

> ھمنے ایسے سندھی شاعر دیکھے جنھیں اپنے ملک پر ناز تھا . وہ سریلے نغمہ کا ذوق رکھتے تھے اور اپنے نغموں کو نزاکت اور مٹھاس کے ساتھ نرم پد اور لہجہ میں انتہائی سریلے انداز میں گاتے تھے (۲) .

اس بیان پر ڈاکٹر جیرامداس نے اپنی رائے یوں ظاھر کی ھے:-

> اس سے ثابت ھوتا ھے کہ آٹھویں صدی عیسوی میں سندھی زبان کا اپنا جداگانہ نام تھا, اور اسے ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی نیز اپنے بلندپایہ ادب کی بدولت اس زمانہ میں

---

(۱) "سندھی زبان کی مختصر تاریخ" از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ سنہ ۱۹۶۳ع، ص ۵۴.

(۲) سہ ماھی "مہران" ۱۹۶۸ع، ص ۱۴۷.

ھندو پاک کی تمام زبانوں میں اپنا اعلیٰ معیار قائم کئے ہوئے تھی (۱) .

مذکورہ بالا سیاح کے بعد نویں صدی عیسوی میں گجرات کے درباری شاعر "کوی راج سیکر" نے ھندوستان کے مختلف علاقوں کی ادبی اور لسانی تحقیق و جستجو کی. انہوں نے سندھی زبان وادب کی بڑی تعریف کی ھے اور لکھا ھے کہ :-

یہ (سندھ) تمام ملکوں کا تاج ھے. یہاں کے باشندے سنسکرت کے نام سے دور ھیں. وہ اپنی خوبصورت دیسی زبان میں نہایت ھی لطف و شیرینی کے ساتھ بات کرتے ھیں. یہاں کی انوکھی ادبی خوبی لاڑ (زیریں سندھ) کے شعرا کے لئے ھی مخصوص ھے. انکے شعر کی پیاری اور پسندیدہ طرز جس کی امتیازی خصوصیت رنگینی اور لطافت ھے, "لاڑی طرز" کے نام سے مشہور ھے (۲).

ان شہادتوں سے معلوم ھوتا ھے کہ عربوں خواہ سومروں کے عہد میں سندھی شاعری عروج پر تھی اور اپنی نظیر نہیں رکھتی تھی.

اس دور میں سندھی مسلمان علماء عربی زبان میں بھی تصنیف و تالیف کرتے رھے. اسی طرح ایک سندھی پنڈت نے جن کا نام "دیول رشی" تھا, نویں یا دسویں صدی عیسوی میں "دیول سموتی" کے نام سے سنسکرت میں ایک کتاب لکھی (۳).

---

(۱) سہ ماھی "مہران" ۱۹۶۸ع، ص ۱۴۷.
(۲) " " " ص ۱۴۷ تا ۱۴۹.
(۳) "ھندواسی" مورخہ ۳- جون سنہ ۱۹۵۶ع- ملاحظہ ھو "سندھی نثر کی تاریخ" از منگھارام ملکانی.

سومرہ دور کا ادبی سرمایہ

سومرہ دور سندھی زبان کے ادب عالیہ کا بنیادی دور ہے. سندھ کی رومانی داستانیں اور مقامی کہانیاں زیادہ تر اسی دور سے تعلق رکھتی ہیں. سندھی شاعری کی تمثیلی کہانیاں مثلاً سسئی پنہوں، عمر مارئی، مومل رانو، سورٹھ اور رائے ڈیاچ، لیلا چنیسر، سوھنی مہینوال اور مورڑبو اور مچھ وغیرہ سومرہ ھی کے دور سے وابستہ ھیں. ان کہانیوں کے علاوہ مندرجہ ذیل کہانیاں بھی اسی دور سے متعلق ھیں جنہیں سندھ کے بھانڈ، بھٹ، شاعر اور داستان گو گاتے اور بیان کرتے رھے ھیں:-

سیف الملوک، مل محمود، مہرنگار، خدادوست اور محمودغزنوی، اور ڈنو سنار.

یہ عشقیہ اور رزمیہ داستانیں آج تک مشہور ھیں اور محفلوں میں سنائی جاتی ھیں. یہ تاریخی داستانیں اور دیگر تاریخی واقعات بھٹوں، بھانڈوں اور داستان گویوں کے ذریعہ ھی سے محفوظ رہ سکے ھیں. ان کہانیوں اور واقعات کے درمیان بیان میں رنگینی اور تاثیر پیدا کرنے کیلئے ابیات بھی پڑھے جاتے ھیں، جن کو "گ٘اہ" کہا جاتا ھے.

گ٘اہ ایک قسم کی محاکاتی اور واقعاتی شاعری ھے. خیال ھے کہ اس لفظ کی بنیاد گ٘ائڻ (گانا) ھے. گ٘ائڻ سے گ٘اہ بنا ھے، اور گ٘اہ، گ٘اہ میں تبدیل ھوگیا ھے. گ٘اہ ساخت کے اعتبار سے منظوم مصرعے ھیں، جن میں سے اکثر دوھڑے کی صورت میں ھیں. بعض گ٘اھوں میں دو مصرعوں کے بعد ٹیپ (ترجیع) کے مصرعہ کے طور پر ایک چھوٹا سا مقفیٰ فقرہ بھی ھوتا ھے. مضمون کے لحاظ سے ان مصرعوں میں کہانی کے بعض خاص پہلوؤں کو اجاگر کیا جاتا ھے. اگرچہ

گاہ کی ابتدا کا اندازہ لگانا مشکل ہے تاہم اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہ نہایت ہی قدیم صنف ہے، اور قدیم زمانہ سے بھٹوں، بھانڈوں اور داستان گویوں کی زبانی ابتک چلی آرہی ہے۔

آجکل داستانوں میں جو گاہیں سننے میں آتی ہیں، ان میں سے اکثر ساخت اور زبان کے اعتبار سے بعد کی معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود بعض گاہوں کے متعلق محققین کی رائے ہے کہ یہ قدیم دور کی یعنی سومرہ دور کی ہیں۔ یقین کے ساتھ تو نہیں کہا جاسکتا کہ یہ سومرہ دور کی ہیں، یا نہیں۔ تاہم جن گاہوں کے متعلق گمان غالب ہے کہ یہ سومرہ دور سے تعلق رکھتی ہیں ان کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے:۔

رومانی داستانیں

سومرہ دور کی داستانوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک قسم رومانی داستانوں کی ہے اور دوسری رزمیہ داستانوں کی۔ رومانی داستانوں میں سے بعض زیادہ مشہور ہیں مثلاً سسئی پنہوں اور عمر ماروی وغیرہ، اور بعض کم شہرت رکھتی ہیں۔ دونوں قسم کی داستانوں میں گاہیں موجود ہیں۔

(۱) سسئی پنہوں

اس رومانی داستان کی بنیاد مکران اور سندھ کی تجارت پر رکھی گئی ہے جو کیچ، مکران، کرمان اور اھواز سے عراق تک قافلوں کے ذریعہ ہوتی تھی۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ یہ کہانی عربوں کے آخری دور یا سومروں کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہے۔ مشہور انگریز مصنف رچرڈ برٹن نے یہ کہانی بیان کرتے ہوئے درمیان میں گاہیں بھی پیش کی ہیں۔ اس کہانی میں بیان کردہ حسب ذیل گاہیں اپنی قدامت پر دلالت کرتی ہیں:۔

سسئی نے کیچ کے تاجروں سے تجارتی اشیا کی تفصیلات معلوم کیں تو اسے جواب ملا کہ :-

چوٹا چندن، کیوڑا، مونسان
وکر جون ویھون،
مل مھانگي آڄ ڏيان، ٻيو
کيٽي پيٽون

میرے پاس بیسیوں چیزیں ہیں
چوٹیاں، چندن اور کیوڑہ وغیرہ،
میں اپنی چیزیں مہنگی بیچتا ہوں
اور دگنا منافع کماتا ہوں.

پنہوں کا ملازم (سیلزمین) "بابیہو" پنہوں کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے :-

آءٌ ڪڄاڙو آهيان، جي ڏسو
مون پيي ڏٿيوم،
تهين جي سونهن جون مونکي
چاليهون واٽوم.

میں تو کچھ بھی نہیں ہوں،
آپ میرے مالک کو دیکھئے،
میرا حسن انکے حسن و جمال
کا چالیسواں حصہ ہے.

(۲) عمر مارئی

نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ کہانی سومرہ دور کی ہے. رچرڈ برٹن نے یہ کہانی بھی گاہوں کے ساتھ اپنی کتاب میں درج کی ہے. لیکن ان میں سے ایک گاہ بھی قدیم دور کی نہیں کہی جاسکتی. بہالپور میں ایک روایت سنی گئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ عمر سومرو مروٹ کے قلعہ (۱) کے حکمران تھے اور مارئی کو وہیں قید کر رکھا تھا. مزید بتایا گیا ہے کہ اس قلعہ کے نواح میں حسب ذیل سندھی بیت مشہور ہے جو مارئی کی جانب منسوب ہے :-

---

(۱) مروٹ کا قلعہ دریائے ھاکڑہ کے کنارے پر بیکانیر کے قریب واقع ہے.

عمر! پيچ نہ آنيچ، نہ کر زور
ضعيف سان
هت نہ هوندا هيترا، پيا در
متي دروان
ويندا هيءَ نيل فنا ٿي، سڀ نغارا
نشان
قاضي ٿيندا پاڻ، شرع ڪندا سومرا(۱)

اے عمر! میری آن نہ توڑ اور کمزور کے ساتھ زبردستی نہ کر۔ یہ اتنے دربان جو دروازہ پر کھڑے ھیں، یہ نہیں رھینگے۔ یہ ھاتھی، یہ شاھی نوبت اور علم سب تباہ و برباد ھوجائینگے۔ اے سومرے! وہ (اللہ) خود منصف ھونگے اور خود ھی فیصلہ کرینگے۔

عمر سومرہ مروٹ کے قلعہ کے حکمران تو نہیں تھے، البتہ اس بیت سے حسب ذیل باتوں کی وضاحت ضرور ھوتی ھے:-

(۱) سومرہ خاندان کی حکومت بہالپور تک پھیلی ھوئی تھی۔ اس لئے یہ کہانی بہالپور تک مشہور ھو گئی۔ یہ علاقہ آخری دور میں بھی سندھ کی حدود میں رھا، اس لئے سندھی کے ابیات اس علاقہ میں بھی مشہور ھو گئے۔

(۲) فنی اعتبار سے خواہ الفاظ کی بندش کے لحاظ سے یہ بیت سومرہ دور کا معلوم نہیں ھوتا۔

(۳) سومل رانو

یہ کہانی سندھ کے آخری حکمران ھمیر کی جانب منسوب ھے۔ کہانی کا مرکزی اور اھم کردار رانو ھے جو ان کا سالا اور وزیر تھا۔ یہ کہانی بھی برٹن نے نقل کی ھے۔ اس میں بھی کئی گاھیں آخری دور کی ھیں اور متعدد ابیات حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کے شامل ھیں۔ البتہ حسب ذیل گاہ جو "ناتر" کی زبان سے کہلوائی گئی ھے، کسی حد تک قدیم ھے:-

---

(۱) "تاریخ قلعہ مروٹ" از مولانا عبدالرحمٰن مطبوعہ المطابع بہاولپور سنہ ۱۹۵۲ع، ص ۶۔

آءُ ٻانهي، رائيون ٻيون،	میں کنیز ہوں، رانیاں اور ہیں،
مون نيڻين م ٻل	مجھے نظرانداز نہ کر
سندي ڪاڪ ڪنڌيءَ، آهي	کاک میں حسن وجمال والیوں
ڪامڻين هل	کا بڑا چرچا ہے

(۴) لیلا چنیسر

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک سنان الدین چنیسر سنہ ۱۲۲۴ ء میں دیبل اور سندھ کے حکمران تھے۔ یہ دور سومرہ خاندان کی حکومت کا دور تھا، اور سومرہ حکمرانوں میں چنیسر کا نام مشہور ہے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ یہ کہانی سومرہ دور کی ہو(۱)۔ اس داستان میں بھی گاہیں موجود ہیں جو بعد کی ہیں۔

(۵) سوهڻي مہینوال

سندھ کی عوامی روایت کی رو سے "سهڻی میھار" (سوھنی مہینوال) کی تربتیں شہدادپور کے قریب ویران اور خشک شدہ دریا کے کنارہ پر ہیں۔ یہ مقام "سهڻی جو ڏورو" (سوھنی کی وادی) کے نام سے مشہور ہے، اور یہ دریا سومرہ دور میں "لوھانی" کے نام سے شہرت رکھتا تھا(۲)۔ پنجاب کی عوامی روایت کے مطابق مہینوال ترکستان کے ایک تاجر تھے۔ ترکستان سے تجارت پیشہ لوگوں کی آمد محمود غزنوی کی فتوحات کے بعد شروع ہوئی، اور یہ دور سندھ میں سومرہ حکومت کا دور تھا۔ غرض یہ ہے کہ دونوں روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کہانی سومرہ دور سے تعلق رکھتی

(۱) "لیلا چنیسر" از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ، ص ۲، ۳ مقدمہ۔

(۲) "سندھی زبان کی مختصر تاریخ" از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، ص ۵۹۔

ہے. اس کہانی میں بھی گاہیں موجود ہیں لیکن وہ بعد کی معلوم ہوتی ہیں.

(۶) سورٹھ، رائے ڈیاچ

یہ داستان بھی سومرہ دور کی ہے. اس میں جو گاہیں ہیں وہ بھی قدیم دور کی معلوم نہیں ہوتیں.

(۷) سیف الملوک

یہ داستان بھی سومرہ دور کی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کا مرکزی کردار سیف الملوک تاجر دلورائے کے دور میں اروڑ سے گذرا تھا، اور دلورائے سومرہ دور میں تھا. اس داستان میں دریا کے رخ بدلنے کا ذکر ہے، اور یہ واقعہ بھی سومرہ دور میں ہوا تھا (۱). اس داستان میں جو ابیات موجود ہیں وہ بعد کے زمانہ کے شعرا کے لکھے ہوئے ہیں.

(۸) مل محمود ء مہر نگار

اس کہانی کا تعلق شاہ مکائی (عرف جیئے شاہ) کے ساتھ ہے جو پانچویں یا چھٹی صدی میں نیرن کوٹ (حیدرآباد) میں وارد ہوئے (۲). اس کہانی میں بھی گاہیں موجود ہیں لیکن ان کا زمانہ متعین نہیں کیا جا سکتا.

(۹) خدا دوست اور محمود غزنوی

اس کہانی کا تعلق سلطان محمود غزنوی کے ساتھ ہے جو پانچویں صدی ہجری میں سندھ میں آئے. اس کہانی میں بھی گاہیں موجود ہیں.

---

(۱) "سندھی زبان کی مختصر تاریخ" از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، ص ۵۸.
(۲) "مشہور سندھی قصے" از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ.

(۱۰) ڈمن سنار

اس کہانی کا تعلق اروڑ کے حکمراں دلو رائے کے دربار سے ہے. اس کہانی نے شہرت حاصل نہیں کی لیکن اس میں جو ڳاھیں موجود ھیں ان میں سے زیادہ تر قدیم ھیں. اس لئے اس کہانی کی تفصیل بھی پیش کی جاتی ہے اور ڳاھوں کا تجزیہ بھی.

جوتشی نے راجا کو بتایا کہ آپ کی لڑکی کی شادی آپکے وزیر ڈمن سنار کے لڑکے کے ساتھہ ھوگی. یہ پیشینگوئی سنکر راجا نے ڈمن کے پانچوں بیٹے قتل کروا دیئے اور ڈمن کو شہر بدر کردیا. جلا وطنی کے زمانے میں ڈمن کے یہاں دو لڑکے پیدا ھوئے جو بڑے ھونے پر اروڑ میں آکر بس گئے. ایک بار ان میں سے چھوٹے لڑکے کی ملاقات شہزادی سے ھوئی اور شہزادی اس پر عاشق ھوگئی. آخر شہزادی کی شادی اس لڑکے کے ساتھہ ھوئی.

اس کہانی میں جو ڳاھیں موجود ھیں ان میں سے حسب ذیل دو ڳاھیں مثال کے طور پر پیش کی جاتی ھیں. فن اور زبان کے اعتبار سے اگر ان کو اس دور کی ڳاھیں کہا جائے تو بیجا نہیں ھوگا (۱).

(۱)

اک نہ ڪجي ڏنڊڻو ،	آک سے مسواک نہیں بنانی
سپ نہ کائجي ماہ	چاھئے اور سانپ کا گوشت
اتي نہ لائجي نينھڙو ،	نہیں کھانا چاھئے ،
جتي ٺئي نہ جيءُ وٺاہ	عشق وھاں نہ کرنا چاھئے
تن سونارن سان الا ،	جہاں دل کو سکون حاصل
سون سن موهيو وي	نہ ھو. میرا دل ان سناروں پر
	ریجھہ گیا ہے.

(۱) "ڳاھوں سے باتیں" از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ، سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۶۴ع، ص ۵ تا ۸.

(۲)

جاڳ سڄاڳ سقير تئي،
تون سولو ڍارو ڍار
پنج اڳيئي ماريا،
هئي سهائي جو سهاڳ

بیدار اور ہوشیار ہو،
اور سیدھا پانسہ پھینک
پانچ پہلے ہی مارے گئے ہیں،
یہ سہائی کا سہاگ ہے

حسب ذیل گاہ بھی اسی کہانی کی ہے لیکن اس میں لفظ "قرار" کی موجودگی بتاتی ہے کہ یہ بعد کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے:-

سهراستو ننڊون كرين،
تهن كي ناهه قرار،
ڦڙ ڦڙ وسن مينهڙا،
تو سهائي جو پسي هار
تن سونارن سان الا،
مون من سوهيو وي

اے خسر! آپ سوئے ہوئے ہیں،
اور لہو کو قرار نہیں ہے
بوند بوند مینہ برستا ہے،
اور سہائی کا ہار بھیگتا رہتا ہے
میرا دل ان سناروں پر ریجھ گیا ہے۔

راجہ دلو رائے آٹھویں یا نویں صدی عیسوی میں گذرے ہیں۔ سومرے ابھی پورے طور پر ابھرنے بھی نہیں پائے تھے کہ دلو رائے اروڑ کے باقاعدہ حکمراں تھے۔ اس لئے مذکورہ بالا کہانی آٹھویں یا نویں صدی عیسوی کی سمجھنی چاہیے۔ دسویں یا گیارھویں صدی میں اروڑ پر دلو رائے کے خاندان میں سے ھمیر نامی ایک راجہ حکومت کرتے تھے جو مسلمان ہوگئے تھے۔

رزمیہ گاہیں

اس دور کی رزمیہ داستانیں بھی موجود ہیں جن سے تاریخی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان داستانوں میں بھی گاہیں شامل ہیں جو رزمیہ شاعری کا اچھا نمونہ ہیں۔ ان میں بعض گاہیں

ایسی بھی ہیں جو ابتدائی دور کی معلوم ہوتی ہیں . ذیل میں ان گاھوں کی تفصیل پیش کی جاتی ہے .

(ا) سومروں اور گجروں کی لڑائی

سنہ ۱۰۵۰ع سے لیکر سنہ ۱۲۵۰ع تک کے درمیانی عرصہ میں سومروں اور گجروں کے مابین لڑائیاں ہوئیں . ایک بار صلح ہوئی اور سومرہ حکمران بھونگر گجروں کو اپنی لڑکی بیاہ کر دینے پر آمادہ ہوئے لیکن ان کے بیٹے ڈونگر نے انکار کردیا . اس لئے گجروں نے سومروں پر پھر حملہ کیا . اس زمانہ میں ڈونگر کے بھائی دودو ناراض ہوکر دلورائے کے پاس چلے گئے اور وہیں رہنے لگے تھے(۱). ڈونگر نے ایک دانشمند قاصد کے ذریعہ دودو کو پیغام بھیجا. دودو ناراض تھے . قاصد کو جواب دیا کہ "اگر کمزور ہوگئے ہیں تو کوئی کنیز دیدیں اور صلح کر لیں". اس پر قاصد نے ان سے کہا :-

جر نہ کٹن کینگرین ، راہ نہ ڳنڍين ويٺ ، گولي وڃي گجرين، تہ چندا دودي ڀيڻ	پاتال کا پانی لوٹیاں بھر کر نکالنے سے ختم نہیں ہوتا، اور بادشاہ خصومتیں نہیں کرتے . گجروں کے پاس کنیز جائیگی تو بھی یہی کہینگے کہ یہ دودو کی بہن ہے .

اس گاہ اور بعض دوسری گاھوں کے متعلق ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کا خیال ہے کہ یہ سومرہ دور کی ہیں . ان لڑائیوں سے

(۱) یہ دلورائے پہلے دلورائے نہ تھے بلکہ اس نام سے اسی خاندان کے ایک اور فرد تھے .

متعلق ایک اور گاہ بھی پیش کی جاتی ہے، جو بھی ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اسی دور سے تعلق رکھتی ہے :-

پونئري ڪيا پرياڻ، پرڙي تي پر ٿيا، تنهي وجهي واريون، لوڙيون لڪ مٿا.	پونئرو دور چلا گیا، اور برڑو نے کہیں اور ٹھکانا بنالیا اور وہ پہاڑوں کی گھاٹیاں پھلانگ کر چلے گئے.

چاوت ڪري چڙهيو، گجر گهوملئا، پواڙا پونئري پيلئين، گهٽا وچ ڪٽا.	پونئرو کے جانے پر گجر گھومل سے چڑھائی کرکے آئے اور پونئرو کے حمایتیوں کی غیرموجودگی میں خوب حملے کئے.

(۲) سومروں اور علاءالدین کی لڑائی

اس کہانی کی بنیاد علاءالدین ترم شیرین اور سومروں کی لڑائی پر ہے. یہ لڑائی سنہ ۱۳۱۲ع میں ہوئی تھی، جسے اس زمانہ کے "بھاگو" نامی بھانڈ نے گا کر مشہور کردیا. چونکہ یہ قومی لڑائی تھی، اس لئے اسے بڑی شہرت ملی اور آج تک اسے وہی اہمیت دی جاتی ہے. اور اسی اہمیت کے پیش نظر کئی بھٹوں اور شاعروں نے اس کہانی سے متعلق ابیات کہے ہیں اور ان میں کئی ابیات کے بارہ میں گمان غالب ہے کہ یہ اس دور کے ہیں. اس لڑائی سے متعلق ذیل میں تین گاہیں پیش کی جاتی ہیں :-

(۱)

آو ابڑو اپگ، او ڈونگرلي ڈيھ، او جونا چانو جگ، جو سر ٽيين سونٽا سھي	ابڑو میدان کارزار میں ثابت قدم رہنے والے ہیں اور انکی پہاڑ کی سی طاقت کی کوئی مثال نہیں ہے. وہ جونا کمزور ہے جو سر پر لاٹھیاں کھاتا ہے.

(۲)

سندھی	اردو
آپ سپ کنهن آچو، آپ نہ اچو کوہ مٹی ہ مٹي ٹنو، سورھ سر سندوہ	آسمان سب سے اونچا ہے، اور اس سے کوئی بھی اونچا نہیں ہے اے بہادر! مرنے کے بعد بھی تیرا سر آسمان کی طرح اونچا ہے.

(۳)

سندھی	اردو
آڑ آڈي ھئي ابڑي، ٹو چليون ڈھ لک، گھوڑي کند نہ ڦيربو، ماري او خلق.	ابڑو میدان کارزار میں ایک آڑ لیکر ڈٹ کر کھڑے ہو گئے اور لاکھوں کے لشکر سے مقابلہ کر کے ان کو تہہ تیغ کیا. نہ خود پیٹھ دیکر بھاگے اور نہ انکے گھوڑے نے گردن کو موڑا.

اس لڑائی میں جام ابڑو سمہ نے سومروں کی خواتین کو پناہ دی تھی. مذکورہ بالا ابیات میں اس لئے ابڑو سمہ کی شجاعت کو سراھا گیا ہے.

اس واقعہ کے متعلق تاریخ سے صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ سلطان علاءالدین (سنہ ۱۲۹۶ع — سنہ ۱۳۱۶ع) کے سپہ سالار ظفرخان نے سنہ ۶۹۷ھ (۱۲۹۷—۹۸ع) میں سندھ پر حملہ کیا تھا جسے بھٹوں اور بھانڈوں نے سلطان علاءالدین کی لڑائی سمجھکر گایا.

(۳) جام ھالو اور ھمیر سومرو کی لڑائی (۱)

ھمیر سومرو دودو کے بیٹے تھے. ھمیر نے عمر کوٹ کو اپنا دارالحکومت بنایا تھا. جام ھالو سمہ کی لڑکی باگھی ان کی

(۱) "سندھی زبان کی مختصر تاریخ"، ص ۶۷-۶۸.

بیوی تھیں ۔ باگھی کے بھائی ھوتھی جب اپنی بہن سے ملنے آئے تو انہوں نے ھمیر کی لڑکی جیجڑی کو دیکھا ۔ جب واپس گئے تو اپنے والد سے کہا کہ جیجڑی کے ساتھ میری شادی کرادیجئے ۔ جام ھالو نے ھمیر سومرو سے لڑکی دینے کو کہا لیکن انہوں نے انکار کردیا ۔ باگھی نے ھمیر سے اصرار کیا تو ھمیر نے ناراض ھوکر باگھی کو اپنے کوٹ (حویلی) سے نکالدیا ۔ باگھی اپنے والد کے پاس نہیں گئی، بلکہ کوٹ سے باھر ایک حویلی تعمیر کرواکر اپنے خانہ زاد خدمتگذار "سیکرہ" کے ساتھ وھیں رھنے لگی ۔ ھمیر کے آدمی ان کو ستانے لگے ۔ سیکرہ نے ان سے مقابلہ کیا لیکن مارا گیا ۔ اس پر باگھی نے اپنے والد کو پیغام بھیجا کہ :-

ٻـل ٻـاٻـل ٻانھو مئو ،
ھئو سوان مڙسـان رو ٻـن ،
ھـيـري رتـاس ڏنـدڙا ،
ھوس ڪاتـي سونو ڳن ،
مـولهيو مـوتين چـانئيو ،
ھوس پـر پرمـوتين پـوت

اے بہادر ابا ! میرا غلام مر گیا جو سیکڑوں مردوں سے زیادہ طاقتور تھا ۔ جسکے دانت ھیرے کی کنیوں جیسے تھے اور خنجر کا دستہ سونے کا تھا ۔ اور دستار کے طرہ میں موتی لگے ہوئے تھے ۔

یہ پیغام پنہچتے ھی جام ھالو کے فرزندوں ھوتھی ، علی اور پلی نے عمرکوٹ پر حملہ کردیا ۔

پلـي پـانـي نـہ پئـي ،
عـلـي ان نـہ کـاء ،
ھـميرانـي ڪوٽ مـان ،
جان جان جنگـ نـہ کياء

پلـی پانـی نہیں پیتا ،
علـی کھانـا نہیں کھاتا
جب تک کہ وہ ھمیر کے قلعہ پر حملہ کرکے اس کے ساتھ جنگ نہ کریں

اس لڑائی میں جام ھالو کو فتح حاصل ھوئی اور ھمیر

سومرو قتل ہو گئے اور ساتھ ہی ساتھ ہوتھی بھی قتل ہوئے جس پر باگھی نے بین کیا۔

هوتيءُ جي ڦٽيءُ کي،	ہوتھی کے کنگھے میں سونے
هو گيور گيور گل،	کے پھول جڑے ہوئے تھے
سڀ مرن سومرا،	تمام سومرے مرجائیں توبھی ہوتھی
تہ؛ کونهي ڦٽيءَ مل	کے کنگھے کے برابر نہیں ہیں۔

بہادر اور سخی مردوں کی تعریف

اس دور میں سخی مردوں کی شان میں مدح سرائی کا رواج عام تھا۔ لاکھو سمہ سومرہ دور میں تھے۔ سخی مرد بھی تھے اور بہادر اور سرکش بھی۔ ان کا کہنا تھا کہ جو شخص ان کے والد پھل کے مرنے کی خبر ان کو بتائے گا وہ اس کی زبان کاٹ دینگے۔ آخر ایک شاعر نے بڑی ہوشمندی کے ساتھ حسب ذیل بیت کے ذریعہ ان تک یہ خبر پہنچائی :-

هڪ ڦل پسجن واڙيين،	ایک پھل (پھول) تو گلزاروں میں نظر آتا ہے اور دوسرا پھل
ٻيا جي ٻنيـن ڏاٽ،	بھٹیوں میں بھنتا ہوا دیکھا جاتا ہے (یعنی ان دو
لاکا آءِ مهراڻ،	پھلوں کے علاوہ اب کوئی تیسرا پھل دیکھنے میں نہیں آتا)۔ اے لاکھو! تم مہران (دریائے سندھ) کی طرح (تیزی سے) آؤ،
تورءِ سڄو ڪاڇڙو (۱)	کیونکہ "کاچھو" (علاقہ کا نام) تمہارے بغیر ویران ہے۔

(۱) "سندھی زبان کی مختصر تاریخ"، ص ۹۱ تا ۹۳۔

جام لاکھو کے انتقال کے بعد کسی شاعر نے پران دریا سے سوال کیا:

جھوني تون پراڻ جڳ ڇٽيهہ، منهيرين، توکي ڏٺا هاڻ، لاکي پھڙا (۱)	اے پران! تو قدیم ہے اور تونے چھتیس جگ دیکھے ہیں کیا تونے اس دور میں لاکھو جیسے سخی اور بہادر بھی کہیں دیکھے ہیں.

پران نے جواب دیا.

لاکـالـکـ لـنگھـيا، آنڙ کـروڙ يـون آٺ، هـيـم هيـڙائـو هيـڪڙو، جو وري نہ آيو مون وٽ (۲)	یہاں سے لاکھے لاکھوں کی تعداد میں گذرے اور انڑ آٹھ، کروڑ کی تعداد میں. لیکن وہ سونے کا سوداگر پھر میرے پاس نہیں آیا.

جام لاکھو کے علاوہ وکیوڈاتار، جکھرو اوڈھانی، اوٹھو جکھرانی، سپڑ چوٹانی اورھنئند تھدیانی بھی سومرہ دور ھی کے سخی مردوں میں سے تھے.

ھنئند تھدیانی جو جام ساھڑ کی نسل سے تھے، ان کے متعلق ایک شاعر کا یہ بیت دستیاب ھوا ہے:

تَدي تہ ڏناس، سمون ساهڙ پٽ ہر، پدرو پرکنداس، هنئند تَديائي تئو	سمہ، ساھڑ کی نسل سے پیدا ہوتے ھی سخی نکلے. وہ ھنئند تھدیانی ھیں جو اپنی سخا کی وجہ سے مشہور ھیں.

بھاگو بھانڈ اور سمنگ چارن

سومرہ دور میں دو ایسے نامور شاعر گذرے ھیں جن کے نام ابتک قائم ھیں، ایک بھاگو بھانڈ اور دوسرا سمنگ چارن. بھاگو

(۱،۲) "سندھی زبان کی مختصر تاریخ"، ص ۹۱ تا ۹۳.

بھانڈ نے سندھ کی مشہور قومی لڑائی "دودو چنیسر کی کہانی" منظوم کی. ان کی نظم کردہ کہانی کی بعض گاھیں ابتک موجود ھیں جن میں سے بعض اوپر پیش کی جا چکی ھیں. بھاگو بھانڈ کے مزید حالات تحقیق طلب ھیں، اور اسی طرح سمنگ چارن کے حالات بھی تحقیق طلب ھیں. کہا جاتا ھے کہ وہ کیرا کوٹ کا باشندہ او لاکھو پھلانی کا درباری شاعر تھا (۱). سمنگ نے سمہ سرداروں کی مدح کی ھے او سومروں کی ھجو. وہ اروڑ کے حکمراں ھمیر سومرو کے ساتھ بغض رکھتا تھا کیونکہ انہوں نے ایک بار اسے قید کیا تھا. ھمیر کی ھجو کرتے ھوئے کہتا ھے:-

ستين ڏھو سوڄهرو، اٺين ڏاوندام، ھميراڻي باھوساڻي ورھين ڪي (۲)	ساتویں پشت تک نسلی خوبیاں قائم رھیں لیکن آٹھویں پیڑھی ان کو قائم نہیں رکھ سکی، آٹھویں پیڑھی والے ھمیر سومرو نے روشنی کو اندھیرے میں بدل دیا.

اسی طرح اور اشعار بھی عوامی روایتوں میں سمنگ سے منسوب کئے جاتے ھیں.

(۲) ایک بار سمہ جام لاکھو کے بڑے فرزند "پھل نے ایک شاعر کو چند گھوڑے بطور انعام دئے جو ڈھورو راؤ سومرو کی سازش سے چوری ھو گئے. ڈھورو راؤ ھمیر کے درباری امیر تھے. اس لئے دونوں کی ھجو کرتے اور بد دعا دیتے ھوئے حسب ذیل بیت کہا (۳):-

---

(۱) "پورب" سندھ یونیورسٹی کے شعبہ سندھی کی مخزن بابت سنہ ۶۹-۱۹۶۸ع، ص ۱۰۲، ۱۰۳.

(۲) مقالہ "سمنگ چارن" مہران، نمبر ۱، ۲، ص ۱۳۱.

(۳) "سندھی زبان کی مختصر تاریخ"، ص ۷۰.

ڏري ڏوري واء، جنهين چارڻ
سان ڪاه
پٽ پٽيي جو ٿئو، سيح وتايو ساه،
هميران پوراه، راڄ نہ ڪندا سومرا.

ڈھورو راؤ تباہ و برباد ہو جسے
شاعر کے ساتھ خصومت ہے،
دریا اپنا رخ بدلدے، اور اس
کا ملک ویران ہو جائے، ھمیر
کے بعد سومروں کی حکومت کا
خاتمہ ہو.

(۳) سمنگ چارن جام لاکھو کے اماپر وکیہ ڈاتار کے پاس بے موسم کے بیروں (ایک سرخ رنگ کا خودرو جنگلی پھل جو اپریل، مئی میں پیدا ہوتا ہے اور چنے کے دانہ کے برابر ہوتا ہے) مانگنے گیا جب وکیہ ڈاتار کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ ایک بھیڑ کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر پٹی باندھ رہے تھے. سمنگ نے یہ دیکھکر حسب ذیل بیت کہا:-

ڦلاڻي لاکي وٽ، مون وڏو
ڪيو وات،
گهٽين پٽيون ٻڌي، سوڏ ينندو
کهڙي ڏات

میں نے لاکھو پھلانی کے دربار
میں (وکیہ ڈاتار کے بارے میں)
بڑا دعویٰ کیا تھا لیکن جو
شخص بھیڑ کو پٹیاں باندھ
رہا ہو وہ دان کیا دیگا.

سمنگ نے بیروں مانگنے کیلئے جو بیت کہا تھا، وہ یہ ہے:-

آءٌ آيس توڏي، ٿرڏ ونگر
جهاڳيي،
جي وڪيو چام اپرادي، تہ
ڪمندا پيرون ڏي

میں آپکے پاس بیابان اور پہاڑ
طے کر کے آیا ہوں. اگر وکیہ
جام مہربان ہو تو مجھے بے
موسم کے بیروں دیدے.

اس کے جواب میں جام وکیہ نے بھی ایک بیت کہا جو یہ ہے:-

انبن لڳي نہ ڪيري، ٻچارين
لڳي نہ چٽ،
ورچارڻ ماٺ ڪر، جيسين
اچي وٽ.

اے چارن! موسم آنے تک ٹھیر
جا، جب تک آموں میں کیری
نہ لگ جائے اور دیگر پودوں
اور پیڑوں میں بور نہ آجائے.

اس پر سمنگ نے کہا:-

وت اچي تيسين وهان، تنهن
کي لڳي وير،
جيءُ چارٽيءَ جو وڃي، سر
واري ڏيندو ڪير

میں اگر موسم کے آنے تک ڈھیر جاؤنگا تو کافی وقت لگ جائیگا اور اس وقت تک اگر میری جان چلی گئی تو اسے کون واپس دلائیگا.

بکھر کے رضوی سادات اور سندھی ابیات

علاءالدین خلجی کے گورنر نصرت خان (وفات سنہ ۱۳۲۸ع) کے متعلق ایک روایت، اور اس روایت کے سلسلہ میں ایک سندھی بیت ملا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بیت چودھویں صدیءعیسوی سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے اسے سومرہ دور کا سمجھنا چاہئے کیونکہ فنی لحاظ سے بھی سومرہ دور ھی کا معلوم ہوتا ہے.

اس روایت کے مطابق (۱) نصرت خان بکھر کے رضوی سادات سے بڑی عقیدت رکھتے تھے جو سید محمد مکی کی اولاد میں سے تھے. سید محمد مکی سنہ ۵۴۹ھ (۱۱۵۴ع) میں بکھر تشریف لائے اور ۵۵۰ھ (۱۱۵۵ع) میں رحلت فرما گئے. ان کا مزار ڈپٹی کمشنر سکھر کے دفتر کے قریب نشیب میں ہے. ان کے فرزند سید صدرالدین کا مزار بکھر میں ہے. التمش اور انکے امرا نے سید صاحب کی بڑی عزت کی اور اخراجات کیلئے ایک جاگیر بھی دیدی جس کے پروانے سلطان علاءالدین خلجی نے از سر نو بحال کئے. نصرت خان تو اسقدر عقیدتمند تھے کہ اپنی صاحبزادی کی شادی بھی سید صاحب کی اولاد میں سے ایک صاحبزادہ کے ساتھ کردی او جہیز میں روھڑی کے نواح میں ایک جاگیر

(۱) "سرے جا سر سوڑ" از شیخ محمد فاضل (غیر مطبوعہ).

دیدی . "اسیر واھن" نامی گاؤں اسی جاگیر کا ایک حصہ تھا .
نصرت خان علاءالدین کے بڑے مددگار تھے . سنہ ۱۳۲۷ع میں
سلطان نے انہیں گجرات اور راجپوتانہ کی مہم پر روانہ کیا . گجرات
جانے کیلئے سندھ سے گذرنا پڑتا تھا . خیال ھے کہ نصرت خان
گجرات جاتے ہوئے سندھ سے گذرے ہونگے اور بکھر کے رضوی
سادات سے اپنی مہم کی کامیابی کیلئے دعا کی استدعا کی ہوگی اور
اس کے بعد باقاعدہ عقیدتمندوں کے سلسلہ میں شامل ہوئے ہونگے.

ایک بار جاگیر کا مالیہ وصول کرنے پر نصرت خان کے نواسوں
اور انکے سوتیلے بھائیوں کے درمیان جھگڑا ہوگیا . نصرت خان کے
ایک نواسے نے اپنے سوتیلے بھائی کے ملازم کو قتل کردیا . اس
پر مقتول کے مالک نے اپنے قاتل بھائی کو کہلا بھیجا کہ :-

جي ڪنئہ تہ مٺين، جي وئين تہ واء، پنھی منجھان ھڪڙي، ھڪ نہ آيئہ ڪاء .	اگر تمنے قتل کیا ھے تو مصیبت میں پھنس گئے، اور اگر تم ختم ہوگئے تو یہ افسوسناک ھے۔ لیکن ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں ہوئی .

مذھبی تحریکیں اور گنان

اسی دور میں اسماعیلی مبلغین سندھ میں وارد ہوئے ، اور
اھل سندھ کو سندھی زبان میں اسلام کے عقائد و اصول سے آگاہ
کرنے لگے . سومرے چونکہ اسماعیلی تھے ، لہذا اسماعیلی مبلغین کو
تبلیغ کی سہولتیں مہیا کی گئیں .

(۱) سب سے اول اسماعیلی فرقہ کے اٹھارویں امام المستنصر باللہ
کے فرمان کے مطابق سید نورالدین سنہ ۴٦۲ھ (سنہ ۱۰۷۹ع) میں سندھ

میں آئے . وہ اپنے آپ کو "سید السادات" اور "ست گر نور" کہلانے لگے . انہوں نے مقامی زبانوں ہندی، گجراتی اور سندھی کو تبلیغ کا ذریعہ بنایا اور اپنے مسلک کا نام "ستھہ پنتھہ" رکھا . تبلیغ کے سلسلہ میں ہندی، گجراتی اور سندھی زبانوں میں ان کی طرف منسوب منظوم کلام ملا ہے جس میں سے سندھی کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

بن ڪلمي بندگي ڪري، تو بندگي سڃي سار ،	بغیر کلمہ کے (اسلام قبول کئے بغیر) عبادت بے فائدہ ہے .
جيون نت اٿ راه چلڻا ، آخر اجڙ واس (۱).	یہ زندگی فانی ہے اور آخر فنا ہے .

(۲) پیر شمس سبزواری

سید نورالدین کے بعد پیر شمس سبزواری ملتانی (سنہ ۵۶۰ھ / سنہ ۱۰۶۵ع — سنہ ۶۷۰ھ / سنہ ۱۱۷۶ع) یہاں آئے اور تبلیغ میں مشغول ہوگئے . انہوں نے اپنے طریقہ تبلیغ کو "شمس مت" کا نام دیا . وفات کے بعد ملتان میں مدفون ہوئے . ان کا منظوم کلام ملتانی اور سندھی زبانوں میں ملا ہے جو نمونتہً پیش کیا جاتا ہے :- (۲)

حق تون، پاڪ تون، بادشاہ، مهربان پڻ ياعلي تون ئي تون	تو حق ہے تو پاک ہے اور تو بادشاہ ہے تو مہربان بھی ہے، یاعلی تو ہی تو ہے
رب تون، رحمان تون ، ياعلي اول آخر قاضي تون ئي تون.	رب بھی تو ہے رحمان بھی تو ہے تو منصف بھی ہے یاعلی اول و آخر تو ہی تو ہے .

(۱، ۲) " سومرہ دور کی سندھی شاعری " مقالہ از خواجہ غلام علی الانا ، سہ ماہی مہران، ج ۹، نمبر ۲.

(۳) پیر صدرالدین

اس تبلیغی سلسلہ کو پیر شہاب الدین اور انکے فرزند پیر صدرالدین (۶۸۶ھ/۱۲۹۰ء - ۸۰۸ھ/۱۴۰۹ء) نے جاری رکھا. پیر صدالدین کا مزار اُچ کے قریب ہے. بڑے عالم و فاضل تھے. ہندو مذہب کا مطالعہ کرنے کے بعد برھمنوں سے بحث کی اور اسلامی تعلیمات کو مقامی زبانوں میں نئے رنگ ڈھنگ کے ساتھہ پیش کیا. لوھانے اور برھمن انکے ھاتھہ پر مسلمان ھوئے اور "خواجہ" کا خطاب حاصل کیا. پیر صاحب نے لاڑ (زیریں سندھ) میں "کوٹڑی اللہ رکھیو شاہ" میں اپنا مرکز قائم کیا. ان کی طرف منسوب منظوم کلام ھندی اور گجراتی کے علاوہ, سندھی زبان کے کچھی, لاڑی اور ملتانی محاوروں میں بھی موجود ھے. انہوں نے تبلیغی کلام کو "گنان" (گیان) کا نام دیا ھے.

فنی اعتبار سے گنان ترجیع بند کی ایک قسم ھے جو بظاھر ھے تو دوھے کی طرح, لیکن ھر بند کے آخر میں ایک ھی مصرعہ دھرایا جاتا ھے, اور پھر دوسرا بند بھی ٹیپ کے اس مصرعہ سے شروع ھوتا ھے. سندھی "وائی" کی ساخت بھی تقریبا ویسی ھی ھے, اس لئے خیال کیا جاتا ھے کہ وائی کیلئے گنان ھی نے زمین ھموار کی ھوگی.

گنان کا موضوع مذھبی اور اخلاقی تعلیم ھے, اور اس میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر ھے. کلام کو مقامی تشبیہات اور استعارات سے مزین کرکے موثر بنایا گیا ھے. سندھی کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ھے.

شاه جو مچيئڙو تن کــي
جيڪي صبوحڙي جــاڳــن
اٿي الله نہ گهرين بندا،
تــون ستــين سجـي رات
نــہ ڪا جهوري جيو جــي
ڀــاڻ ڀاڻڪــو ثمــر ســاٿ
شاه جــو مچيئڙو تن کــي
جــي صبوحــڙي جــاڳــن.
صبوحــڙي نــہ جــاڳــن،
تن کي حورون نہ ڏين هٿ
سي هاءِ هاءِ ڪندا هٿ هڻندا،
جيئن هاري وڃائي وٽ

ڪپاتيئڻ ڪتيــو، جڏهــن ستولوڪ
تني پانهنجو ڪتي وڏو، پچيءَ ڳاڙهو ٽوڪ،
شاه جو مچيئڙوتن کي، جي صبوحڙي جاڳن (١).

اللہ کی خوشنودی انہی کو حاصل ہوتی ہے جو صبح سویرے جاگتے ہیں. اے بندے! تو اٹھ کر اللہ اللہ نہیں کرتا اور رات بھر سویا رہتا ہے. اے بندے، تجھے اپنی کوئی فکر نہیں ہے اور ثمر بھی ساتھ نہیں ہے. اللہ کی خوشنودی انہی کو حاصل ہوتی ہے، جو صبح سویرے جاگتے ہیں. جو صبح کو نہیں جاگتے، حوریں ان سے ہاتھ نہیں ملاتیں. وہ ہائے ہائے کر کے ہاتھ ملینگے جیسے کسان موسم گذر جانے کے بعد کرتا ہے.

جب لوگ سو گئے تو کاتنے والیوں نے کاتنا شروع کیا، اور انہوں نے اس سے کپڑا بن کر پہن لیا،
اللہ کی خوشنودی انہی کو حاصل ہوتی ہے جو صبح سویرے جاگتے ہیں.

خواجڪي سنڌهي

پیر صدرالدین نے اپنے نو مسلم پیرو اسماعیلیوں کو دینی

(۱) "سومرہ دور کی سندھی شاعری" مقالہ از خواجہ غلام علی الانا، سہ ماہی مہران، ج ۹، نمبر ۲.

اصول و عقائد لکھکر دینے کیلئے ایک املا ایجاد کیا، جو چالیس حروف پر مشتمل ہے اور خواجہ قوم میں ابتک رائج ہے. اس املا کو "چالیس حرفی یا خواجکی سندھی" کہا جاتا ہے. بمبئی میں اس رسم الخط کا ایک چھاپہ خانہ بھی تھا جسے "سندھی پریس" کہا جاتا تھا. یہ ایک اصلاح یافتہ رسم الخط ہے کیونکہ اس میں ماتراؤں کا اضافہ بھی کیا ہوا ہے(۱).

گیچ

"گاہ" کے علاوہ قدیم سندھی شاعری کی دوسری قسم ہے "گیچ". گیچ لفظ بھی گاء سے بنا ہے، گاء کوھستان کی عورتوں میں آج تک مروج ہے. اسی لفظ کو بعد میں گاچ، گاج، گاچ یا گیچ کہا گیا. گیچ شادی بیاہ کے موقعوں پر عورتیں گاتی ہیں. آج کل اسے "سہرو" کہا جاتا ہے.

یہ اپنی قسم کی ایک سادہ سی شاعری ہے، جس میں خیال کی سادگی ہوتی ہے اور کوئی خاص فنی پابندی بھی نہیں ہوتی. کبھی اس میں قافیہ ہوتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا. محض فطری سادگی اور بے ساختگی ہوتی ہے، اور اسی وجہ سے اس میں لطافت، دلکشی اور روانی پائی جاتی ہے، اور اسقدر مٹھاس اور تاثیر، کہ براہ راست قلب و روح پر اثر انداز ہوتی ہے. سندھی گیچ سندھی ثقافت کے ترجمان ہیں. ان میں سندھ کے مخصوص رسم و رواج، روایات، ذہنی رجحان، فکر و خیال اور فطرت اور مزاج کا عکس نظر آتا ہے. ایسے متعدد گیچ موجود ہیں جن میں سومرہ دور کی

---

(۱) "سومرہ دور کی سندھی شاعری" مقالہ از خواجہ غلام علی الانا، سہ ماہی مہران، ج ۹، نمبر ۲.

ثقافت کے آثار پائے جاتے ھیں. اس لئیے کہا جا سکتا ھے کہ وہ گیچ اسی دور کے ھیں.

آس دور کے گیچوں کے سلسلہ میں "مائی مرکھاں" کا نام بہت مشہور ھے. اسنے اپنے پیر طریقت، پیر قرھیو بھانڈاری (وفات ۶۹۶ھ) کی تعریف میں کئی گیچ گائے. مائی مرکھاں کی وفات سنہ ۷۳۵ھ کے قریب ھوئی (۱).

جو گیچ مائی مرکھاں کے نام منسوب ھیں ان میں سے اکثر بعد کے معلوم ھوتے ھیں تاھم بعض گیچوں پر اصلیت کا گمان ھوتا ھے. نمونتہً ایک گیچ پیش کیا جاتا ھے:-

هيءُ ڪانڊيرڙي لس،
هيءُ واسرڙي وس،
آءٌ کلندي ڪڏندي اچان.
قرهيل ڏٺم سڪ پار ۾،
آءٌ کلندي ڪڏندي اچان.
ڀانڊاري ڏٺم سڪ پار ۾،
آءٌ کلندي ڪڏندي اچان.
هيءُ واسرڙي وس
هيءُ ڪانڊيرڙي لس.

یہ مرکنڈوں کی کثرت،
یہ برسات کی جھڑی،
میں ھنستی کودتی آؤں.
مینے قرھیل کو بہشت میں دیکھا،
میں ھنستی کودتی آؤں.
مینے بھانڈاری کو بہشت میں دیکھا،
میں ھنستی کودتی آؤں.
یہ برسات کی جھڑی،
یہ سرکنڈوں کی کثرت.

مائی مرکھاں کے گیچوں کے علاوہ محترم ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کی تصنیف "گیچ" میں اور بھی کئی ایسے گیچ درج ھیں، جن کی ساخت اور زبان گواھی دیتی ھے کہ وہ سومرہ دور کے ھیں. نمونتہً چند گیچ یہاں پیش کئے جاتے ھیں:-

---

(۱) "کلام مرکھاں شیخن" از شیخ محمد سومار، جیلانی پبلیکیشن، ۱۹۷۱، ص ۱۷.

سونڙي ڏانٽي مينڌي لٽايو،
روپڙي ٿالهيءَ هلي پسايو (۱)

سنہری درانتی سے کاٹو،
اور چلکر چاندی کے برتن میں بھگوؤ۔

گھڙبون پرڻ هلو، جرتي هلو،
سمو چام جهلو، سمو چام جهلو.

گھڑے بھرنے چلو، کنویں پر چلو
جام سمہ نگہبان ہے، جام سمہ نگہبان ہے۔

سعيو تيڙو سجايو،
هوت پنهور بہ آيو.

کوشش کامیاب ہوئی،
ہوت (پنھوں) بھنبھور میں آئے۔

سومرہ دور ہی سندھی شاعری کا بنیادی دور ٹھیرا، اور اسی دور میں سندھ کی رومانی داستانوں، رزمیہ واقعات، سخی سرداروں کے کارناموں پر جو طبع آزمائی کی گئی اور واقعاتی و محاکاتی ابیات کہے گئے، آگے چلکر انہی چیزوں نے سندھی شعر و ادب کے تاروپود کا کام دیا۔ اس دور میں صرف نثری داستانیں ہی رائج نہیں ہوئیں، بلکہ گاہوں کی صورت میں سندھی نظم (شاعری) کا بھی از سر نو آغاز ہوا۔

---

(۱) "گیچ" از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، سندھی ادبی بورڈ، ص ۱۲۰.

باب سوم

سمہ دور (۱۳۵۱ع - ۱۵۲۱ع)

سیاسی صورت حال

سومرہ دور ھی میں سندھ کے زیریں علاقہ میں سمہ قوم کے سربرآوردہ لوگوں کی سرداریاں قائم تھیں. صرف یہی نہیں، بلکہ اسلام کی آمد سے بھی پہلے وہ مختلف مقامات پر حکومت کرتے تھے. چچ نامہ سے معلوم ھوتا ھے کہ چچ کے عہد حکومت میں رائے سیوراج دیبل کے حاکم تھے. سومروں کے زوال کے دور میں سمے طاقت پکڑنے لگے. سومروں کے آخری حکمران ھمیر سومرو کو، جام آنڑ کی قیادت میں سموں نے سنہ ۷۵۰-۵۱ ھ (۱۳۵۱ع) میں شکست دیکر ٹھٹہ میں خودمختار حکومت قائم کی. سمہ قوم کے اٹھارہ حکمرانوں نے پونے دو سو برس تک سندھ پر حکومت کی. آخر سنہ ۹۲۶ ھ (۱۵۲۰ع) میں شاہ بیگ ارغون نے جام فیروز کو شکست دیکر ٹھٹہ کو فتح کیا اور سمہ قوم کی آزاد حکومت کا خاتمہ ھوا.

علمی ذوق

سموں کے عہد میں اسلامی علوم نے بڑی ترقی کی. مدرسے قائم ھوئے، اسلامی تعلیم کی ترقی اور فروغ کی جانب خاص توجہ دی گئی. ٹھٹہ میں شاندار مدرسے قائم ھوئے اور ٹھٹہ دنیائے اسلام میں اسلامی علوم کا بڑا مرکز بن گیا. ٹھٹہ کے علما کے علم و فضل کی شہرت سندھ کی حدود سے نکل کر ایران اور خراسان

تک پہنچ گئی. جام نظام الدین عرف جام وڈو ایک درویش صفت حکمراں تھے. انہوں نے علما، فضلا اور صوفیاء کی بڑی قدردانی کی. ان کے بھائی جام با یزید خود بڑے عالم و فاضل تھے. دونوں کی علم پروری کے باعث کئی علما ٹھٹہ میں آئے اور وہیں سکونت اختیار کی، جن میں سے مولانا فتح اللہ، مولانا عزیزاللہ، شیخ بہاءالدین قریشی، شیخ جمال الدین قریشی اور مولانا ابراھیم سے جید اور متبحر علمائے کرام کے اسمائے گرامی قابل ذکر ھیں. انکے علاوہ قاضی قاضن، سید مراد شیرازی اور سید علی شیرازی جیسے بزرگ اور درویش علما بھی ان ھی ایام میں ٹھٹہ میں قیام رکھتے تھے.

ٹھٹہ کے علاوہ سہون، بکھر، دربیلہ، ٹلٹی، بیرلوء، پاٹ، ھالا کندی، نصرپور، اگھامانی اور دیگر شہروں میں بھی اسلامی علوم کے بڑے مدرسے موجود تھے. ٹھٹہ کے بزرگ علما کے علاوہ ٹلٹی کے مخدوم بلال بھی بڑے عالم اور درویش کامل تھے. مخدوم بلال محب وطن تھے. جب ارغونوں نے سندھ پر قبضہ کیا تو انہوں نے غیر ملکی حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، جس سے ناراض ھوکر ارغونوں نے ان کو شہید کروادیا.

ھمسایہ ممالک کے ساتھ تعلقات

گجرات، کچھ اور کاٹھیاواڑ کے ساتھ قدیم زمانہ سے سندھ کے تعلقات استوار رھے ھیں. تاریخ سے معلوم ھوتا ھے کہ رائے خاندان کے عہد حکومت میں بعض سمہ قبائل سندھ سے کاٹھیاواڑ چلے گئے اور وھیں جاکر اپنا تسلط قائم کیا، اسی طرح عربوں کے سندھ فتح کرنے کے زمانے میں بھی لوھانہ قوم کے کئی لوگ

کچھ اور گجرات کی جانب منتقل ہوگئے. جس دور میں سندھ میں سمہ حکومت قائم تھی، اسی دور میں گجرات میں مظفریہ سلاطین برسر اقتدار تھے. اس زمانہ میں سندھ اور گجرات کے تعلقات میں اضافہ ہوا. دونوں حکومتوں کے درمیان سیاسی تعلقات کے علاوہ حکمرانوں میں رشتہ داریاں بھی قائم ہوئیں. سندھ کے سمہ حکمران جام جونہ اول نے اپنی دو لڑکیاں گجرات میں بیاھیں. ایک لڑکی ایک بزرگ عالم کے نکاح میں دی اور دوسری گجرات کے حکمراں محمد شاہ کے نکاح میں. محمد شاہ کے، اس بیوی سے جو فرزند ہوا، وہ "محمود بیگڑی" تھا جو گجرات کا نامور حکمراں گذرا ھے. گرنار کے حکمراں رائے ڈیاچ کے بزرگ بھی سندھی تھے. رائے ڈیاچ کے فرزند "نوگھن" کی منہہ بولی بہن "جاسل" کی شادی سندھ میں ہوئی تھی. ساموئی (سندھ) کے سمہ حکمراں نے کچھ کے چاوڑا خاندان میں سے شادی کی تھی.

کچھ، اور گجرات کی طرح راجستھان کے ساتھ بھی سندھ کے تعلقات رھے ھیں. سندھ کے سوڈھو رانو خاندان اور دیگر خاندانوں نے راجستھان کے راجاؤں اور سرداروں سے رشتہ داریاں کی ھیں.

لسبیلہ اور مکران کے ساتھ تعلقات

تاریخ سے پتہ چلتا ھے کہ لس بیلہ اور مکران بھی رائے خاندان کے راجہ سہارس کی قلمرو میں شامل تھے. چچ نے اپنے عہد حکومت میں سندھ کی سرحد کو کرمان تک بڑھایا. سمہ حکومت کے دور میں بھی سندھ کے اثرات ان علاقوں کی جانب بڑھے. موجودہ بلوچستان کے کچھی اور سبی کے علاقے سندھ کی حدود میں شامل تھے، اور مکران، جھالاوان اور جدگالی کی حکومتوں نے

سندھ کی سمہ حکومت کو تسلیم کیا تھا۔ نہ صرف یہ، بلکہ سندھ کے کئی باشندے نقل مکانی کر کے لس بیلہ اور مکران میں جا کر قیام پذیر ہوگئے۔ آج بھی کچھی، سبی اور بلوچستان کے دیگر کئی علاقوں میں سندھی بولی جاتی ہے۔

اس کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ منقبت سنہ ۱۵۴۸ (۱۴۹۱ع) میں سندھ کے سمہ حکمراں کی جانب سے اس قلعہ کا حاکم جام سومرو تھا جس نے اس سال مذکورہ قلعہ کی مرمت کروائی۔

ان حقائق کے علاوہ متعدد سندھیوں کی آمدو رفت بھی ملتان ہوتی رہتی تھی جو اسماعیلی داعی شمس سبزواری کے مرید اور معتقد تھے۔

سندھی زبان کی حدود

سمہ دور میں سندھی زبان، سندھ کی حدود پھلانگ کر دور دور تک پہنچی۔ جنوب مشرق میں کاٹھیاواڑ، ماناوادر، راجکوٹ اور جام نگر تک اس کے ثبوت ملتے ہیں، جن کی بنا پر ماہرین لسانیات کچھ اور کاٹھیاواڑ کی زبانوں کو سندھی زبان کے لب و لہجہ میں داخل کرینگے۔ اسی طرح مغرب اور شمال مغرب میں سندھی زبان بلوچستان کے قلات، سبی، کچھی اور بھاگ ناڑی علاقوں تک پھیل گئی۔ جنوب مغرب میں لس بیلہ، مکران اور پسنی تک رائج ہوئی۔ لس بیلہ کی زبان "لاسی" سندھی زبان ہی کا ایک محاورہ ہے، اور شمال میں بہاولپور اور ملتان تک پہنچ گئی۔

اس پھیلاؤ اور وسعت کی وجہ سے سرائکی، بلوچی اور گجراتی زبانوں پر سندھی زبان کا کسی حد تک اثر پڑا، اور ان زبانوں کا کچھ اثر ان علاقوں کے سندھی لب و لہجوں پر ہوا۔ ان اثرات

کے نتیجہ میں مکران میں جدگالی، لس بیلہ میں لاسی، کاٹھیاواڑ میں کاٹھیاواڑی اور کچھہ میں کچھی محاورے وجود میں آئے. تھر اور لاڑ کے محاوروں پر گجراتی زبان کا اثر ظاہر ہے، اور شمالی علاقہ کی زبان پر سرائکی کا اثر واضح ہے.

فارسی زبان کا رواج

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ فارسی زبان نے سندھ میں سومرہ دور میں اپنے قدم جمائے تھے. اسی دور میں دفتری کاروبار عربی کے بجائے فارسی میں ہونے لگا تھا. اس لئے فارسی زبان کا رواج بڑھا اور فارسی میں تصنیف و تالیف کا آغاز ہوا. اس دور کے بعض فارسی گو سندھی شعرا کے نام بھی ملے ہیں. مثلاً جام جونو، شیخ حماد جمالی، شیخ عیسیٰ لنگوٹی، شیخ جھنڈو پاتنی، جام ندو اور مخدوم بلال وغیرہم.

اس دور کا ایک فارسی کتبہ بھی ملا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی تعلیمی اور دفتری زبان تھی. یہ کتبہ شیخ حاجی ابو تراب (متوفی سنہ ۱۷۸ھ / سنہ ۷۸۲ع) کے مزار پر لگا ہوا ہے جو جام جونہ الملقب بہ سلطان فیروز شاہ نے اپنے دور حکومت (سنہ ۷۷۷ھ / ۱۳۷۵ع — سنہ ۷۹۰ھ / ۱۳۸۸ع) میں لگوایا تھا. یہ مقبرہ ضلع ٹھٹہ میں ہے اور کتبہ حسب ذیل ہے:-

بعہد شہر یار دھر و سلطان، داور دوران
شہہ فیروز منصور و مظفر در صف میدان
بہ امر سر فراز سند و خاص حضرت عالی
کہ پائے قدر او اعلیٰ ز فر فرقہ تابان (۱)

---

(۱) "سندھی زبان کی تاریخ"، ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، ص ۸۷.

سندھی ابیات

مختلف روایات کے ذریعہ سمہ دور کے کچھہ ابیات موصول ہوئے ہیں . اس دور کے تمام ابیات ہیئت کے لحاظ سے ہندو دوھوں سے مطابقت رکھتے ہیں اور زیادہ تر دو مصرعوں پر مشتمل ہیں . ذیل میں ان روایات اور ابیات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے .

ساموئي فقرا اور ان کے ابیات

"ساموئی فقرا"، "ھفت تن" کے نام سے بھی مشہور ہیں . یہ سمہ دور کے ابتدائی ایام سے تعلق رکھتے ہیں . ایک روایت کے مطابق یہ فقرا جام نظام الدین کے عہد میں تھے، اور دوسری روایت کے مطابق جام تماچی کے عہد میں . سندھی کے سات ابیات ان درویشوں سے منسوب ہیں جنہیں "مانوبوں کے ابیات" یا "ساموئی کے سات ابیات" کہا جاتا ہے .

بیان کیا جاتا ہے کہ یہ سات میلانی درویش سیر و سفر کرتے ہوئے دارالحکومت میں آنکلے . سمہ حکمران نے جب ان کی عجیب و غریب باتیں سنیں تو انہیں خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں مجھہ سے حکومت نہ چھین لیں . اس لئے ان کے قتل کا حکم دیدیا . مرتے وقت ہر درویش نے ایک ایک بیت کہا، جن میں پیشینگوئیاں کی گئی ہیں . ابیات حسب ذیل ہیں :-

(۱)	(۱)
هاڪ وهندو هاڪڙو، پچندي بند اروڙ،	ہاکڑو پھر سے خوب بہنے لگے گا، اروڑ کا بند ٹوٹ جائیگا
ٻهہ مڇي ۽ لوڙهہ، سمي ويندي سوکڙي.	بھسے، مچھلی اور لوڑھہ سمہ کے پاس تحفتاً بھیجے جائینگے.

(۲)

وسي وسي آر، جڏهن وڃي ڦٽندو،
تڏهن ٻارو ڇاڙو ٻار پنجين درمين وڪبو.

دریائے ھاکڑہ سے سیراب ہونے والا علاقہ شادابی کے بعد جب غیرآباد ہوگا تو بلوچوں کے بچے پانچ پانچ درموں میں بکینگے.

(۳)

ڪاري ڪا ٻاري جهيڙو لڳندو ڇهه پهر،
مر مڇي ماري، سک وسندي سنڌڙي.

معاہدہ ٹوٹ جانے پر چھ پہر تک جنگ ہوگی اور پھر دشمنوں کو ہلاک کرنے کے بعد سندھ خوش حال ہوجائیگی .

(۴)

مر مڇي ماري، مر مڇيءَ کهڙا ٻار،
هيٺ ڪاريون پوتيون، مٿن ڪارا وار.

ہلاک ہونے والے دشمنوں کی نشانیاں یہ ہونگی، جسم پر سیاہ لباس اور سر پر لمبے سیاہ بال .

(۵)

لڳندي لاڙان، سونڪو ٿيندو سري ۾،
جڏهن ڪڏهن سنڌڙي اوڳاڙا وٺاه (قنڌاران جو ڪو).

عداوت کی بنیاد زیریں سندھ میں رکھی جائیگی اور اس کا اثر شمالی سندھ پر پڑیگا اور اسکے نتیجہ میں قندھار کی طرف سے سندھ پر حملہ کی راہ ہموار ہوگی.

(٦)

نيرا گھوڙا ڏبرا اتر کان ايندا،
گھا گھيريون گسن تي ورهائي
ويندا.
(تهان پوءِ تيندا طبل
تاجائين جا)

(٦)

نیلے اور دبلے گھوڑے شمال سے آئینگے. اسکے بعد گھگھا (بلوچی فراک) پہننے والی عورتیں گذرگاھوں پر نظر آنے لگینگی. اور پھر تاجانی قوم کو فتح حاصل ھوگی.

(٧)

اچي ويجها ماڙ هٺا، ننگر
جي آدار،
پراڻا پراڙ، نوان م اڏجانجهرا.

(٧)

بیرونی لوگ ٹھٹہ پر یلغار کرینگے. تم لوگ پراڑ (دریا) کے اس پار نئے گھر نہیں بنانا.

مرحوم و مغفور ڈاکٹر داؤد پوتہ نے لکھا ھے کہ:-

برٹن خواہ ھیگ کو ان ابیات میں سے اکثر کی صحت میں شبہہ ھے. لیکن اسکے باوجود یہ اقرار کرنا پڑتا ھے کہ پہلی، دوسری اور ساتویں پیشینگوئی صحیح ھے، اور ان میں سمہ حکومت کے زوال (١٥٢٣ع) کی جانب اشارہ ھے (١).

محترم ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ (سندھی زبان کی مختصر تاریخ، ص ١٠٠) کا کہنا ھے کہ یہ ابیات پیشینگوئیوں پر مشتمل نہیں ھیں، بلکہ نیم تاریخی اور روایتی حیثیت کے حامل ھیں. سموں کے عروج کے دور میں، سومروں کے حامیوں اور خیوخواھوں کی جانب سے گذشتہ دور کی واپسی کی تمنائیں ھیں. ڈاکٹر صاحب کا خیال ھے (ص ٩٦) کہ ان میں سے اکثر ابیات بعد کے ھیں. ان کے خیال میں (ص ٩٦) پہلا اور ساتواں بیت سومروں کے زوال

(١) "سندھی شعرا اور ان کے اشعار" از علامہ ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ، ص ٦٠٥.

اور سموں کے عروج کے زمانہ کے ھیں. بلوچ صاحب نے ساتواں بیت اس طرح لکھا ھے :-

نینگر جي آذار، جم ویجھا ساڑھنا، پراڻا پرار، نوان اڏ جانجھرا.	جب غیر لوگ ٹھٹہ کے قریب آجائیں تو تم لوگ پران دریا کے اس پار جاکر بس جانا .

پہلے بیت میں ھاکڑو کے پھر سے بہنے اور اروڑ کا بند ٹوٹنے کی تمنا کا اظہار ھے. ھاکڑہ ایک قدیم دریا تھا، جو دریائے سندھ سے الگ تھا اور بہاولپور کا ریگستانی علاقہ اور سندھ کا تھر آباد تھا . اروڑ سے بھی یہی دریا گذرتا تھا . بعد میں خشک ھو گیا . اس میں پانی کی مقدار جب کم ھوئی تو اروڑ کے حکمراں نے اس پر بند بندھوا کر پانی کو اوپر روکدیا . اس لئے نیچے کی جانب یعنی سمہ سرداروں کے پاس پانی نہیں پہنچتا تھا .

پہلے بیت میں کہا گیا ھے کہ ھاکڑو دوبارہ بہنے لگے گا اور اروڑ کا بند ٹوٹ جائیگا . یعنی سمے حکمراں اپنے طاقت کے بل پر اروڑ کا بند توڑ کر اور ھاکڑو کو نیچے کی جانب بہا کر اپنے علاقہ کو سرسبز و شاداب کرینگے . آخری بیت میں بھی یہی بتایا گیا ھے کہ نگرپارکر کا علاقہ سرسبز ھونے والا ھے.

بہاولپور میں "مروٹ" کا قدیم قلعہ ھاکڑہ کے کنارہ پر ھے. اس قلعہ کے قریب سے سرائکی زبان کے دو ابیات ملے ھیں جو زمانہ قدیم سے مروج ھیں (١) :-

(١) "تاریخ قلعہ مروٹ" از مولانا عزیزالرحمن، ص ١٥، ١٦.

هکڑا واهن بهی وهسے، ندیان وهسن پور	ھاکڑہ پھر جاری ہوگا اور ندیاں بھی بھرپور ہو کر بہنے
نہ جایا، نہ جمسے سوڈھا راؤ امیر	لگینگی سوڈھو راؤ امیر جیسا حکمراں نہ پیدا ہوا ہے نہ ہوگا.
هکڑا پهیر بهی وهسے، ندیان وهسن سیر	ھاکڑہ پھر سے بہنے لگے گا اور ندیاں بھی خوب بہینگی
نہ جایا، نہ جمسے سوڈھا راؤ امیر	سوڈھو راؤ امیر جیسا حکمراں نہ پیدا ہوا ہے نہ ہوگا.

یہ ابیات بھی سمہ دور کے معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ "سوڈھو رائے" سموں کے عہد حکومت میں قلعہ مروٹ کے حاکم تھے.

سمہ حکمرانوں کے متعلق ابیات

سمہ سرداروں نے پیشہ ور مدح گو بھٹوں اور بھانڈوں کو گرانقدر صلے دیئے جنہوں نے ان کی داد و دہش کی ہر جگہہ پر تعریف کی. سخا ھی کی وجہہ سے "دس ڈاتار" مشہور ہوئے، جن کا ذکر سومرہ دور کی شاعری کے سلسلہ میں ہو چکا ہے، کیونکہ یہ سمہ سردار سومرہ دور ھی میں گذرے ھیں . شجاعت کے سلسلے میں جام ابڑو، جام ہونئرو ، کارائڑی سمہ اور بڈامانی پہرو جیسے سمہ سرداروں کی بڑی ستائش کی گئی .

عشقیہ داستانیں

ازانسوائے سموں کی محبت کی داستانیں بھی شعرو سخن کا موضوع بنیں اور خوب پھیلیں . مثلاً جام لاکھو اور مہرانی، جام لاکھو اور اوڈنی، جام آڈھو اور ہوتھل پری، جام جراڑ اور بوبنا، نوری اور جام تماچی، دولہہ دریا خان اور ھموں وغیرہ . ان میں

سے نوری جام تماچی کو بڑی شہرت اور اہمیت حاصل ہوئی کیونکہ شاہ لطیف نے تمثیل کے طور پر اسے اپنے کلام میں پیش کیا اور پھر یہ رومانی داستان بھی دیگر داستانوں کے ساتھ سندھی شاعری کی تمثیلی کہانی بن گئی۔ جام تماچی بن جام انڑ نے بہلی بار سنہ ٧٦٨ھ (١٣٦٦ع) سے سنہ ٧٧٧ھ (١٣٧٥ع) تک حکومت کی۔ اس کے بعد جام جونہ نے ان کو نظر بند کر کے دھلی بھیجا۔ سلطان فیروز شاہ کی وفات کے بعد وہ دھلی سے واپس آئے اور سنہ ٧٩٠ھ یا سنہ ٧٩١ھ (سنہ ١٣٨٨ع سے سنہ ١٣٩٣ع) تک حکومت کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نوری جام تماچی کی داستان چودھویں صدی عیسوی کی ہے۔

جام لاکھو اور جام اڈھو سومرہ دور میں گذرے ہیں۔ ان کی رومانی داستانیں "جام لاکھو اور مہر رانی" اور "جام اڈھو اور ھوتھل پری" بھی اسی زمانہ سے مشہور تھیں لیکن سموں کے عہد حکومت میں انکو بڑی شہرت اور اھمیت حاصل ہوئی۔ ذیل میں جام اڈھو اور ھوتھل پری کی داستان سے چند گاھیں پیش کی جاتی ھیں جو محترم ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ (سندھی زبان کی مختصر تاریخ، ص ٩٣) کے خیال میں اپنی ساخت کے اعتبار سے غالباً سمہ دور سے تعلق رکھتی ہیں۔

جام اڈھو پرگنہ ککرالہ (تحصیل شاہ بندر، ضلع ٹھٹہ) کے حاکم جام موہر کے چھوٹے بھائی تھے۔ جام اڈھو پر ان کی بھاوج عاشق ھوگئیں، اس لئے جام اڈھو ترک وطن کر کے کچھ کو چلے گئے۔ اس موقعہ پر شاعر نے ان کی بھاوج کے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے کہا ہے:-

آترسيگهون ڪيڏيون، ڏونگر ڏهريا هينڙو ڦٿڪي مڇيءَ جيئن ساجن سنڀريا .	میرے محبوب کو شمال علاقہ نے کشش کی ہے اور وہ پہاڑ طے کرنے والے ہیں اس لئے میرا دل مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہے.

کچھ میں جام اڈھو کو ہوتھل پری کے ساتھ محبت ہو گئی اور آخر دونوں کی شادی ہوئی. ہوتھل پری کی زبانی ان کی محبت کا اظہار اس طرح کیا گیا ہے:-

آڏا تو سين آر، ڪر وسرين نہ سپ ڄمار، ٿل ٿر ٻاٻيهي ٿي مران .	میرے محبوب اڈھے! میرا عشق تمہارے ساتھ ہے. میری تمنا ہے کہ میں تمہیں زندگی بھر نہ بھلا سکوں اور "تھر" کے مشہور پرندہ بابیہے کی طرح تمہارے عشق میں تڑپ تڑپ کر جان دیدوں.

وساريان نہ وسرن، وسرن نہ ميٺ، جي نہ ٿمن نيڻ، ٿر ٻاٻيهي ٿي مران.	میں بھلانے کی کوشش کرتی ہوں لیکن وہ بھلائے نہیں جاتے، کہیں محبوب بھی بھلائے جاسکتے ہیں، اگر آنکھیں نہ برسیں تو بابیہے کی طرح تڑپ تڑپ کر جان دیدوں .

کاٽي ڪاٺ ڪينئون، جيئن سِرو سانگهيڙون ڪري،
منهنجو تيئن هينون، اچ اڍي ڪاڏئو

جیسے دیمک لکڑی کو چاٹتی ہے اور کیڑا اس کے اندر سوراخ کر دیتا ہے، اسی طرح اڈھو کے عشق نے میرے دل کو کھالیا ہے۔

مذہبی تحریکیں

سومرہ دور کے ذکر میں اسماعیلی تحریک اور اس کے داعیوں کے کلام کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ سمہ دور میں بھی یہ تحریک جاری رہی۔ پیر صدرالدین نے اپنی زندگی کے آخری ایام سمہ دور میں گذارے۔ ان کے فرزند آچ، ملتان، ڈھنڈی، ٹھار، بدین، کچھ، اور گجرات میں تبلیغ پر مامور ہوئے۔ پیر صدرالدین کی طرح ان کے فرزند پیر حسن کبیرالدین، پیر امام شاہ اور پیر تاج الدین سے منسوب کلام بھی ملتانی، سندھی، کچھی اور گجراتی زبانوں میں ہے۔ مثال کے طور پر حسن کبیرالدین (ولادت سنہ ۷۴۲ھ — وفات سنہ ۸۵۳ھ) کے کلام میں سے دو بند پیش کئے جاتے ہیں:-

(۱)

آشا جي شري اسلام شاه تخيچ بيٺها
تاري ڏين هوالرحمان جي،
سر بنده لئي مٿڪي ڏيدها،
تارے سرا گهاڙو ڪرنر بيٺها (۱)

جب سے حضرت اسلام شاہ تخت نشین ہوئے ہیں، اس وقت سے خدا کے دین کا فیض جاری ہوا ہے۔ جب (پیر حسن کبیرالدین نے) امام (اسلام شاہ) کو دستار نذر کی، تو اسلام شاہ تخت پر ننگے سر بیٹھے ہوئے تھے۔

---

(۱) "سومرہ دور کی سندھی شاعری"، مقالہ از خواجہ غلام علی الانا، سہ ماہی مہران، ج ۳۔

(۳)

ناریون تمھاریون انتیون گھنیون	تمہاری کنیزیں بہت ہیں اور
منجھ سریکھیون لا کھوئي لاکھ	مجھ جیسی تو لاکھوں ہیں.
تمھـن ھے الـکھـہ نرنجـن	تو دیکھنے سے پاک ہے، اور
ھم چھٹیٹی دھرڑ خاک (۱)	میں محض خاک ہوں.

پہلے بند میں "سر آگھاڑو" والا محاورہ سندھی ہے اور دوسرے میں "گھٹیون" اور "منجھ" بھی سندھی زبان کے الفاظ ہیں. دوسرے بند کے پہلے دو مصرعوں والا مضمون حضرت شاہ لطیف نے اس طرح بیان فرمایا ہے:-

تو وَرَ وھون کیتریون، مـون	تمہاری دلہنیں بہت ہیں، لیکن
وَرُ تون ئي تون	میرا دولہا فقط توہی تو ہے.

اسی دور میں سید میران محمد جونپوری سندھ میں وارد ہوئے اور ان کے ساتھ مہدوی تحریک بھی سندھ میں داخل ہوئی. متعدد علما و فضلا اس تحریک سے وابستہ ہوئے جن میں سے قاضی قاضن، قاضی شیخ محمد اچی جعفری اور ابوبکر بکھری کے اسما قابل ذکر ہیں، اکثر علما نے اس تحریک کی مخالفت کی اور اس لئے سید میران محمد سندھ سے واپس چلے گئے، اور ان کے جاتے ہی تحریک کی اشاعت بھی رک گئی. سندھی زبان کے قدیم شاعر قاضی قاضن، جو اس تحریک سے وابستہ تھے، ان کا ذکر آگے آئے گا.

جنگي رجز

ہندوستان کے حکمران سلطان محمد تغلق نے سندھ پر حملہ

---

(۱) "سومرہ دور کی سندھی شاعری"، مقالہ از خواجہ غلام علی الانا، سہ ماہی مہران، ج ۳.

کیا لیکن سنہ ۸۵۲ھ (۱۳۵۱ء) میں ٹھٹہ میں وفات پا گئے. ان کے بعد سلطان فیروز شاہ نے سنہ ۱۳۶۵ء میں ٹھٹہ پر حملہ کیا. ان کی فوج میں وبا پھوٹ پڑی اور رسد بھی کم ہو گئی. اس لئے گجرات کو چلے گئے. ان دونوں واقعات کے بعد اہل سندھ میں یہ فقرہ مروج ہو گیا جسے رجز یا جنگی نعرہ کہا جا سکتا ہے :-

بہ برکت شیخ پٹھو، ھک مئو ھک ٹٹو

(یعنی شیخ پٹھہ کی برکت سے ایک مر گیا اور دوسرا بدک گیا).

مذکورہ بالا الفاظ میں یہ نعرہ محترم ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کا پیش کردہ ہے (سندھی زبان کی مختصر تاریخ، ص ۱۰۳) جو سندھی زبان کے مزاج کے مطابق درست معلوم ہوتا ہے. تاریخ فیروزشاھی (کلکتہ سنہ ۱۸۹۰ء، ص ۲۳۱) نے بھی اس نعرہ کو تقریباً انھی الفاظ میں پیش کیا ہے :-

بہ برکت شیخ پتھہ اک مؤا، اک تتھا

دعائیہ فقرہ

سید حسین عرف شاہ مراد بن سید علی شیرازی اول، ٹھٹہ کے شیرازی سادات میں سے ایک بہت ھی بڑے عالم، عارف اور صوفی بزرگ گذرے ھیں. انکی ولادت سنہ ۸۳۱ھ میں ھوئی اور وفات جام ننڈو کے عہد حکومت میں. سنہ ۸۶۱ھ (۱۴۸۶ء) میں ان کے بھتیجے اور داماد کے گھر میں فرزند متولد ھوا، جس کا نام سید علی ثانی رکھا گیا. ان کی ولادت سے خوش ھو کر شاہ مراد نے فرمایا.

"او پاتھي! ڏيئي وڏي ڄمارا"

(یعنی اے ھمارے خاندان کے فرد! تجھے اللہ بڑی عمر عطا فرمائے).

یہ پہلا منظوم دعائیہ فقرہ ہے جس میں الف اشباع لفظ "جمارا" میں بطور حرف قافیہ کے استعمال کیا گیا ہے. اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی الف اشباع کے قافیہ والی نظم کہنے کا رواج تھا.

یہ روایت اور یہ فقرہ "معارف الانوار" (فارسی) میں موجود ہے جو سنہ ۱۱۴۰ھ میں ملا زکریا ٹھٹوی نے تصنیف کی.

عبدالجلیل چوھڑ شاہ کی مجلس میں سندھی ابیات

حضرت شیخ الشیوخ عبدالجلیل عرف "شیخ چوھڑ" نویں صدی ھجری میں "لسوکت مبارک" ضلع رحیم یار خان میں ایک بہت بڑے درویش گذرے ھیں. سلطان بہلول لودھی (۱۴۵۱ء/۱۴۸۹ء) کے داماد تھے. سندھ کے اکثر باشندے ان کے مرید اور معتقد تھے. تذکرہ قطبیہ" (۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ چوھڑ کی محفل سماع میں ایک سندھی بیت پڑھا گیا، اور دو بیت انکی وفات کے بعد ان کے مزار پر منعقدہ محفل میں پڑھے گئے. جو بیت شیخ چوھڑ کی محفل سماع میں پڑھا گیا تھا وہ درج ذیل ہے:-

جو گھڙي، سونٿي، ڪو جوڦهر ڪلاچ م، خبر ڪونه ڏاڍي رڃ ڪجاڙي رنديو.	جو سمندر میں کودیگا، سمندر اس کو نگل جائیگا. کلاچ (کراچی) کے گرداب میں شاید کوئی قہرو غضب ہے. پتہ نہیں جال کیوں اٹکا ہوا ہے.

(۱) یہ کتاب جمال الدین ابوبکر الہ آبادی نے سنہ ۱۵۱۰ع اور سنہ ۱۵۴۵ع کے درمیان تصنیف کی اور سنہ ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۱ع) میں طبع ہوئی. یہ تینوں بیت فارسی صورتخطی میں تھے جو ڈاکٹر بلوچ کی تحقیق کا نتیجہ ھیں (سندھی زبان کی مختصر تاریخ).

حسب ذیل دو ابیات شیخ چوھڑ کی وفات کے بعد ان کے مزار پر منعقدہ محفل سماع میں ایک سندھی ذاکر نے پڑھے۔ تذکرہ قطبیہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ ذاکر نے یہ ابیات حسینی مقام کی دھن میں گائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ابیات "سر حسینی" میں ہیں :-

چران تہ چڪن چاڪ، وهان(تہ) وهہ سنجهري	ہلوں تو زخم رسنے لگیں اور بیٹھوں تو زہر پیدا ہو۔
هاء سنهنجي ڏيل مين سورن ڪئي اوطاق، جيئين تون جانان پاڪ، آسا ٻند اڙين جو	ہائے! میرے جسم میں درد نے بیٹھک بنالی ہے، اے میرے پاک محبوب! تم زندہ رہو، تم محتاجوں کی امیدوں کے مرکز ہو۔

من ڪي لوچ فراق، اسان هون نہ ڌار ٿئي، ڪون پريان ساڪ، رب ڏڪائي ڪڏهين.	فراق سے دل میں جو تڑپ ہے، وہ دل سے نہ نکلے، میں محبوب کے دیدار کا مشتاق ہوں۔ دیکھیں خدا کب دیدار نصیب کرتا ہے۔

مذکورہ بالا تین ابیات میں سے پہلا بیت شیخ چوھڑ کی موجودگی میں پڑھا گیا، جنہوں نے سنہ ۹۱۰ھ (۱۵۴۴-۵ء) میں انتقال کیا۔ یعنی یہ بیت سولھوی صدی عیسوی کا یا اس سے پہلے کا ہے۔ آخری دو ابیات سنہ ۱۵۴۰ء سے قبل کے ہیں کیونکہ تذکرہ قطبیہ سنہ ۱۵۴۰ء میں تصنیف کیا گیا۔ یعنی یہ دونوں ابیات بھی سولھویں صدی کے ہیں۔ آخری دو ابیات میں سے پہلا بیت تین مصرعوں کا ہے۔ یعنی تین مصرعوں والے بیت کا رواج یقینی طور پر سمہ دور میں موجود تھا۔

مخدوم احمد بھٹی اور سندھی بیت

مخدوم احمد بھٹی بن اسحاق، ھالا کنڈی کے ایک درویش بزرگ گذرے ھیں. شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانی کے خاندان کے مرید تھے. ھمیشہ گوشہ نشین رھتے تھے. ذکر اور سماع کی محفلوں میں ان پر حال طاری ھوجاتا تھا. آخری ایام میں نیرن کوٹ (حیدرآباد) میں قیام پذیر ھوئے. ایک بار نیرن کوٹ میں جبکہ ایک محفل سماع میں تشریف رکھتے تھے، ایک منار کے لڑکے نے ایک سندھی بیت ایسے سوز و گداز کے ساتھ، پڑھا کہ سنتے ھی مخدوم صاحب کا وصال ھوگیا. یہ واقعہ سنہ ۹۳۲ھ (۱۵۲۹ع) کا ھے (۱). ان کا جنازہ نیرن کوٹ سے ھالا کنڈی لے جا کر دفن کیا گیا.

ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ کو یہ بیت ھالا میں مخدوم صاحب کے پسماندگان سے ملا (۲) جو درج ذیل ھے:-

سڈ سُڻي پرينءَ جو وانگي جي نہ ورن، ڪوڙي دعوىٰ دوست جي ڪچازي ڪي ڪن.	جو عاشق محبوب کی آواز سن کر پیچھے کو نہیں لوٹتے وہ دوستی کا جھوٹا دعوىٰ کیوں کرتے ھیں.

مخدوم صاحب کے وصال پر اس منار کے لڑکے نے حسب ذیل بیت پڑھا :-

سر ڏيئي سٽ جوڙ، ڪنهن پر ڪلالن سين، مرڻا منهن نہ موڙ، اڄ وڏي ٿي وڏ لهي.	جان دیکر ساقی کی ھمدردیاں حاصل کرلے، موت سے رو گردانی نہ کر، آج شراب کا پیالہ بڑا قیمتی ھے.

(۱) "تذکرہ لطفی" حصہ اول، طبع سوم، از لطف اللہ بدوی، سنہ ۱۹۶۳ع، ص ۱۳۰.

(۲) "سندھی شعرا اور ان کے اشعار" از علامہ داؤد پوتہ، ص ۸.

مذکورہ بالا دو ابیات سنہ ۱۵۲۹ع میں کہے گئے یعنی سمہ حکومت کے خاتمہ (سنہ ۱۵۲۰ع) کے نو سال بعد. اس لئے ہو سکتا ہے کہ یہ ابیات سمہ دور کے کسی شاعر کے ہوں. سمہ دور کے جن شعرا کا حال معلوم ہوا ہے ان کا ذکر درج ذیل ہے. ان میں سے بعض وہ ہیں جنہوں نے سمہ دور کے خاتمہ کے بعد انتقال کیا لیکن وہ سمہ دور کے آخری ایام میں چونکہ زندہ تھے، اس لئے ان کو بھی سمہ دور ہی کا شاعر کہا جا سکتا ہے.

شیخ حماد جمالی

شیخ حماد بن رشید الدین جمالی سندھ کے بہت بڑے بزرگ اور عارف کامل تھے. اچ کے مشہور درویش شیخ جمال (وفات سنہ ۷۰۰ھ) کے نواسے تھے. ٹھٹہ کے قریب ساموئی میں ان کی خانقاہ تھی. جام تماچی اور ان کے فرزند صلاح الدین ان سے بڑی عقیدت رکھتے اور روزانہ صبح کو ان کی خدمت میں حاضری دیتے تھے. سنہ ۱۳۷۵ع میں جام جونہ کی سازش سے جام تماچی قید ہو کر دھلی پہنچے، اور جام جونہ علاءالدین کے خطاب سے سندھ کے بادشاہ بنگئے.

جب جام تماچی اور ان کے فرزند کئی روز تک درویش کی خانقاہ سے غیر حاضر رہے تو درویش نے ان کی حویلی سے تحقیقات کروائی. جہاں سے تمام حقیقت حال ان کے گوش گذار ہوئی. ایک روایت یہ بھی ہے کہ جام تماچی کی والدہ ماجدہ روزانہ علی الصبح درویش کی خانقاہ پر جاروب کشی کے لئے حاضر ہوتی تھیں. ایک روز بڑھیا پر درویش کی نظر پڑ گئی اور ان سے انکے بیٹے اور پوتے کے متعلق پوچھا. بڑھیا نے روتے ہوئے تمام ماجرا

عرض خدمت کردیا ۔ درویش کو جوش آگیا اور جذب و سرمستی کی کیفیت میں چند سندھی ابیات ان کی زبان سے نکلے جن میں جام تماچی کے متعلق اپنے وطن کو واپس آنے اور سریر آرائے سلطنت ہونے کی دعا کی گئی تھی۔

یہ حال "حدیقۃ الاولیا" (فارسی) میں درج ہے جو ٹھٹہ کے ایک عالم سید عبدالقادر حسینی نے سنہ ۱۰۱۶ھ میں تصنیف کیا۔ البتہ اس میں وہ ابیات درج نہیں ہیں جو درویش نے اس موقعہ پر کہے تھے لیکن ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کو مذکورہ کتاب کے حاشیہ پر لکھا ہوا ایک بیت ملا ہے جو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ بلوچ صاحب نے اس بیت کی تحریر کا عکس بھی پیش کیا ہے جسکے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس بیت کی تحریر موجودہ مروجہ سندھی رسم الخط متعین کرنے کے بعد کی ہے۔ کیونکہ "ی" کے نیچے نقطے دیئے گئے ہیں اور "ٹ" بھی موجودہ سندھی املا کے مطابق لکھی گئی ہے:-

جوٹو مت اوٹو، جام تماچي آءِ، سپاجهي ٻاجهہ پيئي، توسين ٺٽوراءِ (۱)	جو نہ کی مت ماری گئی، اے جام تماچی تم آجاؤ، رحم کرنے والے (اللہ) کو رحم آگیا ہے، ٹھٹہ تم سے آباد ہوگا۔

خدا کی قدرت سے اسی رات دونوں باپ بیٹوں کی رہائی ہوئی اور اپنے وطن واپس آکر حکومت پر فائز ہوئے۔

نوح ھوتھیاڻي

انھی ایام میں ایک بزرگ درویش نوح ھوتھیانی بھی تھے جو

---

(۱) "سندھی زبان کی مختصر تاریخ" از ڈاکٹر بلوچ، ص ۱۰۳۔

ھالا کے قریب کھیبروں گاؤں میں رھتے تھے. حدیقۃ الاولیا اور تحفۃ الکرام میں درج ھے کہ جام تماچی اور ان کے فرزند صلاح الدین دھلی سے واپسی پر درویش نوح سے ملاقی ھوئے، جنھوں نے ان کو بتایا کہ "تین روز سے جام تماچی کے نام کی نوبت بج رھی ھے". یہ سنکر جام تماچی بڑے خوش ھوئے اور درویش کو اپنے حال زار سے آگاہ کیا. درویش نے ان کو دعا دی اور فرمایا کہ "آپکو فتح حاصل ھوگی". درویش کی زبان سے جو دعائیہ فقرہ نکلا، وہ ڈاکٹر بلوچ کو مذکورہ نسخہ کے حاشیہ پر ملا ھے جو اس طرح ھے:-

جوڻو وڃيو جهوري ماريو،
جام تماچي شهرين چاڙهيو.

جاؤ، جام جونہ کا کام تمام کرو، اور جام تماچی کو بادشاہ بنادو.

تاریخ بتاتی ھے کہ جام تماچی سلطان فیروز شاہ کے انتقال کے بعد سنہ ۱۳۸۸ع میں دھلی سے سندھ میں واپس آئے، یعنی مذکورہ بیت اور فقرے سنہ ۱۳۸۸ع کے ھیں.

اسحاق آھنگر

حدیقۃ الاولیا میں درج ھے کہ شیخ بھریو ویرداس، جو پہلے ھندو تھے اور بعد میں مسلمان ھوئے، ایک مجذوب بزرگ تھے. اخیر عمر میں گنجہ پہاڑ کے دامن میں رھنے لگے. ایک بار حدیقۃ الاولیا کے مصنف سید عبدالقادر ان کی خدمت میں پہنچے تو وہ ایک سندھی بیت پڑھ رھے تھے. سید عبدالقادر نے دل میں خیال کیا کہ درویش سے معلوم کروں کہ یہ بیت کس کا ھے، تو درویش نے ان سے کہا کہ یہ اسحاق آھنگر کا بیت ھے. عام طور پر اسحاق آھنگر کے نام یہ بیت منسوب ھے:-

ٿيان مان جهرڪ، وهان سڄڻ جي سپ تي، مان ڪرن ڊرڪ، ٻولي ٻاجهاريءَ سين . (۱)	میں چڑا بنوں، اور محبوب کے چھاج پر جا کر بیٹھوں، شاید اپنی میٹھی زبان سے "ڈرک" کہہ دیں .

مرحوم و مغفور ڈاکٹر داؤد پوتہ نے اس بیت کو بحث و تمحیص کے بعد اسحاق آہنگر کا بتایا ہے. شیخ بھریو کا انتقال دسویں صدی ہجری میں ہوا . اس سے ظاہر ہے کہ یہ بیت دسویں صدی ہجری (سولھویں صدی عیسوی) کا یا اس سے پہلے کا ہے. اس بنا پر اسحاق آہنگر کو سمہ دور کا شاعر کہا جاسکتا ہے.

راجو ستیودل

تحفۃ الکرام میں ان بزرگ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ یہ مجذوب تھے اور سیر و سفر میں رہتے تھے . ان کے سامنے جب کوئی بات پیش ہوتی تو اٹھہ کر خوش الحانی سے ابیات پڑھتے، اوا ان کے منہہ سے جو کچھہ نکلتا وہ ہوکر رہتا . انہوں نے سنہ ۹۷۷ ھ (۱۵۶۹ ع) میں انتقال کیا . ان کا کوئی بیت دستیاب نہیں ہوسکا .

پیر تاج الدین

پیر صدرالدین کے فرزند اور پیر حسن کبیرالدین کے بھائی تھے . ڈھنڈھی، جون، فتح باغ اور رڑی میں اسماعیلی عقائد کی تبلیغ کرتے تھے . ان سے منسوب سندھی کلام ملا ہے جو درج ذیل ہے :-

---

(۱) "سندھی شعرا اور ان کے اشعار" از علامہ ڈاکٹر داؤدپوتہ، ص ۳، اور ان کا ایک مقالہ شایع شدہ "نئی زندگی"، ستمبرسنہ ۱۹۵۸ء. لالچند امر ڈنومل کی غیر مطبوعہ تصنیف "سندھی ساھت کی پیمائش" کا ایک باب شایع شدہ "کہانی" مارچ- اپریل سنہ ۱۹۵۵ ع.

هيٺي و ڪري سون وٺم نہ ڪيجي
ڪياليجي، ڪياڏيجي
ماڻڪ ڇوڙي وڃي ڪچ وٺجن
تن سان وٺم نہ ڪيجي
ماڻڪ پرکي هي جي ماڻڪ وٺجن
ماڻڪ تيس چٽي لجي

معمولی چیزوں کا بیوپار نہ کرنا چاهئے، ایسی چیزوں کا لینا کیا اور دینا کیا، جو لوگ جواهرات کو چھوڑ کر کانچ کا بیوپار کرتے هیں ان سے بیوپار نہ کرنا چاهیے، جواهرات کو پرکھہ کر سودا کرنا چاهیے، اور اچھی طرح سے دیکھہ بھال کرلینا چاهیے.

شاعر پراڑ

شاہ کریم کے ملفوظات "بیان العارفین" میں قاضی قاضن کے ابیات کے علاوہ نو ابیات ایسے هیں جو دیگر شعرا کے معلوم هوتے هیں. ان میں سے تین هندی میں هیں اور چھہ سندهی میں. سندهی ابیات میں سے تین شاہ کریم کے همعصر شعرا کے اور تین شاہ کریم کے زمانے سے پہلے کے شعرا کے معلوم هوتے هیں. ان تین ابیات میں سے ایک بیت کے آخری مصرعہ میں لفظ "پراڑ" استعمال هوا هے. یہ بیت شاہ کریم کا سمجھا جاتا تھا، لیکن ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کا خیال هے (ص ۴۳) کہ یہ بیت پراڑ قوم کے کسی قدیم شاعر کا هے جسے شاہ کریم نے مثال کے طور پر استعمال کیا هے. وہ بیت درج ذیل هے:-

چندن چـور ڪريندي رتـو
منهن ڪهاڙ،
سڄڻ ڏجڻ نہ ٿئي جي رسي
سؤ وار،
پروڙيو پـراڙ تـہ ڪرهيندي
قرب ٿئي.

چندن کی لکڑی کاٹتے وقت کلهاڑی کا منهہ لال هوگیا، دوست، دشمن نهیں هوگا، اگرچہ سو بار ناراض هو، پراڑ نے سمجھہ لیا هے کہ روٹھنے کے بعد من جانے سے محبت میں اضافہ هوتا هے.

بیان العارفین میں ہے کہ ایک بار شاہ کریم سے حسب ذیل بیت کے معنی پوچھے گئے، جو گویا ایک معمہ کے طور پر کہا گیا ہے اور زمانۂ قدیم سے مروج ہے:-

ڪارين ڪنين ڪڪڙا ڪري	کالے کانوں اور بھورے رنگ
ولا ڙوڇن ،	والے اونٹ دوڑتے ہوئے جا
وبلو ڪـن نـہ وچ مہ ، نہ	رہے ہیں، نہ کہیں منزل کرتے
اوڳار پيچن .	ہیں اور نہ دم لیتے ہیں .

بیان العارفین میں مذکور ہے کہ ایک بار شاہ کریم کے ایام شباب میں ایک محفل سماع میں قوال نے حسب ذیل بیت پڑھا:-

اکڙيون سلير م جنين راتوڏينهن ،	جن کی آنکھیں دن رات سلیر
عمـر آسائن سيـن هاڻـي	کی طرف لگی ہوئی ہوں اے عمر!
ڪندين ڪيئن . (۱)	تو ان کو کیا کر سکے گا.

معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیت بھی شاہ کریم سے پہلے کا ہے، اور ممکن ہے کہ سمہ دور کے کسی شاعر کا ہو.

قاضی قاضن

قاضی قاضن بن قاضی ابوسعید بکھری کے اسلاف سیوھن کے باشندے تھے. ان کے سگڑ دادا قاضی ابوالخیر سیوھن سے نقل مکانی کر کے بکھر میں جا کے قیام پذیر ہوئے. سنہ ۱۵۲۰ع میں جب شاہ بیگ ارغون نے ٹھٹہ پر حملہ کیا تو قاضی قاضن کا اھل و عیال بھی ٹھٹہ میں تھا. انہوں نے شاہ بیگ ارغون تک ان کے پیش امام کے توسط سے رسائی حاصل کی، اور ان کی گذارش پر ٹھٹہ کا قتل عام بند ہوا. اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں سید میران محمد

---

(۱) "کریم جو کلام" میمن عبدالمجید سندھی، ص ۱۲۰.

جونپوری کے مرید تھے۔ بالآخر شاہ بیگ کے ساتھ، قاضی قاضن کے مراسم اسقدر بڑھ گئے کہ وہ ان سے دینی خواہ سیاسی معاملات میں مشورہ لینے لگے۔ شاہ بیگ کے انتقال (۱۵۲۲ع) کے بعد ان کے فرزند شاہ حسن نے قاضی قاضن کو بکھر کا قاضی مقرر کیا۔ وہ اس عہدہ پر بیس برس تک فائز رہے۔ اس کے بعد مستعفی ہو کر مدینہ منورہ چلے گئے اور سنہ ۱۵۵۱ع میں وفات پائی۔ بڑے عالم و فاضل تھے اور بہت سے علوم و فنون میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ بیان العارفین کے ذریعہ ان کے سات آٹھ ابیات ملے ہیں۔

فن اور ساخت کے اعتبار سے ان ابیات میں سے بعض دوہا چھند کے مطابق ہیں، اور بعض سورٹھا چھند کے مطابق، اور چند ابیات دونوں صنفوں یعنی دوہا اوو سورٹھا میں ہیں۔ ابیات، الفاظ کی بندش کے اعتبار سے نہایت ھی پختہ ہیں، اور مناسب تشبیہات کے ساتھ، ان کو اور بھی مؤثر بنادیا گیا ہے۔ حسب ذیل بیت میں ظاہری علم کو کانٹے اور مگرمچھ سے تشبیہ دی ہے:-

سي ئي سيل ٿئام، پڙهئام جي پاٿان، اکر اکيان ايري واڳون ٿي ورئام.	جو علم میںنے حاصل کیا ہے، وہ میرے لئے کانٹا بن گیا ہے اور الفاظ نے ابھر کر مگرمچھ کی طرح گھیر لیا ہے۔

ظاہری علوم کو معرفت کیلئے حجاب سمجھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ وہ راہ ھی الگ ہے جس پر چلکر عرفان حاصل ہوتا ہے:-

ڪنز، قدوري، ڪافيہ ڪي ڪين پڙهئوم، سو پارڻي ٻئو ڪو جتان پري لڌوم.	میںنے کنز، قدوری اور کافیہ کو نہیں پڑھا، وہ راہ ھی اور ہے جس پر چلکر میںنے محبوب کو پالیا۔

ان ابیات میں سے چار ابیات ایسے ھیں جن میں ظاھری علم کو بے سود بتایا گیا ھے، اور اس کے بعد یہ بات سندھی شاعری کی ایک روایت بن گئی ھے. خصوصاً صوفیانہ شاعری کیلئے تو لازمی سی ھوگئی ھے. قاضی قاضن تصوف میں وحدۃ الوجود کے قائل تھے. مندرجہ ذیل بیت میں ھمہ اوست کے عقیدہ پر روشنی ڈالتے ھوئے کہتے ھیں :-

سائر ڏيئي لت اوچي نيچي پوڙئي، هيڪائي هيڪ ٿئو، وئي سڀ جهت .	دریا کے سیلاب نے تمام نشیب و فراز کو غرق کردیا، تمام سمتیں مٹ گئیں اور صرف دریا ھی دریا رھگیا .

معرفت کی راہ دکھانے والے کیلئے "جوگی" کا استعارہ پہلی بار قاضی قاضن نے استعمال کیا. اس کے بعد لطف اللہ قادری، شاہ لطیف اور دیگر صوفی شعرا نے اس لفظ میں ان کا تتبع کیا. قاضی قاضن نے کہا ھے :-

جوڳي جاڳايوس ستو هوس ننڊ ۾، تھان پوءِ ٿئوس، سنڌي پريان پيچري.	مجھے جوگی نے آکر جگایا، میں غفلت کی نیند سویا ھوا تھا، پھر اٹھہ کر محبوب کی راہ پر چل پڑا.

ان کے مندرجہ ذیل بیت میں سسئی پنھوں کی کہانی کی جانب اشارہ ھے. اسی کہانی سے متعلق دو ابیات اوپر بھی بیان کئے جاچکے ھیں، جو شیخ چوھڑ کے مزار پر منعقدہ محفل سماع میں پڑھے گئے تھے. اس سے معلوم ھوتا ھے کہ سمہ دور میں تصوف کے اسرار و رموز بیان کرنے کیلئے تمثیل کے طور پر مشہور رومانی داستانوں کا سہارا لینے کا رواج موجود تھا. قاضی قاضن کا بیت درج ذیل ھے :-

سجڻ سنجهه هئام، مون اٿي ويا اوٺيا، هيڏانهن هوڏانهن هٿڙا اهنئين جاڙوڏام.	محبوب تو میرے ھی پاس تھے، صرف اونٹوں والے (پنھوں کے بھائی) چلے گئے. میں نے خواہ مخواہ محبوب کو اِدھر اُدھر تلاش کیا.

ادبی جائزہ

یہ دور بھی سندھی ادب کیلئے تعمیری دور تھا. اس دور کا جو ادبی ذخیرہ دستیاب ھوا ھے، اس پر پہلے ھی بحث کی جاچکی ھے. ذیل میں اس ادبی ذخیرہ کا مجموعی جائزہ پیش کیا جاتا ھے.

(۱) ابتدا میں لسانی خصوصیتیں اور ادبی روایتیں وھی رھیں، جو سومرہ دور میں تھیں. یعنی شجاعت اور داد و دھش کی داستانیں بیان کی گئیں، اور ان کے درمیان میں گاھیں بھی پیش کی گئیں. اسکے علاوہ واقعاتی اور محاکاتی ابیات بھی کہے گئے.

(۲) رومانی داستانیں بھی گائی گئیں، اور ان میں مکالماتی ابیات بھی استعمال کئے گئے، اور یہ انداز بیان بعد میں بھی قائم رھا.

(۳) اس دور میں دھلی کے حکمرانوں نے سندھ پر یلغاریں کیں، جن کی وجہ سے اھل سندھ میں اپنے وطن کو غیروں کی غلامی سے آزاد رکھنے کا جذبہ بیدار ھوا، اس جذبہ کی حوصلہ افزائی سندھ کے علما اور صوفیائے بھی کی. مخدوم بلال کو اسی وجہ سے شہادت کی سعادت سے ھمکنار ھونا پڑا، اور اسی جذبہ کی بنا پر ٹھٹہ کے باشندوں میں ایک فقرہ مشہور ھوا جسے رجز یا قومی نعرہ کا نام دیا جا سکتا ھے.

(۴) اسی دور میں فارسی تعلیمی اور دفتری زبان بنی، فارسی میں تصنیف و تالیف کا آغاز ھوا، اور سندھ نے بلند پایہ فارسی

گو شعرا پیدا کئے. اس کے علاوہ اس دور میں اسلامی علوم و فنون نے بھی بڑی ترقی کی. متعدد جید علما اور بزرگ صوفیا پیدا ہوئے. مثلاً قاضی قاضن، شیخ حماد جمالی، شیخ عیسیٰ لنگوٹی، شیخ جھنڈو پاتنی، جام نندو، مخدوم بلال اور ملا عبدالرحمٰن عرف ملا لٹر وغیرھم.

(۵) سندھی زبان کاٹھیاواڑ، کچھ، گجرات، اس بیلا، قلات، مکران، سبی، بھاگ ناڑی اور بہاولپور تک پہنچی، اس لئے سندھی اور سرائکی زبانیں ایکدوسرے سے متاثر ہوئیں، اور سندھی ابیات بہاولپور کے علاقہ تک مشہور و مروج ہوئے. اس کے علاوہ سندھی کے کاٹھیاواڑی، کچھی، بھاگ ناڑی، لاسی، جدگالی اور تھری محاورے وجود میں آئے.

(۶) عوام کی طرح حکمرانوں کی مادری زبان بھی سندھی تھی. حکمران بھٹوں اور بھانڈوں کی سرپرستی کیا کرتے تھے، اس لئے سندھی شاعری اور سندھی قصہ کہانیوں کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی.

(۷) سندھ کے صوفی بزرگوں نے بھی شاعری کی سرپرستی کی، انہوں نے اپنے افکار و جذبات اور تصوف کے نکات سندھی ابیات کے ذریعہ تمثیلی انداز میں بیان کئے. اس لئے تمثیلی شاعری کی بنا پڑی، اور اس کی جڑیں مضبوط ہوئیں. چند ابیات سسئی پنہوں کی داستان سے متعلق تمثیلی انداز کے دستیاب ہوئے ہیں، جن میں تصوف کے نکات سمجھائے گئے ہیں. ایک بیت میں "سورڑیو اور مگر مچھ" کی کہانی کی جانب اشارہ ہے. اس میں بھی تصوف کے مسائل بیان کئے گئے ہیں. اس دور میں مشہور کہانیوں اور داستانوں کے علاوہ دیگر تشبیہات و استعارات کے ذریعہ بھی اپنے

مقصد کو زیادہ سے زیادہ واضح کیا گیا ، جس کے نتیجہ میں سندھی بیت میں مزید رنگینی ، دلکشی اور تنوع پیدا ہوا . جو تشبیہات و استعارات استعمال کئے گئے ، وہ اپنے ہی ماحول سے لئے گئے تھے ، اس لئے سندھی بیت میں مقامی اثر قائم رہا .

(۸) صوفی حضرات کی سماع کی محفلوں میں سندھی ابیات پڑھے جاتے تھے . یہ محفلیں سندھی ابیات کی ترقی کا اہم ذریعہ ثابت ہوئیں اور انکی شہرت اور قبول عام کا باعث بنیں .

(۹) سندھی بیت میں عشقیہ اور فراقیہ مضامین داخل ہوئے ، اور اس چیز نے اس میں مزید اثر انگیزی پیدا کی .

(۱۰) نظم کے علاوہ نثر میں بھی داستان نے باقاعدہ ایک فن کی حیثیت اختیار کرلی .

(۱۱) اس دور سے متعلق بیت کے علاوہ ایسے فقرے بھی ملتے ہیں جو مقفیٰ ہیں مثلاً نوح ہوتھیانی کا کہا ہوا فقرہ ، اہل ٹھٹہ کا جنگی نعرہ اور شاہ مراد شیرازی کا دعائیہ فقرہ .

(۱۲) اس دور کے جو ابیات ملے ہیں ، ان میں سے بعض پیشین گوئی کی نوعیت کے ہیں . بعض میں خوشحالی کی تمنا کی گئی ہے اور بعض میں معمائی انداز اختیار کیا گیا ہے .

(۱۳) اس دور کے متعدد ابیات میں اس کے سیاسی ماحول ، سندھ کی تاریخ ، جغرافیہ ، مذہبی تحریکوں کے اثرات اور معاشرہ کی عکاسی نظر آتی ہے . شیخ حماد جمالی ، درویش نوح ہوتھیانی اور ماموئی درویشوں کے ابیات میں سیاسی ماحول کی جھلک ہے . ماموئی درویشوں کے ابیات میں سندھ کے دریاؤں ھاکڑہ اور ہران کے ازسرنو بہنے کی تمنا ہے .

باب چہارم

ارغون، ترخان اور مغلیہ دور (۱۵۲۱ع-۱۷۱۸ع)

سیاسی صورتحال

سنہ ۱۵۰۷ع میں شاہ بیگ ارغون شاہ اسماعیل صفوی، محمد خان شیبانی اور بابر کے دباؤ کی وجہ سے کابل اور قندھار سے نقل مکانی کرکے شال اور سبی میں وارد ہوئے (۱).

اس زمانہ میں سندھ کے حکمران جام فیروز تھے. ان کے ایک رشتہ دار جام صلاح الدین نے بغاوت کردی تھی جس سے سندھ میں خانہ جنگی شروع ہوگئی، جس سے فائدہ اٹھاکر ٹھٹہ پر حملہ کردیا اور سنہ ۱۵۲۱ع میں اسے فتح کیا. اسکے بعد سہون اور بکھر بھی فتح کرلئے. سہون کے قریب ٹلٹی کے میدان میں دریا خان کے فرزندوں اور دیگر امرا نے ان کا زبردست مقابلہ کیا، جس میں سندھ کے متعدد بہادر شہید ہوگئے اور شاہ بیگ کو فتح حاصل ہوئی. چونکہ سندھ کے محب وطن بزرگ مخدوم بلال نے سندھ کے بہادر جان نثاروں کی سرپرستی کی تھی اس لئے بعد میں ایک بہانہ گھڑکر ان کو شہید کروایا گیا.

ایک برس بعد ۲۲ شعبان سنہ ۹۲۸ھ (۱۵۲۲ع) کو شاہ بیگ کا انتقال ہوگیا. ان کے بعد ان کے فرزند شاہ حسن ارغون سندھ کے حکمران ہوئے (۲).

---

(۱) "ترخان نامہ" تالیف سید میر محمد بن سید جلال تتوی، باہتمام سید حسام الدین راشدی، مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ سنہ ۱۹۶۵ع، پیش گفتار ص ۲۰۱، تاریخ معصومی، ص ۱۲ تا ۱۲۷.

(۲) تاریخ معصومی، ص ۱۴۶ تا ۱۶۱.

ھمایون، فرید خان سوری (شیر شاہ) کے ھاتھوں شکست کھا کر لاھور اور اچ سے ھوتے ھوئے سنہ ۱۵۴۱ء میں سندھ میں آئے اور روھڑی کے قریب "ببرلوء" کے مقام پر منزل انداز ھوئے. شاہ حسن نے نہ صرف ان کی کوئی مدد نہیں کی، بلکہ ان کیلئے مزید دشواریاں پیدا کردیں، جس سے مجبور ھو کر وہ جودھپور کو چلے گئے. اثنائے راہ میں عمر کوٹ (ضلع تھرپارکر سندھ) میں اکبر کی ولادت ھوئی۔ ۱۰ جولائی ۱۵۴۳ء کو ھمایون سندھ سے ایران کو روانہ ھوئے (۱).

شاہ حسن ارغون سنہ ۱۵۵۴ع میں لاولد فوت ھوئے، اس لئے سندھ دو خاندانوں میں تقسیم ھوگئی. شمالی سندھ جس کا مرکز بکھر تھا، سلطان محمود کوکلتاش کے قبضہ میں آئی جو شاہ حسن کے عہد میں بکھر کے گورنر تھے. جنوبی سندھ پر شاہ حسن کے دوسرے امیر مرزا عیسیٰ ترخان کا تسلط ھوا. اس طرح سندھ میں ترخان حکومت قائم ھوئی.

مغل

سنہ ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۱ع) میں شہنشاہ اکبر کی طرف سے مرزا عبدالرحیم خان خانان نے سندھ پر حملہ کرکے اسے فتح کرلیا. اور اس طرح ترخانوں کا تسلط ختم ھوگیا. اب سندھ مغل سلطنت کا ایک حصہ بنگئی اور مرزا غازی بیگ ترخان کو ٹھٹہ کا نواب مقرر کردیا گیا. بعد میں غازی بیگ قندھار کے صوبہ دار بنادیئے گئے، جہاں سنہ ۱۶۱۲ع میں انتقال کرگئے. مرزا غازی بیگ فارسی زبان کے اچھے شاعر تھے اور "وقاری" تخلص کرتے تھے (۲).

---

(۱) تاریخ معصومی، ص ۱۶۵ تا ۱۷۹.
(۲) تاریخ معصومی، ص ۲۵۰ تا ۲۵۷.

مغلوں کے عہد میں ٹھٹہ، بکھر اور سیہون کیلئے الگ الگ صوبہ دار مقرر ہوتے رہے۔ محمد شاہ کے عہد میں مغل سلطنت کمزور ہوگئی اور سندھ میں کلہوڑے طاقت پکڑنے لگے اور آخرکار وہ سندھ پر قابض ہوگئے۔ انہوں نے جب باقاعدہ اپنی حکومت قائم کرلی تو مغل صوبہ داروں کی آمد بند ہوگئی۔

ملکی حالات

ارغون، ترخان اور مغل بیرونی اور اجنبی حکمران تھے۔ انہوں نے سندھیوں کے ساتھ زیادتیاں کیں۔ مخدوم بلال گویا سندھ کی علامت تھے اور سندھ انہی کی طرح صدیوں تک کولہو میں پستی رہی۔ بڑا نقصان یہ ہوا کہ سندھ کا علم و ادب تباہ و برباد ہوگیا۔ سندھ کے علما و فضلا ہجرت کر کے مدینہ طیبہ اور گجرات چلے گئے۔ ترخانوں نے سندھ پر جو مظالم ڈھائے، ان پر تاریخ گواہ ہے۔ یہ مظالم چنگیز اور ہلاکو کے مظالم سے کسی طرح بھی کم نہیں تھے۔ مغلوں کے عہد میں بھی سندھ نے اطمینان کا سانس نہیں لیا۔ مغل گورنروں نے ایسے ظلم و ستم کئے جو سندھ کی سر زمین سندھیوں کے خون ناحق سے لالہ زار بنگئی۔ اہل سندھ بھی خاموش ہو کر نہیں بیٹھے، وہ وقتاً فوقتاً بغاوتیں کرتے رہے۔

علمی حالات

ارغونوں کی اپنی زبان فارسی تھی، اس لئے ان کے دور میں فارسی کو فروغ حاصل ہوا۔ شاہ حسن ارغون خود بھی فارسی زبان کے شاعر تھے اور "سپاہی" تخلص کرتے تھے۔ ان کے عہد حکومت میں وسط ایشیا انتشار کا شکار تھا۔ سیاسی انقلابات کی وجہ سے متعدد خاندان ہجرت کر کے سندھ میں آئے اور یہیں

آباد ہوگئے. شکر الٰہی سادات کے مورث اعلیٰ سید شکر اللہ، انجوی یا نقوی سادات، اور شمسی سبزواری سادات کے جد امجد سید شیر شاہ ٹھٹہ میں آکر آباد ہوئے. میرکی سادات کے جد اعلیٰ میر محمود میرک بایزید الحسینی پورانی سنہ ۱۵۲۱ع میں ہرات سے ہجرت کرکے بکھر میں وارد ہوئے. پرانا سکھر اور روہڑی کے موسوی سادات انہی کی نسل سے ہیں. ان کے علاوہ اور بھی کئی علما و فضلا سندھ میں آگئے اور یہیں پر مستقل سکونت اختیار کرلی.

اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ باہر سے جو علما سندھ میں آئے وہ بڑے فضل و کمال کے مالک تھے، اور ان کی آمد سے سندھ میں علم و فضل کا غیر معمولی چرچا ہوا، لیکن ان سے قبل بھی سندھ میں بڑے جید علما و فضلا موجود تھے اور ان کے دم سے سندھ کا کونہ کونہ علم کے نور سے منور تھا. فارسی زبان میں شعر گوئی کا رواج بھی پہلے ہی سے موجود تھا، لیکن ارغونوں، ترخانوں اور مغلوں کے زمانہ میں اس میں ترقی ہوئی. مولانا میر یوسف سمرقندی، مولانا یار محمد ہراتی، محمد مقیم ٹھٹوی، قاضی قاضن کے پوتے محمد اشرف، دانشور خان شہرتی، غروری، غیوری کلیچ حیدر، میرابوالمکارم ٹھٹوی، میر معصوم بکھری، میرنجم الدین بکھری، مرزا غازی بیگ، طالب آملی اس دور کے بلندپایہ فارسی گو شعرا تھے.

مغلوں کے عہد میں سندھ میں اردو شاعری بھی مروج ہوئی. ہندوستان سے بعض ایسے حضرات سندھ میں آئے، جو اردو میں شعر کہتے تھے. مثلاً محمود صابری، محمد سعید رہبر، میرعلی جعفری بے نوا، سید فضائل علی خان بے قید، محسن الدین شیرازی وغیرہم.

انھی حضرات کی وجہ سے سندھ میں اردو زبان میں شعر گوئی کا ذوق پیدا ہوا۔ شیخ ورو، عبدالسبحان فائز ٹھٹوی، سید صدرالدین کامل اس دور کے سندھی شعرا تھے، جن کا اردو کلام بھی دستیاب ہوا ہے۔ ان کی اردو، قدیم اردو ہے جو ولی دکنی کی اردو سے ملتی جلتی ہے۔

اس زمانہ میں سندھ کی متعدد تاریخیں فارسی زبان میں تصنیف کی گئیں۔ میر معصوم بکھری نے ۱۰۰۸ھ/۱۰۰۹ھ (۱۵۹۹ع/۱۶۰۰ع) میں سندھ کی تاریخ لکھی جو تاریخ معصومی کے نام سے مشہور ہے۔ سید عبدالقادر ٹھٹوی نے گیارھویں صدی کے آخر میں "حدیقۃ الاولیاء" کے نام سے ایک تذکرہ تصنیف کیا، جس میں سندھ کے ۴۴ علمائے کرام کا ذکر ہے۔ ادارکی بیگلاری نے سنہ ۱۰۱۷ھ (۱۶۰۸ع) میں "بیگلار نامہ" تصنیف کیا، جس میں ارغونوں اور ترخانوں کی تاریخ ہے۔ میر طاہر محمد نسیانی نے "تاریخ طاہری" تصنیف کی۔ اس میں بھی ارغونوں اور ترخانوں کے دور کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ میرک یوسف بن میر ابوالقاسم نمکین نے ۱۰۴۴ھ (۱۶۳۴ع) میں "مظہر شاہی" کے نام سے ایک تاریخ تصنیف کی جس میں سندھ کے دردانگیز حالات بیان کئے گئے ہیں۔ سید جمال الدین نے سنہ ۱۰۶۵ھ (۱۶۶۴ع) میں "ترخان نامہ" تصنیف کیا جس میں ترخانوں کے دور کا ذکر ہے۔ شاہ کریم کے ملفوظات "بیان العارفین" کے نام سے ان کے ایک مرید محمد رضا بن عبدالواسع عرف دریائی نے سنہ ۱۰۳۸ھ (۱۶۳۸ع) میں مرتب کئے، جس میں شاہ کریم کے سوانح حیات بھی ہیں اور ان کے سندھی ابیات بھی۔

سندھی ادب

ارغون دور اگرچہ سندھ پر اغیار کے تسلط کا دور تھا اور سندھی زبان کی سرپرستی یکسر ختم ہوچکی تھی، تاہم سندھی شعرا موجود تھے اور اپنی مادری زبان میں بھی شعر کہتے تھے. لیکن افسوس کہ گردش زمانہ نے اس دور کے سندھی ادب کے بہت ھی کم آثار رہنے دیئے. اس دور میں وہ شعرا بھی زندہ تھے جنہوں نے سمہ دور دیکھا تھا. مثلاً قاضی قاضن، راجو ستیودل، اور پراڑ وغیرھم. سندھی شعرا ارغون دور میں چونکہ موجود تھے، لہذا اس امر پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ھے کہ انہوں نے سندھی میں شعر نہیں کہا ھوگا. شعر تو ضرور کہا ھوگا لیکن اجنبی تسلط کی وجہ سے عوامی محفلوں اور صوفیا کی مجلسوں کی زینت نہیں بن سکا ھوگا، اور غالباً یہی وجہ ھے کہ اس دور کا سندھی ادب قلمبند نہیں کیا گیا اور ھم تک نہیں پہنچ سکا. "تذکرۃ الابرار" میں مذکور ھے کہ ہاٹ کے جو بزرگان ھجرت کرکے برھان پور میں سکونت پذیر ھوگئے، انہیں اپنی مادری زبان سے بڑی دلچسپی تھی. ان میں سے ایک بزرگ شیخ "لاڈجیو" سندھی کافیاں گا کر سنایا کرتے تھے، اس سے ثابت ھوتا ھے کہ اس دور میں سندھی ابیات کے ساتھ ھی ساتھ سندھی کافی بھی مروج تھی اور اس کا رواج ارغون دور سے بھی پہلے سے موجود تھا، لیکن افسوس ھے کہ اس دور کی کافی کی کوئی مثال دستیاب نہیں ھوئی. ارغون دور کے بعد کلہوڑہ دور کی وائی یا کافی کے نمونے دستیاب ھوئے ھیں. یہ بات بڑی تعجب خیز ھے کہ شیخ لاڈجیو نے برھان پور میں تو جا کر کافیاں کہی ھیں لیکن خود سندھ میں ان کا کلام دست برد زمانہ سے محفوظ نہیں رہ سکا ھے.

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اس دور کے شعرا کی کافیاں قلمبند ہی نہیں کی گئیں یا ان کا ادبی ذخیرہ تباہ ہو گیا۔ گرونانک صاحب اسی دور کے بزرگ تھے جو ایک بار پنجاب سے سندھ میں بھی آئے۔ گرو گرنتھ میں ان کا ایک شعر موجود ہے جسے سندھی بیت کیا جاسکتا ہے:-

لوڑِ لوڑي ڏٺ پياس نہ بجهي مون گهڻي،	میں جستجو کرکے تھک چکا ہوں میری پیاس ابھی نہیں بجھی۔
نانڪ سي اکڙيان ٻين، جن ڏسندو مال پري .	نانک! وہ آنکھیں ہی اور ہیں جو میرے محبوب کو دیکھ سکیں۔

ترخان دور کا تھوڑا سا ادبی ذخیرہ دستیاب ہوا ہے۔ اس دور کے جن شعرا کے حالات معلوم ہوئے ہیں، ان کا اختصار ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) مخدوم پیر محمد لکھوی

یہ بزرگ دراصل ٹھٹہ کے باشندہ تھے۔ بعد م نقل مکانی کرکے لکھی (تحصیل سکھر) میں سکونت پذیر ہوئے۔ ان کا انتقال سنہ ۱۵۹۰ع یا سنہ ۱۶۰۰ع کے قریب ہوا ہے۔ ان کی ایک نظم ملی ہے جس میں باد صبا کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ان کے سلام حضور انور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت بابرکت میں پہنچائے۔ روضۂ اقدس پر حاضری کا اشتیاق بھی ظاہر کیا ہے۔ یہ نظم الف اشباع کے قافیہ میں کہی گئی ہے اور اس کی زبان انتہائی لطیف اور دلکش ہے۔ نظم میں سوز و گداز کے ساتھ، سلاست اور روانی بھی ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں:-

اي صباواء صبح جا خاطي خير هثاء
تون ربپارو رحمان جو ۽ قاصد قريبا
تون سانجي محبوبن جو پيڪ سندو پريا
تون پانڌي پيارن جو اولي اکڙيا
تون ساٿي مڪاين جو ماهر مشتاقا
آڻي عجيبن جون خبرون خوشحالا
نڻي نياپا نيهه جا واڍوڙن وٽا
ڦڪي ڦوڙاين جي توکي آهه ادا

اے صبا ! اے نسیم صبح !
تو اللہ کا پیغامبر ہے اور محبوب کا قاصد
تو محبوب کا قاصد ہے اور ان کا پیغام
لانے والا
تو محبوب کے پاس جانے آنے والا ہے
تو محبت کرنے والوں کا رفیق ہے
اور عشاق کا محرم راز
تو محبوب کی جانب سے اچھی خبریں
لانے والا ہے
فراق کے دردمندوں کے پیغام لے جا
درد فراق کے مارے ہوؤں کی دوا
تمہارے پاس ہے.

اخیر میں اپنے مدعا کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

روضي پيش رسول جي آيم سين عجزا
ته پيرو پٽ هارون جو پوٽو الياسا
سنڌي ساڪن سنڌ جو شائق شفيقا
جنهن قسمت قيد ڪيو لکئي لاما
ورهه ويڙهيو آهيان مٿي پيرن لاء
ويلو وجهه م وچ ۾ سبڙ ساٿيڙا
پيروءَ جو پهچائين سلامت ساٿا

تو حضور کے روضۂ اقدس کے سامنے
عجز کے ساتھ جا کر حاضر ہو
(اور عرض کر) کہ پیرو، ہارون کا
بیٹا اور الیاس کا پوتا
جو سندھی ہے، سندھ کا باشندہ ہے
اور رقیق القلب عاشق ہے
جسے قسمت نے لکھی میں قید
کردیا ہے
میں سرتاپا عشق میں ڈوبا ہوا ہوں
اے مہربان ساتھی! جلدی تیار ہو
اور راہ میں کہیں منزل نہ کر
پیرو کو سلامتی کے ساتھ (منزل
مقصود تک) پہنچادے.

(۲) مخدوم نوح

ھالا کندی کے بہت ھی بڑے بزرگ تھے. ان کا نسبی سلسلہ سہروردی سلسلہ کے بانی حضرت شیخ ابوالنجیب ضیاءالدین عبدالقاھر کی وساطت سے حضرت صدیق اکبر سے جا کر ملتا ھے. ان کے والد ماجد کا اسم گرامی نعمت اللہ تھا. ۲۷ رمضان سنہ ۹۱۱ھ (۱۵۰۵ع) میں متولد ھوئے اور ۲۷ ذوالقعد سنہ ۹۹۸ھ (۱۵۹۰ع) میں رحلت فرمائی. ظاھری تعلیم واجبی سی حاصل کی تھی لیکن اس کے باوجود جب قرآن مجید کی تفسیر بیان کرتے تو علما حیران رھجاتے تھے. قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ اور مختصر تفسیر اپنے مرید بہاءالدین گوڈریو سے لکھوائی تھی. اس کے علاوہ کئی طالبان حق ان کے سرچشمۂ فیض سے سیراب ھوئے(۱).

مخدوم صاحب کے ملفوظات میں ان کے چند سندھی ابیات موجود ھیں. ممکن ھے ان کے اور بھی ابیات ھوں جو ھم تک نہ پہنچ سکے ھوں. رحلت سے کچھہ عرصہ پہلے حسب ذیل ابیات ان کی زبان پر تھے:-

پٹي جا پريات، ساما ڪنہ پانئيو ماڻھنا روني چري رات ڏسي ڏ ڪوئين ڪي(۲)	اے لوگو! صبح سویرے جو قطرے تمنے گرتے ھوئے دیکھے، انھیں شبنم نہ سمجھنا، یہ دیوانی رات کے آنسو تھے جو دردمندوں کو دیکھکر بہا رھی تھی.
نہ سي جوڳي جوءِ، نہ سي سامي وات ڪاھڙين ڪنوات وڏي ءِ ويل پلاڻيا(۳)	وہ جوگی بھی اس خطہ میں نہیں رھے اور وہ سالک بھی راہ میں کہیں نظر نہیں آتے (ایسا معلوم ھوتا ھے کہ عارفان حق نے اپنے قافلہ کے اونٹ سویرے ھی کوچ کیلئے تیار کرلئے تھے.

(۱) تحفۃ الکرام، ج ۳، ص ۱۵۰، ۱۵۱.
(۲،۳) تذکرہ لطفي، ج ۱، طبع سوم، ص ۱۶۰، ۱۶۱.

ایک بار ایک بھکاری نے ان کے دروازہ پر یہ صدا لگائی :-

سمي جام آئي عالم سڀ آجو ٿيو	جام سمے کے آتے ہی تمام عالم آزاد ہو گیا۔

اس پر آپ نے جواب میں فرمایا :-

سمون به سائين ڳڻ، تون به لوچ لچ ڪي هلندي سمي سامهون تون به ڪيرت ڪڇ ته توبه ٿئي ڏڍ، سمي به سوڀ ٿئي.	سمہ تو ساتھیوں کے ساتھ ہے لیکن تو بھی بھرم رکھنے کی خاطر کچھ کر۔ سمہ کے سامنے جانے کیلئے کچھ ریاض کر، تا کہ تجھے بھی اطمینان ہو اور سمہ بھی کامیاب ہو۔

(۳) شاہ کریم

شاہ لطیف کے جد امجد شاہ عبدالکریم بلڑی والے متعلوی سادات میں سے تھے۔ ان کا نسبی سلسلہ حضرت امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے۔ شاہ کریم کے والد ماجد کا اسم گرامی لعل محمد تھا۔ شاہ کریم سنہ ۹۴۴ھ (۱۵۳۷ع) میں متولد ہوئے۔ قرآن مجید کے دو پاروں سے زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ شروع میں صوبہ بہار سے آئے ہوئے ایک درویش کے معتقد ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد مخدوم نوح کے ھاتھہ پر بیعت کی۔ بڑے عابد، زاھد، صابر اور حلیم الطبع تھے۔ اپنی روزی اپنی محنت سے پیدا کرتے تھے۔ سنہ ۱۰۳۲ھ (۱۶۲۲ع) میں رحلت فرمائی۔

شاہ کریم قدیم دور کے بہت بڑے شاعر ھیں۔ قدیم شعرا میں سے یہ پہلے شاعر ھیں جن کا کلام اچھی مقدار میں دستیاب ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں سندھ کا "چاسر" کہا جاتا ہے اور سندھی زبان کا "سہیل" اور شاہ لطیف کا مبشر بھی کہا جاتا ہے۔ ان کا درجہ نہ صرف قدامت کے اعتبار سے بلند ہے، بلکہ ادبی محاسن اور خصوصیات کی وجہ سے بھی بہت بلند ہے۔

انہوں نے اپنے وطن کے رسم و رواج، کام دھندہ اور دیگر تمام مشاغل کا گہرا مطالعہ کیا اور اپنے کلام میں ان کا ذکر کرتے ہوئے نہایت ہی باریک نکتے بیان کئے. لوہار کو سندان پر ضرب لگاتے ہوئے دیکھکر اپنے دل کو سندان سے تشبیہہ دیتے ہوئے اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں :-

ڏکين ڏات ٻــيو هينڙو لــهه سنداڻ جئين سنڀاري کي سجڻين ورچي تان نه ويو.	دل کو چوٹ سہنے کی ایسی عادت پڑ گئی ہے جیسے لوہے کو سندان کی ضرب کی - لیکن دل چونکہ محبوب کو یاد کرتا ہی رہتا ہے اس لئے اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا.

دیہاتی عورت کو پانی کا گھڑا سر پر اٹھائے ہوئے اور پرندہ کو پانی پر بیٹھے ہوئے دیکھکر اپنا حال دل بیان کرتے ہیں :-

پاڻيهاري سر ٻهڙو جرني پکي جئين اسان سجڻ تئين. رهيو آهي روح ۾.	جس طرح پانی بھرنے والی کے سر پر گھڑا رکھا ہے اور کنوئیں پر پرندہ بیٹھا ہوا ہے، اسی طرح ہمارے محبوب بھی ہماری روح میں بسے ہوئے ہیں.

شاہ کریم کا شعر زندگی کے مشاہدات اور تجربات سے معمور، اور انسانی فطرت اور فراست کا آئینہ دار ہے، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ انکے اشعار کے اکثر مصرعے ضرب الامثال بن چکے ہیں. مثلاً :-

(۱) نيهن نياپي نه ٿئي، سڌين سيڻ نه هون	محبت محض پیغام بھیجنے سے نہیں ہوتی اور صرف تمنا کرنے سے کوئی سمدھی نہیں بنتا.
(۲) هنيون ڏجي حبيب کي، لڳ ڪڍجن لوک	دل محبوب کو دینا چاہئے اور جسم دیگر لوگوں کو.

(٣) جي پڇڻا سي نہ منجھڻا، جي پڇن سي وبر

جن میں تجسس کا مادہ اور پوچھ گچھ کرکے کام کرنے کی عادت ہوتی ہے وہ کسی بات میں اٹکے نہیں رہتے اور وہ دلیر ہوتے ہیں.

(٤) مٺ پيڙيائي پلي جي اھنئي تہ واءِ

مٹھی کو بند رکھنا بہتر ہے. گر کھولا تو بھرم کھل جائیگا.

(٥) پاڻيءِ اتي جھوپڙا مورک اڃ مرن.

پانی کے اوپر گھر ہوتے ہوئے بھی پیاسا مرنا احمقوں کا کام ہے.

شاہ کریم کا کلام زبان و بیان کے اعتبار سے انتہا درجہ کی فصاحت و بلاغت کا بہترین اور مثالی نمونہ ہے. انہوں نے تصوف کے گہرے اسرار و رموز انتہائی لطیف تشبیہات و استعارات کے ساتھ بیان کئے ہیں. ان کا کلام ادب عالیہ کا ایک شاہکار ہے اور اس کے معیار کی بلندی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود شاہ لطیف نے ان کا تتبع کیا ہے.

شاہ کریم کے ٩٤ ابیات ان کے ملفوظات بیان العارفین سے ملے ہیں جو ان کے ایک مرید محمد رضا نے سنہ ١٠٣٨ھ میں قلمبند کئے. ان کے چند ابیات بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:-

هنيون ڏجي حبيب کي لڳ گڏجن لوڪ
ڪذبون ۽ ڪروتوڻ، اي پڻ سگهر ٽوڪ.

دل کو دوست کے سپرد کردینا چاہیئے، اور جسم کو دنیا کے معاملات میں مشغول رکھنا چاہیئے. مسجدیں اور ہجرے بھی اچھے ہیں.

جي جاڳندي من ۾ ستي ۾ سيٺي
من پريان نيڻي، پڳهيو پاڻ ڳري.

جو بیداری کے عالم میں آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں وہی سوتے میں سامنے رہتے ہیں.

هنج تتهين هوء اونهي ۾ اوڙاه جو
اي ڪانئرو ڪوء جو چاچر ۾ چيرون ڪري

ہنس وہیں ہوگا جہاں پانی گہرا ہوگا (گہرے پانی میں موتی ہوتے ہیں اور وہ موتی کھاتا ہے) یہ کاہل اور بزدل (بگلا) کون ہے جو پایاب پانی میں مستیاں کر رہا ہے.

جي اتر، جي لاهه، سجڻ سڀ پرکيا
ريءَ پاجيءَ ڪنهن ميڙ پري نه باه.

میں نے شمال خواہ جنوب میں دوستوں کو آزما کر دیکھا، لیکن کامیابی اپنی کوشش کے بغیر حاصل نہیں ہوتی

(۴) بیان العارفین میں دیگر شعرا کے ابیات

سمہ دور کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا جاچکا ہے کہ شاہ کریم کے ملفوظات بیان العارفین میں شاہ کریم اور قاضی قاضن کے ابیات کے علاوہ چھہ ابیات دیگر شعرا کے بھی موجود ہیں، جن میں سے تین ابیات شاہ کریم سے پہلے کے شعرا کے ہیں اور تین ان کے معاصر شعرا کے. جو ابیات انکے پیشرو شعرا کے ہیں، ان کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے. باقی تین ابیات جو انکے معاصرین کے معلوم ہوتے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:-

ڦٽيون ڪر ڦڙڪيون، ور ونگائي پاءِ
جاتن اندر ڪاءِ سا معلوم محبوب کي.

دعویٰ اور دم زنی ترک کردے. محبوب کے دل میں اپنے لئے گنجائش پیدا کر. درد فراق جو تیرے دل کو کھائے جا رہا ہے وہ تیرے محبوب کو معلوم ہے.

وائي وڃيم شال ڪنين سين
ڪين سٽيان
پلو ڪري پال، تہ اکين سين
انڌو ٿيان

خودی اور خود ستائی ختم ہو اور غیراللہ کی کوئی بات کہیں سے نہ سن سکوں. اگر محبوب مہربانی کرے تو اس کے جمال کے سوا اور کچھ بھی دیکھ نہ سکوں.

چارئي پلو چڪ ۾ ڀڇي پاريھر وٺ
اِن اھڙي احتياط سين ڦٽ پڇاڻان ڦٽ.

تمہارے چاروں پلو دنیا کی گندگی سے آلودہ ہیں، اور تھوڑی سی غلاظت لگ جانے سے تمہیں کراہت آتی ہے، ایسی احتیاط سے تم پر حیف ہو.

(۵) سید علی ثانی ٹھٹوی

شاہ کریم کے پیر بھائی اور ہم صحبت سید علی ثانی شیرازی ٹھٹوی بڑے عالم و فاضل، شاعر اور اہل دل بزرگ تھے. ان کے والد ماجد کا اسم گرامی سید جلال بن سید علی (اول) تھا. ٹھٹہ کے انجوی شیرازی خاندان کے چشم و چراغ تھے. شاہ مراد جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، ان کے نانا تھے. سنہ ۸۹۱ھ (۱۴۸۶ع) میں متولد ہوئے اور سنہ ۹۸۱ھ (۱۵۷۲ع) میں رحلت فرمائی. مخدوم نوح کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے پہلے درویش آچر سے فیضیاب ہوئے. سماع کے بڑے دلدادہ تھے اور فقرا کی مصاحبت سے روحانی حظ حاصل کرتے تھے. سندھی اور فارسی زبانوں کے اچھے شاعر تھے. "معارف الانوار" کے مصنف نے ان کا ایک سندھی بیت نقل کیا ہے، جو درج ذیل ہے:-

سرتين سانگ سک جو موٽکي
رويو رهائين،
آءُ تي هلان هوت ڏي هو تيون
واريو وهارين،
وريتيون ورن سين ويٺيون گهر
گهارين،
کهندا تيون کارين، ڪانہ هاندي
هوت ڏي.

سہیلیاں آرام و راحت کا خیال کرتی ہیں اور رو رو کر مجھے روک رہی ہیں. میں ہوت (پنھوں=محبوب) کی طرف جا رہی ہوں، وہ مجھے بار بار بٹھا دیتی ہیں. سہاگنیں اپنے خاوندوں کے ساتھ، گھروں میں بیٹھی ہیں- مجھے خواہ مخواہ ورغلاتی ہیں- محبوب کے پاس کوئی بھی چلنے والی نہیں ہے.

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں چار مصرعوں کا بیت رائج ہوچکا تھا لیکن اس زمانہ کا چار مصرعوں پر مشتمل صرف بھی ایک بیت ملا ہے. اس سے پہلے جو ابیات دستیاب ہوئے ہیں وہ تین مصرعوں کے ہیں.

(۶) درس علاء الدین سومرو

ٹھٹہ کے ایک بزرگ اور حضرت غوث بہاء الدین زکریا ملتانی کے سلسلہ کے مرید تھے. سید علی ثانی کے ہم صحبت تھے. دونوں کی محفلیں جمتی تھیں اور دونوں کے درمیان سندھی ابیات میں سوال و جواب ہوتے تھے(۱). اس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سندھی کے شاعر تھے لیکن ان کا کوئی سندھی بیت دستیاب نہیں ہوسکا ہے.

(۷) سید ابوبکر لکیاری

مخدوم نوح کے خلیفہ تھے اور سہون کے قریب ایک گاؤں آراضی میں رہتے تھے. روایت ہے کہ مخدوم نوح نے رحلت سے پہلے اپنے خلیفۂ خاص سید ابوبکر کو یاد کرتے ہوئے فرمایا تھا:-

---

(۱) تحفۃالکرام، سندھي ترجمہ، ص ۶۲۱.

ابوبکر اٹھ سامين سفر چتائيو،
متان ٿي ہوان سارين سنياسين کي.

اے ابوبکر! آجاؤ، سالکوں کو سفر درپیش ہے، ممکن ہے میں رخت سفر باندھ لوں اور تم سنیاسیوں کو یاد کرتے رہجاؤ.

سید ابوبکر کو مکاشفہ کے ذریعہ حقیقت حال کا علم ہوا تو یہ بیت کہتے ہوئے حاضر خدمت ہوگئے:-

اچانئو اچان، ڪجھ ڪا ذري جھا
متان ٿي ہوان، ساريان سنياسين کي.

میں حاضر ہوتا ہوں، حاضر ہوتا ہوں، تھوڑی دیر ٹھیر جانا ایسا نہ ہو کہ آپ رخت سفر باندھ لیں اور میں سنیاسیوں کو یاد کرتا رہجاؤں.

(۸) شاہ خیرالدین

حضرت غوث اعظم سید عبدالقادر جیلانی رحمہ کی اولاد میں سے تھے، اور سید احمد کے فرزند. سنہ ۹۱۱ھ (۱۵۰۵ع) میں بغداد میں متولد ہوئے. کمسنی میں بغداد سے مکہ معظمہ گئے. تحصیل علوم کے بعد وہاں سے سیر و سیاحت کرتے ہوئے سندھ میں آئے، اور ہالا میں حضرت مخدوم نوح کے مرید ہوئے. کچھ عرصہ ہالا میں ٹھیرنے کے بعد اپنے پیر طریقت کے حکم سے سکھر میں آکر سکونت پذیر ہوگئے، جہاں ۱۰۲۷ھ (۱۶۱۷ع) میں رحلت فرمائی. ان کا مزار پرانا سکھر میں ہے. مشہور شاعر اور صوفی بزرگ شاہ عنایت رضوی ان کے معتقد تھے.

حضرت شاہ خیرالدین کے ایک مرید جزیرۂ سادھ بیلہ (سکھر) میں مجاہدہ میں مصروف تھے. ایک دفعہ حضرت شاہ صاحب انہیں دیکھنے گئے، مرید شمال کی طرف منہہ کرکے سجدہ میں پڑے ہوئے تھے. اس پر شاہ صاحب نے فرمایا:-

نہ تون کعبو، نہ تون قبلو، رهین منجهہ سجود وساري وجود، ملين سان دريا .	تو نہ کعبہ ہے نہ قبلہ، اور پھر بھی سربسجود رہتا ہے، اپنی ہستی کو بھلادے اور دریا کے ساتھہ ملکر ایک ہوجا.

ایک روایت یہ ہے کہ شاہ صاحب نے اس طرح فرمایا تھا:-

نہ تون کعبو، نہ تون قبلو، رهين منجهہ سجود	تو نہ کعبہ ہے نہ قبلہ، اور پھر بھی سر بسجود ہے.

اس پر مرید نے جواباً عرض کیا:-

کوہ کندا قبلو، جن سڃاتو سلطان، پرين اسين پاڻ، ڪريون سجدو ڪنهن کي (۱).	جنہوں نے بادشاہ حقیقی کو پہچانا ہے وہ قبلہ کو کیا کرینگے، ہم تو خود محبوب ہیں، سجدہ کس کو کریں.

سوال و جواب کی نوعیت کے یہ پہلے ابیات ہیں جو دستیاب ہوئے ہیں، مذکورہ بالا ابیات سے پتا چلتا ہے کہ دونوں بزرگوں کی طبیعت میں موزونیت تھی، دونوں ہی شاعر تھے اور عین ممکن ہے کہ دونوں نے اور ابیات بھی کہے ہوں جو محفوظ نہیں رہ سکے.

(۹) سید ہارون

ضلع حیدرآباد کے ایک گاؤں "ہنگورو" کے باشندہ تھے اور اپنے دور کے ایک بزرگ اور شاعر. نہ ان کا کلام دستیاب ہوسکا ہے اور نہ ہی ان کے سوانح حیات معلوم ہوسکے ہیں. تحفۃالکرام سے صرف اسقدر پتہ چلتا ہے کہ مغل گورنروں کے زمانہ میں گذرے ہیں(۲).

(۱۰) یوسف سہتہ

ٹھٹہ کے ایک بزرگ شاعر تھے. تحفۃالکرام سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل گورنروں کے زمانہ میں گذرے ہیں. ان کا کلام اور

---

(۱) تذکرہ شعرائے سکھر، از میمن عبدالمجید سندھی، ص ۳۷.
(۲) تحفۃالکرام، ج ۳، ص ۲۴۷.

ان کے حالات بھی پردۂ اخفا میں ھیں . تحفتہ الکرام سے صرف اسقدر معلوم ھوا ھے کہ ان کے مقبرہ پر شعرا کا اجتماع ھوتا تھا (۱) جسے ابتدائی نوعیت کی محفل مشاعرہ کہا جاسکتا ھے.

(۱۱) جرکس فقیر

"ھنگورجا" کے مخدوم محمد الیاس (۲) کے خادم اور طالب تھے. مخدوم محمد الیاس کے انتقال کے وقت ان کے فرزند مخدوم حاجی حبیب اللہ کم سن تھے . اس زمانہ میں "جام اھیو" سمہ ساھتی پرگنہ کا حکمراں تھا . اسے مخدوموں کے ساتھ بغض تھا اور وقتاً فوقتاً ان کو تنگ کرتا رھتا. مخدوم محمد الیاس کے انتقال کے بعد ان کے سجادہ نشیں کو کم سن دیکھکر اسکی زیادتیوں میں اور بھی شدت پیدا ھوگئی. مخدوموں کو کنویں سے پانی بھرنے اور بازار سے سودا سلف خریدنے سے روکدیا. یہ کیفیت دیکھکر فقیر جرکس مخدوم حبیب اللہ کو گود میں بٹھاکر جام اھیو کے پاس پہنچے جو اس وقت مسجد میں بیٹھا ھوا تھا . فقیر نے جام کو سمجھایا کہ آپ اسقدر ظلم نہ کریں اور اللہ سے ڈریں . اس پر جام کو غصہ آگیا اور اس نے فقیر کو اپنے نوکروں سے پٹوادیا. فقیر مخدوم کو گود میں لیکر منبر پر چڑھا اور جام کو بد دعا دیتے ھوئے یہ ابیات کہے (۳):-

---

(۱) تحفتہ الکرام، ج ۳، ص ۵۸۱.

(۲) مخدوم الیاس کافی کے بلند پایہ شاعر دولہہ دریا خان کے جد امجد اور مخدوم صدرالدین قریشی عباسی کی اولاد میں سے چوتھی نسل میں تھے- مخدوم صدرالدین عرب سے سندھ میں آئے تھے. پہلے لس بیلہ گئے اور وھاں کے جام (حکمراں) کی صاحبزادی سے نکاح کیا. پھر ھنگورجا آکر آباد ھوگئے.

(۳) "دولہہ دریا خان"، ایک غیر مطبوعہ کتابچہ، مرتبہ ھدایت علی تارک.

اوپر ڈاھن ٿي آيا، سنهري ٻه سوار،	مشرق کی جانب سے دو سوار آئے،
ھڪڙي پڪڙيس ڏاڙھي کئون،	ایک نے ڈاڑھی سے پکڑا اور
ٻئي پڪڙيس وار،	دوسرے نے سر کے بالوں سے پھر
ماري سيپ چمار، تن جي منزل	زندگی بھر ان کا کوئی پتہ نہیں
متو ناه کو.	چل سکا.
اھيو ٿيو وھيو، مٿئون پيس باز،	اھیو چڑیا بن گیا اور اس کے اوپر
تھين جو آواز، پھر ٻڌو کونہ کو.	باز جھپٹا، پھر اس کی آواز سننے
	میں نہیں آئی.

فقیر جرکس نے جب یہ دو ابیات کہے تو مشرق سے دو سوار نمودار ھوئے جو جام اھیو کو پکڑ کر لیگئے. لوگوں نے ان کا تعاقب کیا لیکن ان تک پہنچنے میں ناکام رھے. اس کے بعد جام اھیو کا کوئی پتہ نہیں چل سکا (۱).

فقیر ھدایت علی تارک "رسالہ دولہہ دریا خان" کے مقدمہ میں رقمطراز ھیں کہ مخدوم حبیب اللہ کا تعلق سہروردی سلسلہ سے تھا اور وہ حضرت غوث بہاء الدین ذکریا ملتانی کی درگاہ کے مرید تھے. ان کے فرزند مخدوم میاں سلیمان، شاہ عنایت رضوی کے ھمعصر اور ھم صحبت تھے (۲). اس سے معلوم ھوا کہ فقیر جرکس دسویں صدی ھجری میں گذرے ھیں، کیونکہ شاہ عنایت کی ولادت تقریباً سنہ ۱۰۳۰ھ اور سنہ ۱۰۳۵ھ کے درمیانی عرصہ میں ھوئی ھے (۳).

(۱۳) عثمان احسانی

بھاگ ناڑی (بلوچستان) کے باشندہ تھے. سنہ ۱۶۴۰ع میں لکھی تحصیل سکھر میں آکر آباد ھوگئے. ان کے سوانح حیات اور ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں ھوسکیں. ان کا مجموعۂ کلام "وطن نامہ" خستہ حالت میں، جسے دیمک چاٹ گئی تھی،

(۱، ۲) "دولہہ دریا خان" از ھدایت علی تارک.

(۳) "مبین شاہ عنایت کا کلام" از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، مقدمہ ص ۳۱.

"تذکرۂ لطفی" کے مصنف کی نظر سے گذرا تھا جو بارھویں صدی ھجری کا لکھا ھوا، اور کسی دوسرے نسخہ سے نقل کیا گیا تھا(۱). اس میں موت کا ذکر انتہائی پر اثر اور دردانگیز انداز میں کیا گیا ھے. ساخت کے اعتبار سے ان کے ابیات چار مصرعوں سے زیادہ پر مشتمل ھیں. لیکن مروج سندھی بیت کے برعکس قافیہ ھر مصرعہ کے آخر میں ھے. نمونہ کے طور پر ان کا ایک بیت درج ذیل ھے:-

ڳالھ، اڻانگي گور جي، ويھ م، ساروھي، ترس م، ويھ، تيار ٿي، سا ٿينڙا سنبھي، ھيءَ حد ھيبت جھڙي، ويندءِ گور ڳھي.	قبر کی بات بڑی دشوار ھے، غافل ھو کر مت بیٹھ، اور اسے یاد کرتا رہ، اے دوست! غفلت نہ کرنا، اچھی طرح سے تیار ھو کر بیٹھنا، گورستان بڑا ھیبتناک مقام ھے، قبر تجھے نگل جائیگی.
سپون وڇون سھسين ڏنڊڻ نانگن ساڻ نھي ڏنگي جان ڏنگن سان ويندءِ ڏيل ڏھي ڳري ويندءِ گور ۾ لڳين لحم لھي.(۲)	قبر بنی ھی سانپوں بچھوؤں اور کیڑوں مکوڑوں سے ھے، جب وہ کاٹینگے تو جسم لرز جائیگا، قبر میں تمھارے جسم کا گوشت گل سڑ کر الگ ھوجائیگا.

(۱۳) شاہ لطف اللہ قادری

پریالوہ (ضلع خیرپور) کے قرب و جوار کے باشندہ تھے. مریدوں کے اصرار پر نقل مکانی کرکے اگھم کوٹ میں جا کر اقامت گزیں ھوگئے. ان کی ولادت تقریباً سنہ ۱۰۲۰ھ (۱۶۱۱ع) میں ھوئی اور وفات تقریباً سنہ ۱۰۹۰ھ (۱۶۷۹ع) میں (۳). ان کی فارسی کی دو تصنیفات "تحفۃ السالکین" اور "منہاج المعرفت" کے نام سے

---

(۱) "تذکرہ لطفی" از لطف اللہ بدوی، ج ۱، طبع سوم، ص ۲۱۱.
(۲) تذکرہ لطفی، ص ۲۱۴.
(۳) "شاہ لطف اللہ قادری کا کلام" از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، ص ۱۱.

دستیاب ہوئی ہیں، جو تصوف میں ہیں۔ منہاج المعرفت میں فارسی
عبارات کے درمیان سندھی ابیات بھی ہیں جو تعداد میں بیس
سے زیادہ ہیں۔ ان کا ایک سندھی رسالہ بھی دستیاب ہوا ہے جس
میں بھی سندھی ابیات ہیں۔ محترم ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے ان
کے سندھی کلام کا مجموعہ مرتب کیا ہے جو سندھ یونیورسٹی کے
شعبۂ سندھالاجی نے شایع کیا ہے۔ اس میں ان کے ۳۵۷ ابیات ہیں۔
شاہ لطف اللہ قادری کا یہ رسالہ سندھی ادبی تاریخ میں سندھی
ابیات کا سب سے پہلا مجموعہ ہے۔

فن اور ہیئت کے اعتبار سے شاہ لطف اللہ قادری کے کلام میں
نئے تجربے نظر آتے ہیں۔ ترجیع یا تکرار پہلی بار انہی کے کلام
میں دیکھی گئی ہے۔ اس ساخت کے مطابق مسلسل ابیات میں الفاظ،
اصطلاحات اور فقرے بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ ترجیع یا تکرار کی
دو صورتیں ہیں۔ بیت کی ابتدا میں، اور آخری مصرع کے آخری
نصف میں۔ شاہ لطف اللہ کے کلام میں دونوں نمونے ہیں۔ ان کے
بعد شاہ لطیف نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔

شاہ لطف اللہ نے تشبیہات اور تمثیلات کے ذریعہ اپنے کلام
کو موثر اور اس کے مفہوم کو خوب اجاگر اور واضح کیا ہے۔ ان
کے کلام میں سندھ کی مشہور رومانی داستانوں سسئی پنہوں اور
عمر ماروی وغیرہ کی طرف بھی اشارے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ
انہوں نے "سامونڈی" (بحری مسافر)، "ناکھٹا" (نا خدا)، "جوگی"
اور "آدیسی" کی اصطلاحات استعمال کیں جو بعد میں آنے والے
شعرا کیلئے نمونہ بنگئیں۔

زبان و بیان کے اعتبار سے ان کا کلام سلیس اور دلکش ہے۔
خالص سندھی الفاظ کثرت سے استعمال کئے ہیں، جن میں سے اکثر
متروک ہوچکے ہیں۔

شاہ لطف اللہ کے ابیات میں قافیہ آخری مصرعہ کے درمیان میں بھی آتا ہے، اور احسان عثمانی کے ابیات کی طرح آخری مصرعہ کے آخر میں بھی۔ غرض کہ انہوں نے فن، بندش اور انداز بیان کے لحاظ سے نئے، دلکش اور کامیاب تجربے کئے ہیں جو آگے چلکر سندھی معیاری شاعری کیلئے سنگ بنیاد بنے۔ نمونہ کے طور پر ان کے چند ابیات پیش کئے جاتے ہیں :-

عقل آت اوچون ٽٺو، ڪا جا
ڏسي پت،
پسيو پرين ڄجي منجهيووڃي مت،
ان وائي پير پٺو آت ابتي پت،
نه ڪو ڳاچ نه ڳت، حيرت هنيو سڀ ڪو.

کوئی رمز دیکھکر عقل حیرت زدہ رہگئی، محبوب کا مزاج دیکھکر عقل دنگ رہجاتی ہے، اس دانائی کی راہ ہی اور ہے جو ظاہری عقل کے برعکس ہے، اس کا کوئی حد و حساب ہی نہیں ہے اس لئے سب کا دل حیران ہے۔

کهي ڏنو ڪا پڙين ڪو آڳاهون پنڌ
تنين منجهان آئيو ڳجهه، ڳجهائين ڳنڌ
سندو حيرت پنڌ آيو آڏو آديسين

سالکوں نے آگے جا کر کافی راہ طے کرلی، اثنائے راہ میں ان کو اسرار و عجائبات نظر آئے، اس طرح وہ ایسی راہ پر چل پڑے جو حیرتناک اور حیرت افزا ہے۔

سمنڊ ڪنيو پساه ڪوڙين موج اڀريا
ڪي اجهاسي اٿيا ان آهي پر اها
سي ئي ڪون و مڪان سي، سي ئي
سي ٿيا
الا انه بڪل شي محيط مڙيوئي دريا

بحر عمیق کو جوش آیا تو سینکڑوں موجیں اٹھیں، ان میں سے بعض موجیں بیٹھ گئیں، اور یہی انکی فطرت ہے، دراصل کون و مکان وہی تھیں اور وہی ذات بھی، بیشک اللہ ہر شے پر حاوی ہے اور سب کو گھیرا ڈالے ہوئے ہے، اس سے ثابت ہوا کہ اصل میں سب دریا ہی دریا ہے۔

سڪ تنهنجي سورين من ۾ ٻارئين مچ
روء ڪامي ته خمار ۾ عاشق ٿئا سچ

محبوب کی محبت نے عشاق کے دل میں آگ بھڑکائی ہے اس لئے اس خمار سے انکے چہرے تمتما رہے ہیں اور وہ اپنے امتحان میں سچے ثابت ہوئے ہیں۔

ادبي جائزہ

(۱) ارغون، ترخان اور مغل غیر ملکی حکمراں تھے اور انکی مادری اور تعلیمی زبان فارسی تھی۔ اس لئے انہوں نے فارسی زبان و ادب کی سرپرستی کی۔ سندھی زبان کی سرپرستی نہ تو حکومت کی طرف سے ہوئی اور نہ ہی علمی محفلوں میں اسے مناسب مقام دیا گیا۔ لہذا سندھی شاعری کی خاطر خواہ ترقی نہیں ہوسکی۔ اس کے باوجود بزرگوں اور درویشوں نے عوام تک اپنا پیغام پہنچانے کیلئے سندھی کو ذریعہ بنایا۔ لیکن ان کا تمام کلام قلمبند نہیں ہوسکا۔ جو تھوڑا بہت کتابوں میں محفوظ رہا، وہ بھی سموں اور ارغونوں کی لڑائیوں، محمود بکھری اور ترخانوں کی جنگوں، ھمایوں اور ارغونوں کی کشمکش، ترخانوں کے جور و جبر، پرتگالیوں کے خونیں حملوں اور مغلوں کی یلغاروں کی نذر ہو گیا، بچا کھچا علمی ذخیرہ نور محمد کلہوڑہ کے کتبخانہ کے ساتھ، نادر شاہ ایران لیگئے۔ اسی وجہ سے نہ تو اس دور کے تمام شعرا کا پتہ چلتا ہے اور نہ ہی ان کا پورا کلام دستیاب ہوتا ہے، اس کے باوجود اس دور کے آخری ایام کے شاعر شاہ لطف اللہ قادری کے کلام کا اچھا ذخیرہ ملا ہے۔

(۲) معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں کافی سندھی شاعری کی مقبول عام صنف تھی لیکن افسوس کہ اس کا کوئی نمونہ نہیں

مل سکا. البتہ آخری دور کے آخری شاعر شاہ عنایت رضوی کے رسالے میں وائی کے چند نمونے ملے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کافی اور وائی دراصل سندھی شاعری کی ایک ہی صنف کے دو نام تھے. قیاس یہ ہے کہ شمالی سندھ میں "کافی" مروج تھا اور لاڑ میں "وائی".

(۳) رومانی داستانوں مثلاً عمر مارئی، سسئی پنہوں، مومل رانو کو تمثیل کے طور پر شعر میں پیش کرنے کا رواج عام تھا، اور شاہ لطف اللہ قادری کی ایجاد کردہ صوفیانہ اصطلاحات "بحری مسافر"، "ناخدا"، "جوگی" اور "آدیسی" وغیرہ نے ان تمثیلی داستانوں کی اہمیت میں اور بھی اضافہ کیا.

(۴) اس دور میں دو اور تین سے زائد مصرعوں والے ابیات رائج ہوئے جن کے آخری مصرعہ کے درمیان میں قافیہ لایا گیا ہے. البتہ بعض ابیات کے آخری مصرعہ کے آخر میں بھی قافیہ نظر آتا ہے. عثمان احسانی کے تمام ابیات اسی قسم کے ہیں اور شاہ لطف اللہ قادری کے بہت کم.

(۵) ابیات میں ترجیع اور تکرار یعنی مسلسل ابیات میں بعض الفاظ اور فقروں کو دہرانے کا رواج پہلی بار شاہ لطف اللہ قادری کے کلام میں ملا ہے.

(۶) مضمون کے لحاظ سے اس دور کے شعرا کے کلام میں جہاں تصوف کا رنگ جھلکتا ہے، وہاں حسن و عشق اور ہجر و وصال کا ذکر بھی موجود ہے جس سے قدیم دور کے ابیات کے مقابلے میں اس دور کے ابیات میں رنگینی اور شگفتگی زیادہ آگئی ہے. صرف یہی نہیں، بلکہ اس دور کے شعرا کے کلام میں سندھ کے معاشی اور معاشرتی حالات کی عکاسی بھی نظر آتی ہے.

(۷) یوسف سہتہ کے حالات سے پتہ چلتا ھے کہ اس دور میں درویشوں کی درگاھوں پر سندھی کے شعرا اکٹھے ھوتے اور وھاں جو محفلیں جمتیں، ان میں اپنا کلام سناتے. ان محفلوں کو ابتدائی نوعیت کے مشاعروں کا نام دیا جاسکتا ھے.

(۸) زبان کے اعتبار سے اس دور کے شعرا کے کلام میں سندھی الفاظ کثرت سے استعمال ھوئے ھیں اور اس میں عربی و فارسی کے الفاظ کی آمیزش نہ ھونے کے برابر ھے. شاہ کریم کے تمام کلام میں عربی زبان کے صرف ۹ ۲ الفاظ اور ایک اصطلاح، اور فارسی زبان کے صرف آٹھہ الفاظ ھیں. یہی حال دیگر شعرا کے کلام کا ھے. یعنی انہوں نے خالص سندھی زبان استعمال کرنے کی کوشش کی ھے.

(۹) اس دور کی شاعری میں نعتیہ رنگ بھی موجود ھے. پیر محمد لکھوی کی شاعری نعتیہ رنگ میں رنگی ھوئی ھے. نیز شاہ عنایت رضوی کے متعدد ابیات حضور انور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ثنا گوئی اور ستائش پر مشتمل ھیں.

(۱۰) الف اشباع والی نظم میں ھر مصرعہ کے آخر میں "آ" بطور قافیہ آتا ھے. جس لفظ کے آخر میں الف نہیں ھوتا، اس میں قافیہ کی ضرورت پوری کرنے کیلئے الف بڑھایا جاتا ھے، مثلاً لفظ "سبب" کے ساتھہ "آ" لاحق کرکے اسے "سببا" بنایا جاتا ھے. یہ طرز اور یہ لہجہ عموماً ان نظموں میں دیکھا گیا ھے جو مذھبی رنگ کی حامل ھیں. اگرچہ اس قسم کی نظمیں سب سے پہلے پیر محمد لکھوی کے ھاں ملی ھیں، تاھم قیاس یہ ھے کہ اس زمانہ میں ایسی نظمیں کہنے کا رواج موجود تھا جو بعد میں بھی قائم رھا.

(١١) اس دور کی شاعری میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر بڑے دلگداز انداز میں کیا گیا ہے. عثمان احسانی کا تمام کلام اسی نوعیت کا ہے. یہ قنوطیت کا غلبہ اور مایوسی و نا امیدی کی کیفیت اس دور کے ناگفتہ بہ ملکی حالات کا نتیجہ ہے.

باب پنجم

کلہوڑہ دور (۱۷۱۸ع - ۱۷۸۳ع)

تاریخی پس منظر

کلہوڑوں کے جد امجد آدم شاہ کلہوڑہ پیری مریدی کا شغل کرتے تھے۔ خان خاناں کی استدعا پر انہوں نے ان کیلئے فتح کی دعا کی تھی، جس پر خان خاناں نے فتح کے بعد ان کو لاڑکانہ کے قریب "چانڈکی" پرگنہ میں ایک جاگیر عطا کی۔ اس کے بعد کلہوڑے سیاسی نقطۂ نگاہ سے مستحکم ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ مغل گورنر نے آدم شاہ کی سیاسی طاقت کو اپنے لئے خطرہ سمجھ کر ان کو قید کیا اور ملتان لیجاکر قتل کرادیا۔ ان کا انتقال سنہ ۱۵۹۳ء میں ہوا۔ ان کا مقبرہ سکھر میں ایک پہاڑی پر ہے جو "آدم شاہ کی ٹکری" (پہاڑی) کے نام سے مشہور ہے۔

رفتہ رفتہ کلہوڑے سیاسی حیثیت سے اور بھی زور پکڑ گئے۔ بکھر کے مغل گورنر نے انکی قوت کو ختم کرنے کی کوشش کی اور میاں نصیر محمد کلہوڑہ کو قید کرکے اورنگ زیب کے پاس دہلی بھیجدیا۔ کچھ عرصہ کے بعد میاں نصیر محمد اورنگ زیب کی قید سے بھاگ نکلے اور سکھر پہنچکر فوج جمع کی اور بکھر کے مغل گورنر میر یعقوب کو شکست دیدی۔ یہ سنکر شہزادہ معزالدین دہلی سے سکھر پہنچے۔ شہزادہ کی آمد سے پہلے میاں نصیر محمد کا انتقال ہوچکا تھا۔ ان کے فرزند میاں دین محمد نے اپنے چھوٹے بھائی میاں میر محمد کو شہزادہ کے استقبال کیلئے بکھر روانہ کیا۔

اس اثنا میں میاں دین محمد کے ایک مرید نے ماتھیلہ پر حملہ کرکے شہر کو لوٹ لیا۔ شہزادہ نے جو یہ سنا تو غصہ سے بے قابو ہو گئے اور میاں دین محمد نے راہ فرار اختیار کرنے میں مصلحت دیکھی۔

مغلوں کی طاقت کمزور ہو رہی تھی اور ہر طرف افراتفری پھیل چکی تھی۔ اس واقعہ سے فائدہ اٹھا کر کلہوڑوں کے چچازاد بھائیوں داؤد پوتوں نے مغل گورنر کی موجودگی ہی میں شکارپور کے پرگنہ پر قبضہ کرلیا اور سنہ ۱۰۲۶ھ (۱۶۱۷ع) میں شکارپور کا شہر تعمیر کرایا۔

مغلوں کی کمزوری دیکھکر میاں یارمحمد کلہوڑہ نے اپنی طاقت میں اور بھی اضافہ کیا اور شاہ عنایت شہید کے سر پر سودہ بازی کر کے حکمراں بن گیا۔ سندھ کے اس بزرگ درویش شاہ عنایت صوفی کی شہادت سنہ ۱۷۱۸ع میں واقع ہوئی۔ میاں یارمحمد نے شاہ عنایت کے ساتھ غداری کی تھی۔ اسی لئے شاہ شہید کو ان کے متعلق کہنا پڑا کہ:-

ڏونگري ڏني ڏاڙهي ڪوه ڪتي جو پڇ.

(میاں یارمحمد نے ڈاڑھی پر ہاتھ رکھکر مجھ سے وعدہ کیا تھا، لیکن وہ ڈاڑھی نہیں، کتے کی دم تھی)۔ یعنی میاں یارمحمد نے وعدہ کر کے اس کی خلاف ورزی کی۔ شاہ عنایت کی شہادت کے بعد میاں یارمحمد نے مغل سلطنت کی رضامندی حاصل کرلی اور انہیں "خدایار خاں" کا خطاب دیا گیا۔ میاں یارمحمد نے ۱۷۱۸ع میں انتقال کیا۔ انہوں نے تمام سندھ کو فتح کرلیا اور اس طرح سندھ میں کلہوڑوں کی خودمختار حکومت قائم ہوگئی۔

سنہ ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ع) میں نادرشاہ نے سندھ پر حملہ

کر کے سکھر اور شکارپور کے پرگنوں کو قندھار کی حکومت کے ساتھ ملادیا۔ نادرشاہ کے قتل کے بعد احمد شاہ ابدالی سنہ ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۴ع) میں سکھر آئے اور میاں نور محمد کلہوڑہ کچھ کی طرف بھاگ گئے۔ اس کے بعد سندھ افغانوں کے زیر نگیں آگئی۔ کلہوڑوں کے آخر دور میں مدد خان پٹھان سندھ پر چڑھ دوڑا اور قتل و غارتگری کا بازار خوب گرم کیا، جس سے سندھ اور اہل سندھ پر بڑے مصائب و آلام نازل ہوئے، اور "مدد" "گھوڑا ڑے گھوڑا" اور "گھل ڑے گھل" کی اصطلاحیں مروج ہوئیں جو مدد خان کے مظالم اور جبر و تشدد کے انمٹ آثار ہیں۔

ٹالپور، کلہوڑوں کی فوجی قوت تھے لیکن کلہوڑہ حکمران میاں سرفراز نے میر بہرام خان کو بے گناہ شہید کرایا جس پر ٹالپوروں نے ان کے خلاف بغاوت کی اور سنہ ۱۷۷۵ع میں ان کو معزول کر کے حیدرآباد کے قلعہ میں قید کردیا۔ اس کے بعد میاں عبدالنبی کو تخت پر بٹھایا لیکن وہ ظالم حکمران ثابت ہوئے اور میاں سرفراز کو بھی قتل کرایا اور ٹالپوروں کے بھی در پئے آزار ہوگئے۔ آخر میر فتح علی ٹالپور نے سنہ ۱۷۸۲ع میں ان کو شکست دیکر ٹالپوروں کی حکومت قائم کردی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کلہوڑوں کی حکومت صحیح معنوں میں سنہ ۱۷۱۹ع سے سنہ ۱۷۸۲ع تک قائم رہی۔

کلہوڑوں کی سازش سے شاہ عنایت کی شہادت کا دردناک حادثہ ہوا۔ تھر میں سوڈھوں نے شورشیں برپا کیں۔ نادرشاہ نے حملہ کیا۔ احمد شاہ ابدالی نے شکارپور کا علاقہ چھین لیا۔ مدد خان پٹھان نے خونریزی اور غارتگری کی اور آخر میں کلہوڑوں اور ٹالپوروں کے درمیان خانہ جنگی ہوئی۔ ان اندوھناک واقعات نے سندھ کا سکون و قرار غارت کردیا۔

کلہوڑوں نے حیدرآباد کو دارالحکومت بنایا لیکن اس کے باوجود علم کا سب سے بڑا مرکز ٹھٹہ ہی رہا. علماء سیاسی شکست و ریخت اور فوجی تاخت و تاراج سے بے نیاز ہو کر علم اور دین کی خدمت میں مصروف رہے اور تعلیم و تدریس کے سلسلہ کو جاری رکھا. ارغونوں کے عہد میں فارسی کو اہمیت حاصل ہوچکی تھی. کلہوڑوں کے دور میں بھی فارسی کی وہی حیثیت قائم رہی، جس سے "پارسی گھوڑے چاڑھسی" (فارسی تجھے گھوڑے پر سوار کریگی) کا محاورہ مروج ہوا. ان حالات کے ہوتے ہوئے بھی سندھی علما نے اہل سندھ کو دینی مسائل سکھانے کیلئے سندھی میں الف اشباع کے قافیہ کے ساتھ، متعدد کتابیں تصنیف کیں اور انہیں مکتبوں اور مدرسوں میں پڑھانے لگے. یہ رواج ابتک موجود ہے اور بعض مکتبوں میں یہ کتابیں ابتک پڑھائی جاتی ہیں.

مخدوم محمد ھاشم ٹھٹوی کی کوششوں اور سختی کی وجہ سے مسلمانوں خواہ ہندوؤں کے رہن سہن میں تبدیلی پیدا ہوئی اور سندھ کی تہذیب نے ایک نیا رنگ و روپ اختیار کیا. اس زمانہ میں ہندوؤں میں دھوتی باندھنے کا رواج کم ہوا اور پتلون پہننے کا رواج پیدا ہوا.

اس دور میں سندھی شاعری نے بھی بڑی ترقی کی. ذیل میں اس دور کے شعرا کا حال اور ان کا کلام پیش کیا جاتا ہے:-

مذہبی شاعری

اس دور میں سندھ کے مکتبوں میں دینی تعلیم سندھی زبان میں دینے کا رواج موجود تھا اس لئے متعدد دینی کتابیں سندھی میں تصنیف کی گئیں. چونکہ سندھی نثر لکھنے کا رواج کم تھا

لہذا یہ تمام کتابیں الف اشباع کے قافیہ کے ساتھہ سندھی نظم میں لکھی گئیں، جسے "کبت" کی ایک قسم کہا جاسکتا ہے. ان کتابوں کے نظم میں لکھنے کی ایک وجہ اور بھی ہے کہ نثر کی نسبت نظم جلدی ذہن نشیں ہوجاتی ہے اور دیر تک ذہن میں محفوظ رہتی ہے.

طویل ابیات کو "کبت" کہا جاتا ہے. ان منظوم مذہبی کتابوں کی بنا بھی کبتوں پر رکھی گئی. بعض کبتوں کے آخر میں صحیح قافیہ لایا گیا، لیکن زیادہ تر ان کے آخر میں الف بڑھا کر ہی قافیہ بنایا گیا. یہی الف اشباع ہے، اور اسی کو حرف قافیہ بنا کر اس پر قافیہ کی بنیاد رکھی جاتی ہے. اس قسم کی کبتیں یا نظمیں کہنے کا رواج پہلے سے موجود تھا. مخدوم پیر محمد لکھوی پہلے شاعر ہیں جن کا اس قسم کا کلام دستیاب ہوا ہے اور ان کا ذکر اوپر آچکا ہے.

مذہبی مضامین پر مشتمل نظموں کے متعلق بعض سخن فہموں کا خیال ہے کہ یہ منظوم کلام نہیں ہے بلکہ نثر ہے. بعض کا قیاس ہے کہ یہ آزاد نظم کا ایک نمونہ ہیں. لیکن دراصل ان کو نظم کہنا ہی زیادہ صحیح ہے، کیونکہ ان میں روانی بھی ہے اور الحان بھی، اور نازک خیالی کے ساتھہ تجنیس حرفی کا استعمال بھی. ان مذہبی کتابوں میں سے چند مصرعے نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں، جن سے معلوم ہوگا کہ اگرچہ ان کا مضمون خالص مذہبی ہے تاہم زبان و بیان کے محاسن اور شعریت سے خالی نہیں ہے:-

(۱) سندھی املا:- ڏلا ھٿ ڀلن جي رڙھي راہ ڀون (مخدوم ابوالحسن)

اردو املا:- ڈھلا ہٹھہ بھلن جے رڑھی راہ بھون

یعنی برے لوگ بھلے لوگوں کے نقش قدم پر چلکر راہ راست پر آجاتے ھیں.

(۲) سندھی املا:- بقا ناہ بلاد کي، دنیا ناہ دوام (مخدوم محمد ھاشم
اجل ٹواوتون کري، تي قریب قیام ٹھٹوی)

اردو املا:- بقا ناہ بلاد کھے، دنیا ناہ دوام
اجل تھواوتوں کرے، تھی قریب قیام

یعنی یہ شہر اور ملک ھمیشہ نہیں رھینگے اور نہ یہ دنیا ھمیشہ رھیگی. موت جھپٹ رھی ھے اور قیامت قریب ھے.

(۳) سندھی املا:- ڀڄاڻي پيغمبرن، محب سندو مولا (مخدوم عبداللہ)
سونهن سڀني مرسلن، عالم اماما

اردو املا:- بجانی پیغمبرن، محب سندو مولا
سونھں سبھنی مرسلن، عالم اماما

یعنی حضور انور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ھیں. اللہ کے محبوب، تمام رسولوں کے زیب و زینت اور سارے عالم کے امام.

اس قسم کی سب سے پہلی مذھبی کتاب مخدوم ابوالحسن کی تصنیفات میں سے دستیاب ھوئی ھے.

مخدوم ابوالحسن

ٹھٹہ کے برگزیدہ عالم تھے. سنہ ۱۶۶۱ع میں متولد ھوئے. اس زمانہ میں حضرت سید عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں سے شیخ یوسف الدین بغداد سے ٹھٹہ تشریف لائے. ان کی تبلیغ سے متعدد ھندوؤں نے اسلام قبول کیا. انھیں اسلام کے اصول اور مسائل سکھانے کی ضرورت ھوئی. اسی ضرورت کے پیش نظر مخدوم ابوالحسن نے عربی رسم الخط میں کچھہ اضافہ کر کے سندھی رسم الخط تیار کیا، اور اسی رسم الخط میں الف اشباع کے قافیہ پر مشتمل

"مقدمہ الصلواۃ" کے نام سے ایک ضخیم کتاب سنہ ۱۷۰۰ع میں تصنیف کی، جس میں نماز سے متعلق تمام مسائل بیان کئے ھیں۔

"مقدمہ الصلواۃ" کو سندھی ادب میں بڑی اھمیت حاصل ھے، کیونکہ یہ پہلی مکمل منظوم کتاب ھے، جس میں نماز کے بارے میں تمام باتیں ترتیب وار سمجھائی گئی ھیں۔ بعد میں آنے والے علما نے اسی طرز پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ مقدمہ الصلواۃ میں اس زمانہ کی مروج زبان استعمال کی گئی ھے اور ایسے متعدد سندھی الفاظ استعمال کئے گئے ھیں جو اس وقت خود لاڑی محاورے میں بھی متروک ھیں۔ مقدمہ الصلواۃ کو عموماً "ابوالحسن کی سندھی" کہا جاتا ھے۔ فنی اعتبار سے اس میں الف اشباع والے طویل ابیات کے علاوہ صحیح اور مروج قافیہ پر مشتمل طویل ابیات بھی ھیں، جنھیں کبت کہتے ھیں۔ بعض مقامات پر دو مصرعوں کے دوھے بھی ھیں۔ مثلاً:-

سندھی املا:- ساراھجي سو ڏڻي سندو جنھن فرمان
مڃيو مڙني مؤمنن آنداڻون ايمان

اردو املا: ساراھجے سو دھنی سندو جنھن فرمان
مجیو مڑنی موٗمنن آنداؤں ایمان

یعنی اس مالک کی حمد کرنی چاھئے، جس کا حکم تمام مومنوں نے قبول کیا اور ایمان لے آئے۔

الف اشباع پر مشتمل نظم میں سے ایک مثال:-

سندھی املا: چوٿون رکوع، سجدي ۾ کرڻ ويرم کا
قدر تسبيح ھيکڙي، توڙي ٽي پيرا

اردو املا: چوتھوں رکوع، سجدہ میں کرن ویرم کا
قدر تسبیح ھیکڑی، توڑے ٹے پھیرا

یعنی نماز کے ارکان میں چوتھا فرض یہ ہے کہ رکوع اور سجدہ کے درمیان دیر نہ کرنی چاہیئے. ایک تسبیح (سبحان ربی العظیم یا سبحان ربی الاعلیٰ) کے برابر خواہ تین تسبیح کے برابر (یہ زیادہ سے زیادہ ہے).

صحیح اور مروج قافیہ کی مثال:-

ابوجھن ابوجھیون، سجاڻ سنیون کن
ڏلا ٻٽ ڀلن جي رڙھي راہ ھون
عاصي ٿيءِ صالحن سيٺي شال چڙن
مھند جن جي مصطفیٰ مرکن مرسلن

یعنی نادانوں کی نادانی کی اصلاح دانا کرتے ہیں. برے لوگ بھلے لوگوں کی متابعت کر کے سیدھے راستہ پر آجاتے ہیں. خدا کرے نیک لوگوں کے طفیل گنہگار بھی نجات حاصل کریں. انکے پیشوا محمد مصطفیٰ ہونگے جو پیغمبروں کے سردار ہیں.

مخدوم ضیاء الدین

ٹھٹہ کے بہت بڑے عالم تھے، اور سہروردی مسلک کے پیشوا حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی کی اولاد میں سے. سنہ ۱۰۹۰ ھ (۱۶۷۹ ع) میں متولد ہوئے اور سنہ ۱۱۷۱ ھ (۱۷۵۷ ع) میں رحلت فرمائی. ٹھٹہ کے مشہور عالم مخدوم عنایت سے تعلیم حاصل کی تھی. تحصیل علم کے بعد مدرسہ قائم کیا. متعدد طلبا ان کے مدرسہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے. سندھ کے مشہور بزرگ اور صاحب کمال عالم و فاضل مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی بھی انھی کے سرچشمۂ علم و فضل سے سیراب ہوئے.

مخدوم ضیاءالدین نے مخدوم ابوالحسن کے طرز پر سندھی میں کتابیں تصنیف کیں، جن کو "ضیاءالدین کی سندھی" کا نام

دیا گیا. انکی کتابوں میں وضو اور نماز کے مسائل کے علاوہ دین اسلام کے دیگر مسائل بھی بیان کئے گئے ھیں.

"مخدوم ضیاءالدین کی سندھی" نسبتاً اھم اور بامقصد تصنیف ھے. لیکن فنی اعتبار سے انکے کلام میں اتنی پختگی نہیں ھے. انھوں نے اس وقت کی مروج زبان استعمال کی ھے اور فن اور ساخت کے لحاظ سے مخدوم ابوالحسن کا تتبع کیا ھے. مثال کے طور پر ان کی کتاب سے چند ابیات پیش کئے جاتے ھیں:-

فرض آهي ماءُ پيءُ تي سعي سوڌي پت	ماں باپ کا فرض ھے کہ بچوں کو کوشش کر کے مکتب میں بھیجدیں
موڪلي مڪتب ۾ صغير وڏي سٽ	تا کہ ان کی اچھی تربیت ھو اور تعلیم حاصل کر کے سچے مومن
جئين تابع ٿئي طبيعت جو مؤمن وڏي مت	بنجائیں.
راتو ڏينهن ٻالڪ ڪري نماز پرت	بچے دن رات نماز سے دلچسپی رکھیں، اور وضو کا خیال کریں.
وضوءَ جي وجود ۾ پڇي ڪري پرت	

الف اشباع کی مثال:-

جي نہ رسين امام کي تہ ڇڏج سنتا	اگر تو امام کا ساتھ نہ دے سکے (نماز با جماعت میں) تو
ڪج اقتدا امام سين فرض ڪي رسجا	سنت کو ترک کردے، امام کے پیچھے کھڑا ھو جا اور فرض ادا کر. فرض کے علاوہ دیگر
ري فرض سنت ڪي قضا ناهہ روا	نمازوں سنت وغیرہ کی قضا ضروری نہیں ھے. تمام علما نے
ڏني انهيءَ قول تي عالمن فتوا	اسی پر فتویٰ دیا ھے یعنی یہ متفق علیہ قول ھے.

مخدوم محمد ھاشم ٹھٹوی

ٹھٹہ کے انتہائی برگزیدہ، جید اور بہت ھی بڑے متبحر عالم تھے. ان کا نام آج تک عـوام اور خواص میں یکساں مشہور و معروف ھے. سنہ ۱۶۶۹ع میں میرپور بٹھورہ ضلع ٹھٹہ میں متولد ھوئے. والد ماجد کا نام عبدالغفور تھا. ابتدائی تعلیم انھی سے حاصل کی. مزید تعلیم کے لئے ٹھٹہ گئے اور مولوی محمد سعید اور مخدوم ضیاءالدین کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہہ کیا، اور وھیں سے فارغ التحصیل ھوئے.

ٹھٹہ میں متعدد سماجی برائیاں اور خلاف شرع باتیں دیکھکر تڑپ اٹھے اور ان کی بیخ کنی کیلئے جدوجہد شروع کردی. اس سلسلہ میں انہوں نے میاں غلام شاہ کلہوڑہ، نادرشاہ اور احمد شاہ ابدالی کو بھی خطوط لکھے. میاں غلام شاہ نے انہیں پروانہ لکھکر دیا اور تمام افسران کے نام ھدایات جاری کردیں کہ وہ مخدوم صاحب کے ساتھ، ان کی اس جدوجہد میں مکمل تعاون کریں. اس اھتمام و انتظام کے بعد مخدوم صاحب نے اپنی کوششیں تیز کردیں اور تمام برائیوں کو ختم کرکے دم لیا. صرف یہی نہیں بلکہ ان کی کوششوں سے ھندوؤں کے رھن سہن میں بھی کافی تبدیلی آگئی. ھندوؤں کو سختی کے ساتھ ممانعت کردی کہ وہ دکان پر دھوتی باندھکر نہ بیٹھیں کیونکہ اس میں عریانی کا امکان ھے. اس طرح ھندوؤں میں دھوتی باندھنے کا رواج بھی کم ھوا اور دیگر متعدد سماجی اصلاحات بھی ھوئیں. مخدوم صاحب کی انھی کوششوں کی وجہ سے سندھی ثقافت کی تطہیر بھی ھوئی اور ازسرنو تعمیر بھی.

مخدوم صاحب، علم و عمل کے مجسمہ تھے۔ دنیائے اسلام نے ان کی علمی فضیلت اور بلند ترین شخصیت کو تسلیم کیا تھا۔ وہ مصلح بھی تھے، بہت بڑے مقرر بھی اور بیشمار کتابوں کے مصنف بھی۔ سنہ ۱۱۳۵ھ (۱۷۲۲ع) میں مدینہ منورہ گئے تو ان کے علم و فضل کی وجہ سے انکی بڑی تعظیم و تکریم کی گئی۔ حج سے واپسی پر سنہ ۱۱۳۷ھ (۱۷۲۴ع) میں سورت بندر میں نقش بندی مسلک کے ایک بزرگ سید محمد سعیداللہ کے مرید ہوئے۔ وطن واپس آنے کے بعد ٹھٹہ میں ٹھیر گئے اور وہیں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ تقریر و تحریر کے ذریعہ خواہ عملی طور پر دین کی بڑی خدمات انجام دیں۔ ۶ رجب سنہ ۱۱۷۴ھ (۱۷۶۰ع) کو رحلت فرمائی۔ ان کا مزار مکلی پر ہے۔

سفر حج کے موقعہ پر جب ان کے تعلقات حرمین شریفین کے علما سے استوار ہوئے اور وہ مخدوم صاحب کے علمی تبحر، امور دین میں تحقیق و تدقیق، ذہانت و فطانت اور اصابت رائے سے اچھی طرح آگاہ ہوگئے تو انہیں "نعمان ثانی" کے لقب سے یاد کرنے لگے اور اہم ترین مسائل میں انہی سے فتویٰ منگواکر اس پر عمل کرتے۔

مخدوم صاحب نے عربی، فارسی اور سندھی زبانوں میں ڈیڑھ سو کتابیں تصنیف کیں۔ انکی تصنیفات علمی لحاظ سے اسقدر وقعت و اہمیت رکھتی ہیں کہ انکی عربی کی کتابیں جامع ازہر میں پڑھائی جاتی تھیں اور ابتک پڑھائی جاتی ہیں۔

مخدوم صاحب کی کتابیں "مخدوم ابوالحسن کی سندھی" کے طرز پر ہیں۔ البتہ بعض کتابوں میں مروج ابیات اور طویل ابیات

یعنی کبتیں بھی ہیں، جن میں دلکشی، رنگینی اور روانی ہے.
سندھی میں ان کی حسب ذیل کتابیں اور رسالے مشہور ہیں:-
(۱) فرائض الاسلام (۲) ذبح شکار (۳) زادالفقیر (۴) قوت العاشقین

مخدوم صاحب عربی اور فارسی زبانوں کے بہت بڑے عالم تھے.
جو کتابیں انہوں نے طالب العلمی کے زمانہ میں پڑھی تھیں اور تحصیل علم کے بعد روزانہ پڑھاتے تھے وہ عربی اور فارسی میں تھیں، لہذا ان زبانوں سے ان کا گھرا تعلق تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی سندھی کی تصنیفات میں خالص سندھی زبان استعمال کی ہے. اسلام نے ہمارے اوپر جو فرائض عائد کئے ہیں، وہ انہوں نے "فرائض الاسلام" میں نہایت ھی وضاحت کے ساتھہ سمجھائے ہیں۔ "ذبح شکار" شکار کے جانوروں کو ذبح کرنے سے متعلق ہے.
لیکن اس میں پرندوں اور چرندوں کے متعلق بھی کافی معلومات ہیں. "زادالفقیر" میں روزہ کی اہمیت اور اس کی شرعی حیثیت پر بحث کی گئی ہے. "قوت العاشقین" میں حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا ہے اور حضور کے معجزات انتہائی محبت و عقیدت کے ساتھہ بیان کئے گئے ہیں. علمی لحاظ سے مخدوم صاحب کی تصنیفات کو بڑی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ ہر بات تحقیق کے بعد پیش کی گئی ہے اور اختلافی امور میں اقوال مرجح سے استناد کیا گیا ہے.

فن اور ساخت کے لحاظ سے فرائض الاسلام اور قوت العاشقین الف اشباع والی نظم میں ہیں. فرائض الاسلام کی نظم میں سادگی اور بے ساختگی ہے لیکن قوت العاشقین میں رنگینی، دلکشی اور اثر انگیزی ہے. فرائض الاسلام کی نسبت زادالفقیر کی نظم میں شیرینی

بھی ہے اور پختگی بھی. اس میں صحیح اور مروج قافیہ کے ساتھ، طویل ابیات ہیں، جن میں قافیہ ہر مصرعہ کے آخر میں ہے. شیرینی اور پختگی کے علاوہ اس کتاب میں صنائع و بدائع کا استعمال بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ، کیا گیا ہے. ذبح شکار کے متعدد ابیات میں بھی صحیح اور مروج قافیہ لایا گیا ہے. اس کے باوجود ان میں سلاست اور روانی ہے. مخدوم صاحب کی مختلف کتابوں میں سے نمونہ کے طور پر چند ابیات پیش کئے جاتے ہیں:-

فرائض الاسلام

ايمان بالله تعالیٰ جا چوراسي فرض ٿيا
سڀ ياد رکو تن کي هنيين منجهارا
پهريون فرض ويساه وجود کري مولا
ٻيو ايمان ان کري ته آهي واجب الوجودا
ٽيون ايمان ان کري ته آهي هير موجودا
چوٿون ته هر موجود مرن ڏٺي آڳاٽو انها
هن جو علم عظيم آهي هميشا

اللہ تعالیٰ پر ایمان کے سلسلہ میں ۸۴ باتیں فرض ہیں. ان کو سنکر یاد رکھئے. پہلا فرض یہ ہے کہ اس کے وجود پر یقین ہو. دوسرا فرض یہ ہے کہ اس کے وجود کو ضروری سمجھا جائے. تیسرا فرض یہ ہے کہ اس کو ہر وقت موجود سمجھا جائے. چوتھا فرض یہ ہے کہ، وہ ہر چیز سے پہلے موجود تھا. اس کا علم عظیم، وسیع اور ہمیشہ ہے.

زاد الفقير

بقا ناه بلاد کي دنيا ناه دوام
اجل ٿو اوتون کري ٿي قريب قيام
ثمر سندي ساٿيا کريو تات تمام
کريو ياد کريم کي سنجهي صبح شام

یہ شہر اور ملک ہمیشہ نہیں رہینگے اور نہ ہی دنیا ہمیشہ رہیگی. موت جھپٹ رہی ہے اور قیامت قریب ہے، اے دوست

مجڻ ويسار اوهو آهيو منجھ اسلام
کهو کلمو صدق سين مٺي محمد جام

توشہ آخرت کی فکر کر اور اللہ تعالیٰ کو دن رات اور صبح شام یاد کرتا رہ، مبادا غافل ہوجاؤ، اسلام پر قائم رہو، حضور محمد مصطفیٰ پر صدق دل سے کلمہ پڑھا کرو۔

مولوی عبدالخالق

ٹھٹہ کے باشندہ تھے اور مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی کے شاگرد اور مرید. تحصیل علم کے بعد مخدوم صاحب کی درسگاہ میں نائب معلم ہوئے. انکی ولادت اور وفات کے سن معلوم نہیں ہوسکے. سنہ ۱۱۵۷ھ (۱۷۴۴ع) میں "مطلوب المومنین" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جسے مخدوم محمد ہاشم نے اصلاح کے بعد مکتبوں کے لئے منظور کیا. اس کتاب میں مصنف نے اصلاح عمل و اخلاق کی تعلیم دی ہے اور ہر بات میں قرآن مجید و احادیث نبوی سے استناد و استدلال کیا ہے. کتاب منظوم ہے. فنی لحاظ سے نظم میں بڑی پختگی ہے اور شگفتگی بھی. زیادہ تر طویل ابیات ہیں اور صحیح اور مروج قافیہ کے ساتھ. نمونہ کے طور پر ایک بیت پیش کیا جاتا ہے.

آهي عرض عالمن ڏانهن مولا
کيا مليح
ته ڪنان نظر ڪرم جي ساري
ڪن صحيح
منجھ تحقيق مسئلي جي مون
پڻ وس ڪيو

علما سے عرض ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے عزت بخشی ہے، کہ اس کتاب کی ازراہ کرم اصلاح فرمائیں. میں نے مسائل کی تحقیق کے سلسلہ میں پوری کوشش کی ہے،

ہر انسان انھيءَ حال سين آهي
نسيان پريو
جڏهن نسخو هن ناقص جو اچي
تمام ٿيو
تڏهن منجهه خدمت مرشد پنهنجي
وٺي آءٌ ويو
جو عارف، عالم، كامل، زاهد
زماني جو
حاجي محمد هاشم نالو جنهنجو
مولوي مشهور كيو
راتو ڏينهان رحمت رب جي شال
شامل مٿيين هوءِ
سين اهل اولاد سندن ۽ مڙن كٽنبوءِ
كري ستر پنهي جهانن ۾ سائين
سپاجهو
تان منجهس پنهنجي مهر سين ان
ٻڻ نظر كيو (۱)

لیکن انسان خطا اور نسیان کا پتلا ہے. جب یہ کتاب اختتام کو پہنچی تو میں اسے اپنے مرشد کی خدمت میں لے گیا. جو اس دور کے بڑے عالم، عارف، کامل، زاہد ہیں اور مولوی حاجی محمد ہاشم کے نام سے مشہور ہیں. ان پر دن رات اللہ کی بیشمار رحمت ہو، اور ان کے اہل و عیال پر اور ان کے تمام دوستوں پر بھی. اللہ رحیم و کریم دونوں جہان میں ان کی پردہ پوشی کرے. انہوں نے مہربانی فرما کر اس کتاب کی اصلاح کی ہے.

مولوی محمد حسین

مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی کے ہمعصر تھے. ان کے حالات زندگی معلوم نہیں ہوسکے. سنہ ۱۱۷۷ ھ (۱۷۶۳ ع) میں "قصص الانبیاء" کا فارسی سے سندھی نظم میں ترجمہ کیا، جو تمام الف اشباع کے قافیہ پر مشتمل ہے. زبان وہی استعمال کی گئی ہے جو مخدوم ابوالحسن اور مخدوم محمد ہاشم کی ہے. نظم کا نمونہ درج ذیل ہے:-

(۱) یہ مثنوی ہے، طویل ابیات نہیں ہیں. پیش کردہ نمونہ ایک بیت نہیں، بلکہ مثنوی کے چھ بیت ہیں (مترجم).

خالق مکیون خبرون سچي سید ڈانھن	اللہ تعالیٰ نے سچے سید کے پاس خبریں بھیجیں، جنھیں ان پڑھ، عوام نہیں سمجھتے۔ تاہم علماء وہ خبریں ان تک پہنچاتے ھی رھتے ھیں۔ تب میرے دل میں یہ خیال پیدا ھوا کہ انبیائے کرام کے قصے لکھکر ظاھر کروں اور انھیں سلیس سندھی میں بیان کردوں۔
ہر کین سمجھن تن کي جي اھي عواما	
مگر خبرون ڏین تن کي جي سگھورا علما	
تڏھن ھنئین ہم حسین جي ھي آیو خیالا	
تہ لکي کریان پڌرا قصا نبین جا	
سنڌي والي سھکا کریان بیانا	

مخدوم محمد ابراھیم بھٹی

ھالا پرانہ کے بھٹی بزرگوں میں سے تھے اور مخدوم عبدالرؤف بھٹی کے بھائی، سترھویں صدی عیسوی کے آخر میں گذرے ھیں۔ انھوں نے بھی سندھی زبان میں ایک کتاب تصنیف کی، جسے "محمد ابراھیم کی سندھی" کہا جاتا ھے۔ ان کی نظم کی ساخت ویسی ھی ھے، جیسی مخدوم محمد ھاشم کی "زادالفقیر" کی۔

مخدوم عبدالرحیم گرھوڑی

منگریہ قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ والد ماجد کا اسم گرامی سعداللہ تھا۔ سنہ ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ع) میں "واڑ" نامی گاؤں میں متولد ھوئے جو تحصیل کھپرہ ضلع سانگھڑ میں ھے۔ سنہ ۱۱۹۲ھ (۱۱۷۸ع) میں تھرپارکر کے ایک بتخانہ کے پجاریوں کے خلاف جہاد کرتے ھوئے جام شہادت نوش کیا۔ آخری ایام میں "گرھوڑ" میں اقامت گزیں ھوئے۔ ان کا مزار بھی گرھوڑ میں ھے۔ اپنے زمانے کے بڑے عالم و فاضل تھے۔ اگرچہ غیرمعمولی علم و فضل

کے صاحب تھے، تاہم صرف کتابی علم پر تکیہ نہ کرتے، بلکہ عقل سلیم، فراست ایمانی اور اجتہاد سے کام لیتے تھے. ابتدا میں اپنے علم پر بڑا فخر و ناز کرتے اور درویشوں کا مذاق اڑاتے تھے. لیکن سلطان الاولیاء حضرت خواجہ محمد زمان لنواری والے سے متاثر ہوئے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے خرقۂ خلافت پہنا. ان کے سندھی کلام کے علاوہ جو اشاعت پذیر ہوچکا ہے، حسب ذیل عربی اور فارسی کی تصنیفات بھی موجود ہیں:-

۱- "فتح الفضل" (عربی)، ۲- "شرح ابیات سندھی" (عربی)، ۳- "مکتوبات" (فارسی)، ۴- "رسالہ گل نما" (فارسی).

فتح الفضل میں اپنے پیر طریقت حضرت سلطان الاولیا کے اقوال کی عربی میں تشریح کی ہے. اور "شرح ابیات سندھی" میں ان کے ابیات کی. "مکتوبات" میں حضرت امام احمد ربانی مجدد الف ثانی کے مکتوبات کا خلاصہ ہے. رسالہ گل نما ان کی ایک مثنوی ہے جس میں اپنے پیر طریقت کے فرزند ارجمند محبوب الصمد خواجہ گل محمد کی مدح ہے.

گرھوڑی کا سندھی کلام مروجہ ابیات کی صورت میں بھی ہے اور الف اشباع کے قافیہ میں بھی. معنوی اعتبار سے ان کا کلام بہت گہرا ہے، جس میں تصوف کے اسرار و رموز، قرآن مجید کی مختلف سورتوں کی تفسیر، فرض، سنت، عقائد، ایمان، ترک اور حقیقت محمدی پر نہایت ہی وضاحت کے ساتھ اور فلسفیانہ رنگ میں بحث کی گئی ہے. خاص طور پر ان کی نظم "حقیقت محمدی" ایک بے مثال اور لاجواب شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے. اس میں حقیقت محمدی پر بحث کرتے ہوئے نور محمدی، نور، بشر، عقل اور دیگر متعلقہ موضوعات پر انتہائی وضاحت سے روشنی ڈالی گئی

ہے. بحث اسقدر معقول اور مدللؒ ہے کہ لامحالہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان سے پیشتر کسی بھی ظاہری اور باطنی علوم کے صاحب نے ان مسائل پر ایسی بحث نہیں کی ہے. اس کے علاوہ ادبی اعتبار سے ان کی نظم کا درجہ بہت بلند ہے.

گرھوڑی صاحب نے سندھی ابیات میں تصوف کے جو اسرار نہانی بیان کئے ھیں، ان کے مفہوم و معنی میں اسقدر گہرائی ہے کہ پڑھنے والے کو جب تک مسائل تصوف پر مکمل عبور حاصل نہ ھو، اس وقت تک وہ ان کو اچھی طرح سے سمجھہ نہیں سکتا. انکے کلام کا انتخاب درج ذیل ہے:-

اصل مڙني ماھيتن ماھيت محبوبا
آگو چؤ م انکي، مکي مخلوقا
ملک ماگ نہ ھوتجي پريون پنيارا
مور نہ ملک ۾ سيد شريکا
پدرو پدمن ۾ تني عدد مور نہ آ
حسن جوھر ھيکڙو، کثرت
جاء نہ کا

تمام ماھیتوں کی میرے محبوب کی ماھیت ہے انہیں خدا نہ کہئیے، لیکن مخلوق بھی نہ کہئیے. فرشتے انکے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے، اور پریاں ان کے دروازہ کی بھکاری ھیں. دنیا میں ان کا قطعاً کوئی شریک نہیں ہے. وہ پدموں میں بھی ظاھر اور ممتاز ھیں، بلکہ تعداد و اعداد کا حساب بالکل ہے ھی نہیں. ان کو جو حسن عطا ھوا ہے، وہ غیر منقسم جوھر ہے یعنی جزءٌ لایتجزیٰ، وھاں کثرت کی کوئی گنجائش نہیں ہے.

نام جھجھائي جوت ۾ توڙي
ڏہ لک تشي ڏيا

سرور آخر صورتين مھڙ منجھ، معنا
اصل عالم جو ہرين علت ايجادا
آدم ولد ان جو، توڙي والد آ
والد آھ وٹ جيئن ميوو مولودا
اول الفکر آخرالعمل ہرين پارا ھا
پاٹان سونھن موں ہرين پيا سب
ان سببا
نرمل نوري پاڻ ۾ ہين نور اِتا

دس لاکھ دیئے جلائے جائیں تو بھی ان کی روشنی ان کے حسن کے آگے ماند ہے۔ ہمارے سردار بظاہر آخر میں ہیں لیکن دراصل سب سے اول ہیں۔ اس عالم کے وجود میں آنے کی بنیادی وجہ اور علت العلل وہی ہیں۔ آدم اگرچہ باپ ہیں لیکن حقیقت میں ان کے بیٹے ہیں۔ باپ (آدم) درخت کی طرح ہیں اور بیٹے (میرے محبوب) اس کے پھل کی طرح۔ اگر محبوب کی ماہیت کو سمجھنا ہو تو "اول الفکر، آخر العمل" پر غـور کیجئے (یعنی تخلیق کائنات کے وقت، بلکہ ازل اور قدم میں مشیت ایزدی کو انہی کی تخلیق کی فکر تھی لیکن یہ بھی مصلحت ایزدی ہی تھی کہ وہ بظاہر بعد میں ظہور پذیر ہوئے)۔ میرے محبوب کا حسن، ان کا ذاتی اور اصل حسن ہے دوسروں کو جو حسن عطا ہوا ہے وہ انہی کے طفیل ہے۔ میرے محبوب سراپا نور ہیں، دوسروں کو انہی کے نور سے ایک حصہ عطا ہوا ہے۔

سڀ سونهن شفيع جي ٻين هوت هٿا
مگر محمد چام کان ڪي حسن
هٿ ڪندا

حقيقت حبيب جي ٻسندي پر ٿيا
ماهيت محمد شاه جي اهڙي عجيبا
صلحي ساڻس سک ۾ ٻر ٻر ٻين لاء
ملڪن آدم مڃيو سيد جي سببا
ٻيڙي طوفان نڪي نرمل جي نظرا
سڀ دور دوستن جي درسن داڻودا
شوڪت سليمان ڪي نوريءَ جي نظرا
قدرت قريبن جي قيرءِ و فرعونا

اصل حسن و جمال شفیع المذنبین کا ہے اور دوسروں کو ان کے ہاتھ سے ملا ہے. دیگر لوگ بھی شہنشاہ کونین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے حسن حاصل کرینگے. وہ میرے محبوب کی حقیقت کو سمجھ کر مطمئن ہو چکے ہیں. محمد مصطفیٰ کی ماھیت ایسی ہی عجیب ہے. جن لوگوں کی ان سے صلح ہے وہ خوش و خرم ہیں اور جن کی صلح نہیں ہے وہ آگ میں جل رہے ہیں. فرشتوں نے حضرت آدم کو انہی کی وجہ سے تسلیم کیا تھا. حضرت نوح کی کشتی انہی کی نظرکرم سے طوفان سے بچکر نکلی تھی. حضرت سلیمان کو جو شوکت و منزلت حاصل تھی وہ انہی کی نظر کرم کا نتیجہ تھی. فرعون کی روگردانی اور انحراف بھی انہی کے دست قدرت کا کرشمہ تھا.

مخدوم غلام محمد بگائی

بڑے عالم و فاضل اور عاشق رسول تھے. "بگا" نامی گاؤں کے باشندہ تھے، جو تحصیل مورہ ضلع نوابشاہ میں واقع ہے. ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں ہوئیں. البتہ اسقدر معلوم ہوا ہے کہ میاں نور محمد کلہوڑہ (۱۷۱۹ع-۱۷۵۳ع) کے عہد حکومت میں زندہ تھے. مولود (وہ کلام منظوم جس میں حضور کی ولادت باسعادت کا ذکر ہو) معجزے اور منقبتیں کہی ہیں. چونکہ یہ بزرگ مخدوم عبدالرؤف بھٹی سے قبل کے ہیں، اس لئے مولود کے سلسلہ میں انہی کو شرف اولیت حاصل ہے.

مخدوم صاحب کے ہمعصر مخدوم عبدالرحمان کھوڑہ (تحصیل گمبٹ ضلع خیرپور) بہت بڑے درویش اور عالم و فاضل تھے. جب میاں نور محمد کلہوڑہ نے سنہ ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۳ع) میں ان کو شہید کرایا تو مخدوم غلام محمد بگائی نے نور محمد کلہوڑہ کی سخت مذمت کی اور عبدالرحمان کی شہادت کا واقعہ بڑے درد اور سوز سے منظوم کیا. واقعاتی شاعری میں اس نظم کو ایک شاہکار کی حیثیت حاصل ہے. یہ نظم الف اشباع کے قافیہ میں ہے اور نہایت ہی پراثر اور دردانگیز ہے. نمونہ کے طور پر چند بند پیش کئے جاتے ہیں:

ميڙو ڪري مخدوم تي اچانڪ آيا جابرجي، جاگيرتي ڪاهي ڪل پيا ماري، مؤمنن جا ڦري مال متاعا ضرر، ظلم، زيادتيون تن ڪهڙا چوان ڪيا	ھجوم کرکے اچانک مخدوم کے سر پر پہنچ گئے، اور ان میں جو زیادہ جابر و ظالم تھے وہ جاگیر پر چڑھ دوڑے. مومنوں کو زد و کوب کیا اور ان کا مال و متاع لوٹ لیا. کیا بتاؤں کہ انہوں نے کس قدر نقصان پہنچایا اور کتنی زیادتیاں کیں.

کھڙي تپ تپائيا ناحق ناوجھا
قاضين ڪتابن جا ناتہ مچيا مسئلا
ہر ھو حاڪم سندي ھٿ تي
ھچارا ھئا
ماري مؤمن جا ھٽي ڌڻ ھليا
آہ غريبان نہ ڊنا، نہ ڪنھن قھر خدا
ماريندي مسڪين تي ترس نہ ہين تاء
تڏھن مؤمن مڙي مخدوم ڏي
دانھين سڀ ڊوڙيا
تہ اي عادل ھئين تنھنجي ڌا
مرون مخدوما
تڏھن قاضي قريشي ڪوٺيا، مؤمن
مقتولا
مل موڙنا ہو وجي ورائي وٺ سگھا

آخر بے سبب اور بے قصور ان کو کونسی آگ نے بھڑکایا۔ قاضیوں نے کتابوں کے احکام کو پس پشت ڈالدیا۔ ان ظالموں کو حاکم کی انگشت تھی۔ مومنوں کے مویشیوں کے ریوڑ لوٹ کر لیگئے۔ نہ غریبوں کی آہ سے ڈرے اور نہ قہر خداوندی سے۔ مسکینوں کو مارتے ہوئے انہیں ذرہ بھر بھی رحم نہیں آیا۔ مومن مجبور ہو کر مخدوم کے پاس فریاد لیکر پہنچے کہ اے منصف مزاج مخدوم! ہم تمہارے ہوتے ہوئے بیدردی سے مارے جا رہے ہیں۔ مخدوم نے قاضیوں اور قریشیوں کو بلا کر کہا کہ ان کا مال مویشی جلد از جلد واپس کیا جائے۔

قاضی عبدالکریم

ضلع نوابشاہ کے ایک گاؤں "کھائی کنڈھن" کے باشندہ تھے اور بڑے عالم و فاضل۔ کلہوڑوں کے آخری اور ٹالپوروں کے ابتدائی دور میں گذرے ہیں۔ سندھی نثر میں دعاؤں کی ایک کتاب لکھی اور الف اشباع والے قافیہ میں قرآن مجید کا منظوم ترجمہ اور تفسیر بھی(۱)۔ ان کی نظم میں سادگی اور سلاست ہے اور خالص سندھی

(۱) سہ ماہی "الرحیم" حیدرآباد - ۱۹۶۸ع - نمبر ۱- ص ۶، ۷، ۹۔

زبان استعمال کی گئی ہے۔ چونکہ ساھتی پرگنہ کے باشندہ تھے اس لئے ان کی زبان ساھتی پرگنہ کے سندھی محاورہ کا قدیم اور عمدہ نمونہ ہے۔ ان کے کلام سے بطور نمونہ دو بیت پیش کئے جاتے ہیں:-

ساراھجي سبحان کي ساره جنھن جڳاه
نازل ڪيائين نورنبي تي ڪامل قرآنا
پن پدم صلواتن ۽ سلامن جا
مٿي مصطفیٰ
سپ ڪنھن ساعت ساعت ۾ پٺ
پساه پساها (۱)

اللہ کی حمد کرنی چاھئیے کیونکہ حمد اسی کے شایان شان ہے۔ اس نے نبی اکرم پر جو سراپا نور ھیں، پورا قرآن نازل کیا۔ محمد مصطفیٰ پر بیشمار اور بے حساب صلواۃ اور سلام ھر ھر گھڑی اور ھر ھر دم کے ساتھ۔

میوں عیسو

علامہ داؤد پوتہ کی تحقیق کے مطابق یہ بزرگ، شاہ لطیف کے معاصر تھے اور گیارھویں صدی کے آخر اور بارھویں صدی ھجری کے شروع میں گذرے ھیں۔ شمالی سندھ سے لاڑ کی طرف اپنے پیر طریقت کے ساتھ دریا کے راستے سفر کر رھے تھے۔ جب ان کی کشتی "کھانوٹ" میں پہنچی، تو ان کے پیر نے کہا کہ تمہارا قیام یہیں ھوگا۔ لہذا وھیں ٹھیر گئے۔ بعد میں ان کے مرید جو کھوکھر تھے ان کو اپنے گاؤں میں لیگئے جو ملاکاتیار اور سعیدپور کے درمیان میں ہے۔ کلہوڑے بھی ان کے مرید تھے۔ خود قادری مسلک کے پیرو تھے (۲)۔

ان کی ایک مثنوی دستیاب ھوئی ہے، جسے "میں عیسے کی سندھی" کہا جاتا ہے۔ ان کے کلام میں پختگی بھی ہے اور شیرینی بھی۔ ان کے ابیات تصوف اور معرفت کے موضوع پر ھیں۔ بارگاہ

(۱) سہ ماھی "الرحیم" حیدرآباد - ۱۹۶۸ع - نمبر ۱ - ص ۶، ۷، ۹۔
(۲) علامہ داؤدپوتہ کا مقالہ شایع شدہ "نئی زندگی"، جنوری ۱۹۵۱ء۔

ایزدی میں عجز و نیاز کا اظہار ہے۔ ہجر و وصال کا ذکر بھی دلگداز اور دلکش انداز میں کیا گیا ہے۔ چند ابیات بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:-

سهسين سڄڻ سوهڻيون، لکين لک هزار
سڀڪا ڀانئي ٿي آئون سڪان پنهنجي يار
پرجا آئڙي رات، مان کي محبت ميهار
سا پهچي پرين پار وڏي وير وٺاڻ ۾

محبوب کے پاس سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں حسینائیں ہیں۔ اور سبھی یہ سمجھتی ہیں کہ ہم اپنے محبوب سے محبت کرتی ہیں۔ لیکن رات کو جس کی محبت نے محبوب کے من کو موہ لیا وہی محبوب کے پاس پہنچ جاتی ہے۔

سڪ ساهيڙي جن جي، سي اکثر اسهيون
ڪنجون قطارون ڪري، راتهم روهه رميون
ان پر اڏائيون، جن ڪل نه پئي پکئين

محبت جن کی سہیلی ہے وہ روانہ ہوگئیں، ہنسوں کے جوڑوں کی طرح قطار در قطار اس طرح اڑ گئیں کہ پرندوں کو بھی پتہ نہیں چل سکا۔

مخدوم عبداللہ واعظ

مخدوم عبداللہ عرف میاں موریو، مخدوم عبدالقادر کے فرزند تھے جو مخدوم ابوالحسن کے چچازاد بھائی تھے۔ مخدوم عبداللہ نے مخدوم ابوالحسن سے علم حاصل کیا۔ ان کے استاد مخدوم ابوالحسن ان سے بڑی محبت اور شفقت کا برتاؤ کرتے تھے اور اپنی زندگی

ھی میں ان کو پیش امامی کی دستار بندھوائی تھی۔ سنہ ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۶ع) میں متولد ہوئے اور سنہ ۱۱۷۷ھ (۱۷۶۳ع) میں انتقال کیا۔ وعظ بھی کرتے تھے۔ اس لئے ان کو "واعظ" کہا جاتا تھا۔ "کنزالعبرت" اور "بدرالمنیر" ان کی تصنیفات سمجھی جاتی ھیں لیکن دراصل یہ کتابیں مخدوم عبداللہ ٹھری والے کی تصنیف ھیں۔ ایک سی حرفی بھی ان کی طرف منسوب ھے جو محترم ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے اپنی کتاب "سی حرفیاں" حصہ اول میں نقل کی ھے۔ اس میں سے دو ابیات بطور نمونہ پیش کئے جاتے ھیں:-

دائم درماندن تي، نرمل نظر کريم
اوکيءُ ويل اڙين کي راحم تون رحيم
سڏي منھنجا سڏڙا واھر ٿي وريم
حسني منجھان ھيم کا مدد کر مريد سان

اے رحیم و کریم! عاجزوں پر نظر کر، اے رحم کرنے والے! مشکل کے وقت میں درماندوں کے پاس پہنچ جا۔ میری پکاریں سنکر میری مدد کو آجا۔ اے حسنی! اپنے مرید کی جلد مدد کر۔

رحمتون توتي رب جون وسن وير وتار
پلئيو تو پور کري منجھان نور نروار
طالب تو در کيترا مڱن مڱڻھار
اڙين جا آڌار کا مدد کر مريد سان

اے عالی مرتبت! تجھ پر اللہ کی رحمتوں کی بارش ھو، تیری پیشانی سے نور کی شعاعیں پھوٹ رھی ھیں۔ تیرے دروازے پر کئی حاجتمند ھیں جو اپنی حاجت روائی کیلئے التجائیں کرتے ھیں۔ اے محتاجوں کے یارومددگار! اپنے مرید کی مدد کر۔

محمد شریف رانی پوری

یہ بزرگ مخدوم عبدالرحیم گرھوڑی کے ھمعصر اور رانی پور

کے باشندہ تھے. ان کے حالات پردۂ اخفا میں ھیں البتہ یہ پتہ چلا ھے کہ بڑے عالم و فاضل تھے. ان کے طویل ابیات کا ایک چھوٹا سا مجموعہ دستیاب ھوا ھے، جسے "سندھی" کہا گیا ھے، یہ سنہ ۱۱۶۰ھ کی تصنیف ھے(۱). طویل ابیات میں زیادہ تر مروج قافیہ استعمال کیا گیا ھے. نمونہ کے طور پر ایک بیت پیش کیا جاتا ھے:

گھڻي خلق خدا جي ملن منجھائي
ملا ڇنجي تن کي جي وات پڙهن وائي
اندر نه آهن اکيون سمجھ نه سيائي
سوريا وڃن وريا ڇڏيو سٽائي
مذهب محمدي ٽاريو وتن پيي وائي
پرچاءُ نه آهن پاڻ ۾ هڏ نه هيڪائي
هيڪڙا چون هيڪڙي ٻين ٻيائي
سچي ڪن نه سيڪا رکن ريائي
پڙهي چون نه پڌري معني مڙائي
جيڪا پوين دل ۾ سڏائين سا وائي
جي مصلحت آهي ان ۾ اڳينائي آئي

اللہ کی اکثر مخلوق کو ملاؤں نے گمراہ کیا ھے. ملا انھی کو کہتے ھیں جو زبان سے کچھ نہ کچھ پڑھتے رھتے ھیں. ان میں نہ بصیرت ھوتی ھے، اور نہ فراست ایمانی. محمدی دین کو نظرانداز کرکے دوسری باتیں کرتے ھیں. ان میں باھمی اتحاد نہیں ھے، آپس میں لڑتے رھتے ھیں. ایک ملا ایک بات کہتا ھے، اور دوسرا دوسری بات کرتا ھے. کلمۂ حق نہیں کہتے، ریا کرتے ھیں جو پڑھتے ھیں اسکے صحیح معنی نہیں بتاتے. جو دل میں آتا ھے، وھی سنا دیتے ھیں اور کہتے ھیں کہ اسی میں مصلحت ھے.

---

(۱) تذکرۂ لطفی- ج ۱، طبع سوم، ص ۶۷۰، ۶۷۱.

سندھی بیت

سندھی بیت کے آثار "گاہ" کی صورت میں سومرہ دور سے ملتے ھیں. اسکے بعد سندھی بیت نے ترقی کی. سمہ دور میں بیت کے اندر شیرینی، دلکشی اور پختگی پیدا ھوئی. ابتدا میں بیت کے ذریعہ صرف واقعاتی اور محاکاتی مضامین پیش کئے جاتے تھے لیکن بعد میں یعنی سمہ دور میں تصوف کے باریک مسائل بھی بیت میں بیان کئے جانے لگے جس کا ثبوت قاضی قاضن کے ابیات سے ملا ھے.

فنی اعتبار سے بیت شروع میں دو مصرعوں پر مشتمل ھوتا تھا لیکن بعد میں تین اور چار مصرعوں والے ابیات بھی رائج ھوئے، جو اب تک مروج اور مقبول عام ھیں.

کلھوڑہ دور میں بیت ترقی کر کے اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا اور فکری اعتبار سے گہرے جذبات اور انسانی زندگی کے اعلیٰ مقاصد کی تشریح و توضیح کا ذریعہ بھی بنا. حسن و عشق اور فراق و وصال کی رنگینی، دلکش اور پر اثر حکایات کے بیان اور واردات قلب کے اظہار کا وسیلہ بھی ھوا. فنی لحاظ سے اس میں اور بھی پختگی پیدا ھوئی اور اس کے مصرعوں میں اضافہ ھوا. خاص طور پر شاہ عنایت رضوی اور شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سندھی بیت کو سنوار کر اس میں لطافت اور نزاکت پیدا کی جس سے اس کی تاثیر دوچند ھوگئی. ذیل میں اس دور کے بیت کہنے والے شعرا کے حالات پیش کئے جاتے ھیں.

شاہ عنایت رضوی

بکھر کے رضوی سادات میں سے سید علاءالدین بن سید ابراھیم ثانی بکھر سے نقل مکانی کر کے نصرپور (ضلع حیدرآباد) میں سکونت

پذیر ہوئے. شاہ عنایت انہی کی نسل سے شاہ نصیرالدین کے فرزند تھے. سنہ ۱۰۳۰ھ سے ۱۰۳۵ھ تک کے درمیانی عرصہ میں متولد ہوئے. اس دور کے دستور کے مطابق فارسی کی تعلیم حاصل کی اور اپنے والد ماجد کے پیر طریقت شاہ خیرالدین کے مرید ہوئے، اور وقتاً فوقتاً ان کی زیارت کیلئے سکھر جاتے رہے. پیری مریدی انہیں ورثہ میں ملی تھی. اس لئے جب اپنے مریدوں کے پاس جاتے تو بڑی شان و شوکت کے ساتھ جاتے. سنہ ۱۱۲۰ھ اور ۱۱۲۵ھ کے درمیان رحلت فرمائی (۱).

یہ پہلے سندھی شاعر ہیں جن کا مکمل رسالہ (مجموعۂ کلام) دستیاب ہوا ہے. ان کے رسالہ میں بیت کے علاوہ وائی بھی ہے. ان سے پہلے سندھی وائی کا کوئی نمونہ نہیں ملا. ان کے ابیات میں فنی پختگی بھی ہے اور رنگینی اور شگفتگی بھی. یہ پہلے شاعر ہیں جن کے کلام میں مسائل تصوف کے ذکر کے ساتھ ساتھ حسن و عشق اور ہجر و وصل کا بیان بھی پر اثر انداز میں موجود ہے. اس کے علاوہ ان کے کلام میں سندھ کے معاشی اور معاشرتی حالات کی جھلک بھی پائی جاتی ہے. ان سے پہلے کے شعرا کے کلام میں سندھ کی رومانی داستانوں پر چند ابیات ملے ہیں. لیکن شاہ عنایت کے رسالہ میں ہر داستان سے متعلق مکمل سر (باب) موجود ہیں جن میں متعدد ابیات ہیں.

ایک روایت کے مطابق ان سے شاہ لطیف کی ملاقات ہوئی تھی. اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس ملاقات کے وقت شاہ لطیف کا عالم شباب ہوگا اور شاہ عنایت عمر رسیدہ ہونگے. اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ شاہ لطیف ان سے متاثر ہوئے ہونگے.

---

(۱) "میاں شاہ عنایت کا کلام" از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ، سنہ ۱۹۶۳ع، ص ۳۱ تا ۶۰.

اس زمانہ میں شاہ عنایت کا کلام قبول عام حاصل کرچکا تھا اور سندھ کے کونے کونے میں گونج رہا تھا. لیکن بعد میں شاہ لطیف کے کلام کی غیر معمولی شہرت اور ھمہ گیر مقبولیت کی وجہ سے ان کے کلام کی مقبولیت اس طرح کم ھوگئی جس طرح سورج کے سامنے چاند کی روشنی ماند پڑجاتی ھے. ذیل میں شاہ عنایت کے کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ھے:-

جھڑا ڪرڙ ڪڪوريا، تھڙيون
لوبون سر لڳن
هيڪانديون تني هليون، پسيءَ
کي پکن
ميڙين ڏٿ ملير ۾، سدا ساٿھ ڪن
تنين جي پکن عمر! اڪنڊي آهيان.

جس طرح کرڑ کے درخت پر پھلنے پھولنے سے لالی آئی ھوئی ھے ویسی ھی لال لال لوئیاں انہوں نے سر پر اوڑھ رکھی ھیں اور کرڑ کے پھل پھول چننے کیلئے ملکر چلی ھیں. اور وہ ملیر میں ھمیشہ ھی ڈتھ اکٹھا کرتی ھیں. اے عمر! میں ان کے جھونپڑوں میں جانے کیلئے ترس رھی ھوں.

گلبدن جون گجريون ارم اوڍيائون
چوٽا تيل ڦليل سين واسينگ وڙھيائون
مشڪ محبت پاڻ ۾ لڳين لاتائون
ڪوڏان پوتائون ڪچنان سيلا
سنڌيائون

ریشمی بدن والی دوشیزاؤں نے ریشمی لباس پہن رکھا ھے. کالے سانپوں جیسی چوٹیوں میں خوشبودار تیل ڈالکر ان کو سر پر لپیٹ لیا ھے. محبت کا مشک ملکر بدن پر مل لیا ھے اور ھار پہن لئے ھیں.

اھڙيءَ ہر عنايت چوي رانــو رانيائون سو سوٽي ڪيئن پاھون جو وڃي ڪاڪ وارپو	عنایت کا کہنا ہے کہ انہی حیلوں سے رانو کو رجھالیا ہے. اب وہ کاک میں آکر اپنی مرضی سے کیسے واپس جاسکتا ہے.

مخدوم سلیمان

ہنگورہ کے مخدوم حاجی حبیب اللہ کے فرزند تھے اور شاہ عنایت رضوی کے ہمعصر. پہلی مرتبہ جب شاہ عنایت سے ملاقات کی اور شاہ عنایت نے ان کا تجمل اور قیمتی لباس دیکھا تو انکو میٹھ سے لگاتے ہوئے یہ بیت کہا:-

جي ڏاگهر ڏنگائي ڪري تہ نٿ ناڪيلي ڏار واڳي تنهن ڪي وڳ سان تون مٿي ڪي تہ مهار ائين چانگو چار، جيئن ڏيئون ڏار نہ ٿئي (۱)	اگر اونٹ مستی کرے تو تم نکیل کا بندوبست کرو، نکیل اور مہار ڈالکر اسے اونٹوں کے گلے میں چھوڑدو اور اس کی تربیت اس احتیاط سے کرو کہ اپنے مالک سے الگ نہ ہونے پائے.

اس پر مخدوم سلیمان نے جواب دیا کہ:-

ڪڏهن هن ڪرهل جا پڌر پيپ نہ لڳ اٿس هير حضور جي وهي منجهيئي وڳ سڪ جا سليمان چوي اٿس سنڌ سنڌ ۾ سڳ جڳ سان جهڙو جڳ هينئڙي سان هت چري (۲)	اس اونٹ کی ظاہری حالت پر مت جائیے. یہ بظاہر اونٹوں کے گلے کے ساتھ رہتا ہے لیکن دراصل قرب و وصل سے سرفراز ہے. محبت اسکے عضو عضو میں سمائی ہوئی ہے. دنیا کے ساتھ دنیاجیسا ہے لیکن اس کا دل وہیں اٹکا ہوا ہے.

(۱) کلام دولہہ دریا خان، مرتبہ فقیر ہدایت علی تارک (غیر مطبوعہ)
(۲) میں شاہ عنایت کا کلام، مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ۔ مقدمہ ص ۳۴، ۳۵

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ عنایت کے زمانہ میں سندھی بیت کہنے کا رواج عام تھا۔ ممکن ہے مخدوم سلیمان نے اور ابیات بھی کہے ہوں۔ اس دور میں ان کے علاوہ اور بھی متعدد شعرا اور سخن سنج و سخن فہم موجود تھے جن میں سے بعض کے ساتھ شاہ عنایت کے منظوم مکالمات ہوئے ہیں۔

پیرو دھوبی

یہ سخن فہم اور سخن سنج شاہ عنایت کے ہمعصر تھے اور شاہ عنایت ان کے ساتھ منظوم مکالمات کرتے رہتے۔ پیرو دھوبی چونکہ ایک پختہ فکر سخن سنج تھے، اس لئے شاہ عنایت نے ایک بار ان کے پاس یہ معمہ بھیجا:-

گھر منجھ، گھڙي ويو، گھر منجھ، گھڙي ويو(۱)	گھر کے اندر داخل ہو گیا، گھر کے اندر داخل ہوگیا

پیرو نے یہ معمہ سنکر کہا:-

شاہ اسان ڏانھن موڪلي، سا واہ اسان کي وڻي اسين شاہ عنايت جي آھيون پيرن جي پٽي راند کڏندي ريل ۾ متان کو چلو پير ڇڻي(۲)	شاہ نے جو معمہ میرے پاس بھیجا ہے وہ مجھے بہت پسند آیا۔ میں شاہ عنایت کے پاؤں کی خاک ہوں۔ رات کو کھیلتے ہوئے شاید کوئی انگوٹھی گر گئی ہوگی۔

ایک بار پیرو دھوبی نے شاہ عنایت کے پاس یہ بیت ارسال کیا:-

ڏکھا ڏاڏي پوٽيين، کن ڏنا کي ٽيون ڏين	اپنی رشتہ دارنیاں طعنہ دیتی ہیں اور دے رہی ہیں

(۱، ۲) میاں شاہ عنایت کا کلام، مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ- مقدمہ ص ۱۴۴-۱۴۵۔

هيرو چوي ٻنهور کي نير نهوڙي نين	ہیرو کا کہنا ہے کہ بنہور کو قید و بند نے تباہ کردیا ہے
جي مان لوهه لهين ته هوند کوڙين ٻه ڪين هنا	اگر میری قید ختم ہوجائے تو میں آزاد ہوجاؤں

ایک بار ہیرو شاہ عنایت کے پاس گئے اور انہیں اپنی غربت سے آگاہ کرتے ہوئے کہا:۔

هاڻ هتي، ڳل ڳاڀرو ، ٻنا ڪير نه کاه
اي متي تي موجان ڪري ته
جيئن شال مون لاءِ سونيءَ ساه سنباه
هيرو چئي ٻهراه، اي لنگهي ٿيو
تي لاڳ ڪري

حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی

سندھ کے یہ نامور، زندۂ جاوید اور با کمال شاعر سنہ ۱۶۸۹ع میں متولد ہوئے اور سنہ ۱۷۵۲ع میں رحلت فرمائی. وہ شاہ کریم کے پڑپوتے اور شاہ حبیب کے فرزند تھے. کمسنی ہی میں فقر کی طرف راغب تھے اور سیر و سیاحت کے شائق. سندھ کا کونہ کونہ دیکھا، اور سندھ سے باہر بھی دور دور تک سفر کیا. والد ماجد کے انتقال کے بعد بھٹ شاہ میں سکونت اختیار کی، اس لئے انہیں بھٹائی کہا جاتا ہے. سال بہ سال ان کے یوم وفات پر ۱۴. صفر کو ان کی درگاہ پر بڑا اجتماع ہوتا ہے. بھٹائی صاحب نے شادی کی تھی لیکن اولاد نہیں ہوئی.

شاہ صاحب کے کلام میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک فطری، الہامی اور دنیا کے بڑے شاعر کے کلام میں ہونی

چاھئیں ۔ شاہ صاحب کی عظمت کا اعتراف صرف ملکی ادیبوں، سخن فہموں اور دانشوروں ھی نے نہیں کیا، بلکہ بیرونی اور خصوصاً مغربی ادیبوں، مفکروں اور نقادوں نے بھی کیا ھے. ان میں سے انگریز ادیب ڈاکٹر سورلے اور جرمن ادیبہ ڈاکٹر اینیمیری شمیل کے نام قابل ذکر ھیں ۔ بقول ڈاکٹر گربخشانی کے "شاہ صاحب کی شاعرانہ خوشبو نے تمام دنیا کو معطر کردیا ھے." آنجہانی گربخشانی نے شاہ صاحب کی شاعری کی اس عظمت کیلئے یہ دلیل پیش کی ھے کہ "شاہ صاحب کی قوت فکر کی سب سے بڑی دلیل یہ ھے کہ ھم جسقدر ان کے شعر پر غور کرتے ھیں، ھماری حیرت میں اسی قدر اضافہ ھوتا ھے."

علامہ آئی۔ آئی۔ قاضی نے غیر ملکی دانشوروں کے مقرر کردہ تنقیدی معیار کے مطابق بھٹائی صاحب کو دنیا کا سب سے بڑا شاعر ثابت کیا ھے. اس سلسلہ میں انھوں نے مشہور انگریز ادیب کارلائل اور دیگر ادیبوں کے مقرر کردہ معیار پیش کئے ھیں:-

(۱) شعر وہ ھے جو گایا جا سکے ۔

(۲) اگر کسی شاعر کے شعر کا کوئی مصرعہ یا لفظ بدل دیا جائے تو شعر کی روح ختم ھو جائے۔

(۳) زبان کا استعمال، جس کے ذریعہ شاعر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ھے۔

یہ تینوں خوبیاں بیک وقت شاہ صاحب کے شعر میں موجود ھیں، جو دنیا کے کسی بھی شاعر میں یکجا نہیں ھو سکیں۔ شاہ صاحب کے شعر میں فکر کی گہرائی اور وسعت ھے۔ ان کا شعر گایا

جاتا ہے۔ چھوٹے بڑے اور تعلیم یافتہ خواہ غیر تعلیم یافتہ اس سے حظ حاصل کرتے ہیں۔ سندھی زبان کے الفاظ اور محاوروں کے استعمال کے لحاظ سے سند کی حیثیت رکھتا ہے اور سندھ کی ثقافت، تہذیب اور تمدن کا ترجمان ہے۔

شاہ صاحب کی قوت مشاہدہ انتہائی تیز ہے۔ وہ ہر چیز کی گہرائی میں جا کر صحیح اور بہترین نتائج اخذ کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں انسانی فطرت کا ہر رخ اور زندگی کے تجربات کا عکس نمایاں نظر آتا ہے. اس لئے ان کے کلام میں خارجی عنصر بھی ہے اور داخلی عنصر بھی۔ اس میں عوام الناس کی دلچسپی کا مواد ہے۔ اس لئے بچے، بوڑھے اور پڑھے لکھے خواہ ان پڑھ اس سے یکساں محظوظ ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنے دلی جذبات کو تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے جو سوچا سمجھا ہے اور خود برتا ہے. وہی پیش کیا ہے۔ اس لئے ان کا انداز بیان ذاتی اور داخلی ہے جس میں خلوص اور صداقت ہے اور فکر کی بلندی کے باوجود وہ اسقدر پراثر ہے کہ ہر قسم کا ذہنی معیار رکھنے والا انسان اس سے لازمی طور پر متاثر ہوگا، اور شاہ صاحب کی بھی وہ فنی عظمت ہے جو دنیا کے دیگر شعرا میں مفقود نظر آتی ہے۔ شاہ صاحب کے کلام کو اگر سوچ سمجھ کر پڑھا جائے تو ان کی عظمت کے سامنے گردن جھکانے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آئیگا۔ ان کے کلام کو اگر بار بار پڑھا جائے تو ہر بار فکر کی بلندی کے نئے نئے نکتے سامنے آئیں گے۔ میں یہاں ان کا ایک بیت پیش کرتا ہوں جو انسانی ذہن کے ارتقا سے تعلق رکھتا ہے. شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ذہنی ارتقا ضرور ہوا ہے اور ہوتا

رہتا ہے۔ انسان بے شعور سے با شعور بنتا ہے۔ اس کے غیر پختہ ذہن میں پختگی پیدا ہوتی ہے اور کسی کی رہنمائی اسے راستہ دکھاتی اور منزل مقصود تک پہنچاتی ہے۔ شاہ صاحب مصائب و آلام کو راہ دکھانے والا رہنما کہتے ہیں اور ذہنی ترقی کا بنیادی سبب دلی لگاؤ اور محبت کے شدید جذبہ کو سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں :-

رات ڏنائين روجھہ، پان ُ تہ ڪي اوني آئيا پرتيئي پرينَ جي سڪڻ ڪئي سوجھہ هئي گھڻو ابوجھہ، سورن سونھائي سسئي	سسئی رات کو خواب میں نیل گائے دیکھ کر سمجھنے لگی کہ قافلہ والے (پنھوں کے بھائی) آگئے۔ محبوب کے ساتھ محبت کے جذبہ نے اسے باشعور بنا دیا تھا۔ سسئی پہلے تو بہت ہی بےشعور تھی لیکن دکھ درد نے اس کی رہنمائی کی۔

اسی وجہ سے وہ دکھ کو سکھ کی زیب و زینت سمجھتے ہیں کیونکہ محنت و مشقت کے بغیر نہ صرف منزل مقصود تک نہیں پہنچا جا سکتا، بلکہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا :-

"ڏک، سکن جي سونهن، گھوريا سک، ڏکن ري"
(دکھ، سکھ کی زینت ہیں، سکھ، دکھ کے بغیر بےکار ہے)

شاہ صاحب کی نظر میں حقیقت ظاہر اور واضح ہے۔ اس میں کسی قسم کا فرق اور ایچ پیچ نہیں ہے۔ پریشان خیال لوگوں نے صاف اور صحیح بات کو الجھاکر معمہ بنا دیا ہے :-

"ور ءِ ڪونهي ور، ڏيرن ور وڏو ڪيو"

(سسئی کہتی ہے میرے شوہر میں تو کوئی ایچ پیچ نہیں ہے، البتہ میرے دیوروں نے بات کا بتنگڑ بنا دیا ہے)

شاہ صاحب کی نظر میں کائنات کی تمام رنگینیوں میں وحدت ہی وحدت ہے۔

وہ ہمیں سمجھا رہے ہیں کہ کیوں اندھے بن کر آپس میں دست و گریبان ہورہے ہو، تم تو آپس میں ایک ہو. دوئی تو تم میں ہے ہی نہیں۔ یہ تمہاری جہالت ہے جو ایک دوسرے کو الگ سمجھ کر اپنے آپکو نقصان پہنچا رہے ہو:۔

پائي ڪان ڪمان ۾ ميان مارم مون مون ۾ آهين تون، متان تنهنجوئي توکي لڳي	اے دوست! کمان میں تیر ڈالکر مجھے نشانہ نہ بنا، مجھ میں تو، تو ہے، ایسا نہ ہو کہ تیرا تیر تجھے ہی لگ جائے۔

یعنی انفرادیت کا تصور ہی اذیت ناک ہے. انفرادیت کے اسی تصور ہی نے انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے ہیں۔ بغض، کینہ حسد اور عداوت اسی انفرادیت کے تصور کی پیداوار ہیں اور اسی لئے انسانی معاشرہ انتشار کا شکار ہے۔ دنیا میں فتنہ و فساد برپا ہے. ایک ملک دوسرے ملک کا اور ایک قوم دوسری قوم کی جانی دشمن بنی ہوئی ہے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ دراصل تمام انسان ایک ہی وجود کے مثل ہیں لیکن انفرادیت کے تصور نے ان کے حصے بخرے کردیئے ہیں:۔

گهڙي گهڙوهٿ ڪري الاهي تهار	سوھنی اللہ کے توکل پر گھڑا ہاتھ میں لیکر دریا میں کود گئی

جنگھہ چرکٹي وات ۾، سسي کي سيسار
چوڙا پيڙا چڪ ۾، لڙ ۾ لڙهيس وار
لکين چهٽيس لوهٽيون، تيليون ٽرٽيون ڏار
مڙيا سيهه هزار، ياڳاٽيندي سهٽي (۱)

اس کی ٹانگ مچھلی کے منہہ میں تھی اور سر نہنگ کے منہہ میں، چوڑیاں اور بٹن کیچڑ میں لتھڑے ہوئے، اور بال میلے پانی میں الجھے ہوئے۔ پانی کے لاکھوں کیڑے اور چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اس کے ساتھ چمٹ گئی ہیں۔ ہزاروں مگر مچھ اکٹھے ہوچکے ہیں۔ اب سوھنی تکے بوٹی ہونے والی ہے۔

یعنی انفرادیت کے اصول اور نظریات انسانیت کو تباہ و برباد کردینگے۔ شاہ صاحب سمجھتے ہیں کہ انسانیت کے دکھ درد کا علاج وحدت میں ہے اور ہمیں احساس دلاتے ہیں کہ ہم سب آپس میں ایک ہیں اور ہمارے درمیان کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے۔ شاہ صاحب اس نکتہ کو مختلف پیرایوں میں اور مختلف تشبیہات و استعارات میں بار بار اس لئے واضح کرتے ہیں کہ ہمیں اچھی طرح ذہن نشین ہوجائے۔ حسب ذیل بیت میں وہ اس بات کو الف اور لام کے اتصال سے سمجھاتے ہیں:-

ڪاتب لکيو جيئن لايو لام الف سين
اسين سجڻ تيئن رهيو آهي روح ۾

جس طرح کاتب نے لام کو الف کے ساتھ ملا کر لکھا ہے میرے محبوب اسی طرح میری روح میں رچ بس گئے ہیں۔

---

(۱) اس شعر کی یہ تشریح جو مؤلف نے کی ہے، صحیح نہیں ہے (مترجم).

ایک اور بیت میں زنجیر کی آپس میں ملی ہوئی کڑیوں کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں :-

ڪڙو منجهه ڪڙيءَ جيئن لهار لپيٽيو منهنجوجيءُ جڙيءَ سپرين سو گهوڪيو	جس طرح لوہار نے کڑی کے ساتھ کڑی ملاکر ایک مضبوط زنجیر بنادی ہے ، اسی طرح میرے محبوب نے میری جان کو اپنے ساتھ ملاکر ایک مستحکم رشتہ قائم کردیا ہے ۔

دوسرے بیت میں یہی بات سمجھاتے ہوئے گول اور پر پیچ سینگوں والی بھینس کے سینگ آپس میں پھنس جانے کی تشبیہہ استعمال کی ہے ۔ ان بھینسوں کے پیچدار سینگ جب ایک دوسرے کے ساتھ اٹک جاتے ہیں تو ہر ممکن کوشش کے باوجود الگ نہیں ہوتے :-

ڪي اوڏائي ڏور ، ڪي ڏور ۾ اوڏا سپرين ڪي چڙهن نہ چت تي ، ڪي وسرن نہ مور جيئن مينهن ڪنڍين پور ، تيئن دوست وراڪو دل ۾	بعض لوگ قریب ہوتے ہوئے بھی دور ہوتے ہیں اور بعض دور ہوتے ہوئے بھی قریب ۔ بعض کی یاد ذہن میں آتی ہی نہیں ہے اور بعض بھلائے نہیں جاسکتے ۔ جس طرح بھینسوں کے سینگ آپس میں مل جاتے ہیں ، اسی طرح میرے دوست کا میرے دل کے ساتھ تعلق ہے ۔

شاہ صاحب اسی بات کو ذہن نشیں کرانے کے ساتھ ، انسانی فطرت کا صحیح اور حقیقت پسندانہ جائزہ پیش کرتے ہوئے انسان کا

رخ بدی سے نیکی کی طرف موڑتے ھیں. وہ انسانی فطرت کو نظرانداز نہیں کرتے لیکن انسانی جذبات و احساسات کا رخ صحت مندانہ طریقہ سے موڑتے ھیں اور انسان کو اس کا مجدد شرف یاد دلاتے ہوئے فرماتے ھیں:-

اڇو پاڻي لڙ ٽيو، ڪالوريو ڪنگن	صاف پانی کو بگلوں نے میلا کردیا ھے۔
ايندا لڄ مرن تنهين سر مٿي هنجڙا	اب ھنس اس کے قریب آتے ہوئے شرماتے ھیں۔

نڪي آهيون چوهڙا، نہ ڪي آهيون چور	ھم نہ تو بھنگی ھیں، اور نہ ھی چور
هانڱاما ۽ هل، ڪتا ڪرين ڪن تي	پھر اے کتے! تو کس پر بھونک کر اتنا شور مچاتا ھے۔

ايءُ نہ مارن ريت جئن سيڻ مٽائين سون تي	مارو، دولت دیکھکر اس کی لالچ میں سمدھیانے نہیں بدلتے۔ میں
اچي عمر ڪوٽ ۾ ڪنديس ڪانہ ڪريت	عمر کوٹ میں آکر اس رسم کو نہیں توڑوں گی۔ مجھے اپنی
پکن جي پريت، ماڙين سين نہ مٽيان	جھونپڑیوں کے ساتھ جو محبت ھے، میں اسے شاھی محلوں پر قربان نہیں کرسکتی.

جام

غالباً شاہ عنایت کے معتقد اور مرید تھے، ان کے ابیات بھی شاہ عنایت کے رسالہ میں مل گئے ھیں۔ ان کا ایک بیت پیش کیا جاتا ھے:-

مينهون مينهن سونهن، سونهن مور ملهار ۾
وڻ سونهن ولهارين، تڙ ريلي راڄ سونهن
مانداٽيون ۽ ماتيون پريا پاٽ سونهن
مکڻ مهمانن کي ڏينديون ڏڌ سونهن
ٻائين اڳيان ٻانهيون دايون در سونهن
جام چئي ڇنين کي لويون لڪ سونهن
پکا پٽ سونهن، تن ۾ سونهن سپرين

بھینس برسات میں اچھی لگتی ہے اور مور ساون میں. درخت پھل اور پھول سے اچھے لگتے ھیں، اور اللہ کی مخلوق پانی سے خوش ہوتی ہے۔ مال مویشی کے تھان، مال سے اچھے لگتے ھیں۔ مٹیاں اور بلونی مکھن اور لسی سے بھری ہوئی اچھی لگتی ھیں. خواتین، مہمانوں کو لسی اور مکھن دیتی ہوئی اچھی لگتی ھیں۔ مالکن کے آگے کنیزیں اچھی لگتی ھیں۔ دیہاتی عورتوں کے سر پر لوئیاں (چادریں) اچھی لگتی ھیں۔ زمین پر جھونپڑیاں اچھی لگتی ھیں اور ان میں محبوب اچھا لگتا ہے۔

شاہ شریف

شاہ عنایت رضوی کے فرزند تھے۔ ان کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں ہوسکیں. ان کے چند ابیات بھی شاہ عنایت کے رسالے میں شامل ھوگئے ھیں. شاہ شریف کے ابیات زیادہ تر طویل ھیں۔ ان میں سے ایک بیت بطور نمونہ درج ذیل ہے :-

ساوڻ مند شريف چئي وڄون جڻهن ورن

شریف کہتا ہے کہ جب ساون کے موسم میں بجلیاں چمکتی ھیں۔

اوءِ انائين اڳريون جي لوڏيري رهن
جهڙي پڪ پانن جي تهڙو رتو
منجهه اکين
بينسر پوتا پيڪ لڙهئين موهيو
من موتين
وڏي سري ان کي جي لائن
تي لتکن
آسڻ پاسڻ ان جا پاڪيزا پٽين
کنهن سبيان سنياسي آيو آتڻ مٿي ان
سوڏيون شڪارين سان ظاهر
ڪيون جوڳين
سرها شڪاري ٿيا ته دايون تي درن
تازي کاهيائون تکڙا اوڃن ءِ وهسن
اچي ڪاڪ ڪنڌين ۾ ڏارو
کيو ڏاٿين
ڪين اڇهي انکي ته ڪين
ڪامڻ کي کهن
جا مومل من منجهن سا راڻو
ريبي هليو

تو لوڈیرے کی دوشیزائیں بڑی حسین اور دلکش نظر آتی ہیں۔ انکی آنکھوں میں پان کی لالی جیسے لال ڈورے ہوتے ہیں اور انکی نتھ کی سنہری لڑی میں جڑے ہوئے موتی دل کو موہ لیتے ہیں۔ انہوں نے جو دھری پہنی ہوئی ہوتی ہے اس کی لڑیاں ان کے سینہ پر لٹکتی ہیں۔ ان کی رہائش گاہیں بڑی صاف و پاک ہوتی ہیں۔ ایک بار وہاں ایک سنیاسی آ نکلا اور یہ تمام رنگ دیکھا۔ اس نے یہ بات شکاریوں (عشاق، شہزادے) کو جا کر بتائی۔ شکاری بڑے اشتیاق سے گھوڑے تیار کر کے چل پڑے اور کاک میں منزل انداز ہوئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے دل کا راز مومل تک کس طرح پہنچائیں۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ مومل جو انکے دل میں تھی، اسے رانو رجھا کر لے گیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے شعر پر انکے والد کا اثر ہے۔

خواجہ محمد زمان

سلطان الاولیا حضرت خواجہ محمد زمان بن حاجی شیخ عبداللطیف نقشبندی ۲۱ رمضان سنہ ۱۱۲۵ ھ (۱۷۱۲ع) کو متولد ہوئے۔ ان کا نسبی سلسلہ تیسویں پشت میں حضرت ابوبکر صدیق سے ملتا ہے۔ خواجہ صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی اور مزید تعلیم کے حصول کیلئے ٹھٹہ گئے اور مخدوم محمد صادق نقشبندی کے مدرسہ میں داخل ہوکر تعلیم کی تحصیل و تکمیل کی۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خواجہ محمد ابوالمساکین کے مرید ہوئے اور تھوڑے عرصہ میں سلوک کی منازل طے کیں اور خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ انکے پیر طریقت جب حرمین شریفین روانہ ہوئے تو خواجہ صاحب کچھ عرصہ تک انکی خانقاہ میں ٹھیرے رہے۔ پھر ٹھٹہ سے لنواری تشریف لاکر وہیں اقامت گزیں ہوگئے۔ لنواری میں انکے اقامت اختیار کرنے کے بعد سنہ ۱۱۴۹ ھ (۱۷۳۶ع) میں انکے والد ماجد نے انتقال کیا۔ چونکہ لنواری کا قدیم قصبہ تقریباً ویران اور غیرآباد ہورہا تھا اس لئے سنہ ۱۱۵۰ ھ (۱۷۳۷ع) میں اس کے قریب اسی نام سے نیا قصبہ تعمیر کرواکر وہیں آباد ہوگئے۔ اللہ کے بیشمار بندوں کو اپنے سر چشمۂ فیض سے سیراب کرکے سنہ ۱۱۸۸ ھ (۱۷۷۴ع) میں واصل بحق ہوئے۔ حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی انکے ھمعصر تھے اور عمر میں ان سے بڑے۔ بھٹائی صاحب ان سے ملنے کیلئے لنواری گئے تھے اوران کے دست حق پرست پر بیعت کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن نقشبندی طریقہ میں چونکہ ساز و سرود کی ممانعت ھے لہذا مرید نہیں ہوئے۔ بھٹائی صاحب خواجہ محمد زمان سے اسقدر متاثر تھے کہ ان کے متعلق فرمایا کرتے تھے :-

سون سي ڏنا ساءِ، جنين ڏٺو پرينءَ کي،
تنين سندي ڪا، ڪري سگهان نه ڳالهڙي.

میں نے وہ لوگ دیکھے ھیں جنھوں نے محبوب کو دیکھا ھے۔ میں ان کی کوئی بات بیان نہیں کر سکتا۔

حضرت خواجہ صاحب کے ۸۵ سندھی ابیات موجود ھیں جن کی شرح ان کے مرید شیخ عبدالرحیم گرھوڑی نے عربی میں کی ھے. گرھوڑی صاحب کی اس شرح کا سندھی میں ترجمہ علامہ ڈاکٹر داؤد پوتہ نے کیا ھے اور اس کو "ابیات سندھی" کے نام سے چھپوایا ھے۔ ابیات کا موضوع تصوف ھے، جن میں طالب کو طریقت کی راہ بتائی گئی ھے۔ چند ابیات درج ذیل ھیں:-

فعل شريعت، حب طريقت، هنيون حقيقت هوءِ
معرفت نالوُ آهي پروڙڻ پارسين.

شریعت نام ھے عمل کا، طریقت محبت کا اور حقیقت دل کا، اور معرفت نام ھے محبوب کو پہچاننے کا۔

هوند ٺا هوت پري اوڏو نه اٺ هوند کي
سڄڻ تن سري، "لا" سين "لا" لاهين جي

جنھوں نے اپنی خودی کو ترک نہیں کیا، یا جو "لا" کی منزل سے آگے نہیں بڑھے، وہ محبوب کی قربت حاصل نہیں کر سکتے محبوب کا قرب ان کو حاصل ھوتا ھے جو "لا" (نفی) کی منزل سے آگے بڑھ جاتے ھیں۔

جنين ڏٺو پاڻ، تنين ڏٺو سپرين
غلط اي گمان ته عارف پسي آرسي

جنھوں نے اپنے آپ کو دیکھا، انھوں نے محبوب کو دیکھا، یہ غلط ہے کہ عارف صرف آئینہ میں عکس دیکھتا ہے۔

عارف ۽ عشاق پسڻ گهرن پرين ءِ جو
جنت جا مشتاق اجا اوراهان ٿيا

عارف اور عشاق محبوب کے دیدار کے تمنائی ہیں، جن کو جنت کا اشتیاق ہے وہ منزل سے دور ہیں

عجب جهڙي آ حقيقت حبيب جي
نڪي چئبو سو ڏٽي، نڪي مخلوقا
شفق جي ساجاء جامع ليل ونهار ڪي

محبوب کی ماہیت بالکل عجیب ہے، اسے خدا بھی نہیں کہا جا سکتا اور مخلوق بھی نہیں، وہ شفق کی مانند ہے جو دن اور رات کی جامع ہوتی ہے۔

روحل فقیر

میاں روح اللہ عرف روحل فقیر زنگیجہ قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ انکے آباء و اجداد پنجاب کے ایک گاؤں "لونگریہ" کے باشندے تھے۔ روحل فقیر مع اپنے اعزا و اقربا کے پنجاب سے ھجرت کر کے سندھ میں آئے اور ضلع تھرپارکر میں آباد ھوگئے۔ میاں روح اللہ، میاں غلام شاہ کلھوڑہ کے ملازم ھوئے۔ ایک بار میاں غلام شاہ حرمین شریفین سے آب زمزم میں تر کیا ھوا کفن کا کپڑا لے آئے۔ لیکن ان کے انتقال پر ان کے فرزند میاں سرفراز نے وہ کپڑا اپنے والد کے کفن کیلئے دینے کے بجائے اپنے پاس رکھ لیا۔ روحل فقیر کا

رجحان شروع ھی سے فقر کی جانب تھا۔ اب جو یہ واقعہ دیکھا تو ان کا دل دنیا سے بیزار ھوگیا، اور وہ تمام تعلقات توڑ کر گھر سے نکل کھڑے ھوئے اور جھوک میراں پور میں جاکر ریاضت اور مجاھدہ میں مشغول ھوگئے۔ ۲۵ برس کے بعد پیر طریقت کی نظر فیض اثر سے منزل مقصود تک پہنچے۔ آخر جب پیر سے اجازت لیکر روانہ ھونے لگے تو ارشاد ھوا کہ راستہ میں جہاں بھی تمہیں رکاوٹ پیش آئے، وھیں رک جانا کیونکہ وھی تمہاری منزل ھوگی۔ میاں روح اللہ اپنے پیر کے ارشاد کے مطابق چلتے رھے۔ آخر ایک مقام پر انکے پیراھن کا دامن ایک کانٹے دار جھاڑی میں اٹک گیا، اور وہ وھیں ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئے۔ آخر اسی مقام پر ایک گاؤں تعمیر ھوگیا جو "کنڈڑی" کے نام سے مشہور ھے، اور تحصیل روھڑی ضلع سکھر میں واقع ھے۔ کئی لوگ ان کے معتقد اور مرید ھوئے۔ والیء خیرپور میر سہراب خان بھی انکے عقیدتمند تھے جنھوں نے کوٹ ڈیجی کے قرب و جوار میں نذرانہ کی طور پر ان کو زمین دی جو کافی عرصہ تک ان کے اعزا و اقربا کے پاس رھی۔

روحل فقیر اپنے وقت کے بڑے عالم و فاضل تھے۔ عربی و فارسی اور ھندی زبانوں پر کافی عبور رکھتے تھے۔ سندھی، ھندی اور سرائکی زبان میں بلند معیار کے اشعار کہے ھیں۔ ھندی میں ان کی کئی منظوم تصنیفات ھیں، جن میں سے (۱) من پربودھ (۲) پریم گیان اور (۳) انبھو مشہور ھیں۔ ان میں مسائل تصوف کی وضاحت کی گئی ھے۔ "تذکرۂ لطفی" کے مصنف کا خیال ھے کہ سندھ کا کوئی شاعر بھی ھندی شاعری میں ان کی ھمسری نہیں کر سکتا۔ انہیں خواجہ فرید اور ملک جائسی کی صف میں لایا جا سکتا ھے (۱)۔

---

(۱) تذکرۂ لطفی جلد اول طبع سوم صفحہ ۶۸۱

سندھی اور سرائکی میں ان کا کلام کافی مقدار میں ہے جو ابیات، غزل، کافی اور سی حرفیوں پر مشتمل ہے۔ روحل فقیر تصوف میں وحدۃالوجود کے عقیدہ کے بڑے شارح اور مبلغ ہیں۔ وحدت، کثرت اور ہم اوست وغیرہ مسائل پر نہایت ہی خوش اسلوبی اور شرح و بسط کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ وہ وحدت ادیان کے بھی قائل اور حامی ہیں۔ انکے کلام میں جابجا اسی بات کا تذکرہ نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں:-

جي پپل ۾ پرميشر تہ ٻير ۾ ٻيو

اگر پیپل میں پر میشر ہے تو کیا ببول میں کوئی اور ہے۔

جن کي عشق اندر ۾ تن کي
اڃ نہ بک
وحدت منجھ وصال جي سدا
ماڻين سک
ڏور تنين کان ڏک، جي روحل
رتا روح ۾

جن کے دل میں عشق ہے ان کو نہ بھوک ستاتی ہے، نہ پیاس۔ وحدت میں قرب اور وصال سے سرفراز ہوتے ہیں اور ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ جن کے قلب و روح کو اطمینان حاصل ہوتا ہے ان کے دکھ دور ہوجاتے ہیں۔

پنھنجون اکيون پاڻ ۾ جوڙي
رکيون جن
سؤ سؤ ڀيرا ساعت ۾ تا پل پل
ڀرين پسن
تن تحصيلون تمام کيون محبت
جن جي من
روحل مٿان تن لٿا حرف حساب جا

جنھوں نے اپنی آنکھیں اپنے اوپر مرکوز کر رکھی ہیں وہ ایک ایک گھڑی میں سو سو بار محبوب کو دیکھتے ہیں، جن کے دل میں محبت ہے، انہوں نے تمام علوم پر عبور حاصل کرلیا۔ اے روحل! ان کو حساب و کتاب سے نجات مل گئی۔

بنگو گوپانگ۔

قصبہ "وایوں" متصل دربیلہ تحصیل کنڈیارہ ضلع نوابشاہ کے باشندہ تھے اور حضرت خواجہ محمد زمان لنواری والے کے مرید۔ ابیات بھی کہے ہیں اور کبتیں بھی۔ ان کا ایک بیت بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:۔

پنهل ويوڙي جيڏيون، ويو زال ڇڏي زر ۾	سہیلیو! پنھوں گیا اور اپنی بیوی کو شہر میں چھوڑ کر چلا گیا۔
آئن رات رڙيون ڪيون پيچ پني پر ۾	اونٹ رات بھر صبح سویرے تک بلبلاتے رہے۔ سسئی نے پنھوں
پنهون ڏٺائين نہ سيج تي تڏ گهورون ڏئي گهر ۾	کو پلنگ پر نہیں دیکھاتو گھربھر میں گھور گھور کر دیکھنے لگی۔
هئي هئي ڪيو هنبلا ڪري تي دست هڻي در ۾	ہائے ہائے کرکے بین کرنے لگی اور در و دیوار پر ھاتھ مارنے لگی۔
بي بي خان بلوچ لئي ٿڪي نا ٿرم	بی بی، خان بلوچ کی تلاش میں بیابان میں چلتے ہوئے نہیں تھکی۔
اورڻ پيس عجيب لئي وجي ڏورڻ ڏونگر ۾	محبوب کی جستجو میں اسے پہاڑ طے کرنے پڑے۔ آخر اس کے بخت
ڪاند مليس ڪر ۾ تيس بخت ٻاري بنگو چئي (۱)	نے یاوری کی کہ خاوند راہ میں مل گیا۔

صاحبڈنہ فاروقی

ان کو محمد حافظ بھی کہتے تھے۔ سنہ ۱۶۹۷ء میں متولد

---

(۱) "بیت" از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ص ۱۶

ہوئے اور سنہ ۱۷۸۸ء میں رحلت فرمائی۔ شاہ لطیف کے ہمعصر تھے۔ شاہ صاحب کی ان سے ملاقات بھی ہوئی تھی (۱)۔ حضرت سچل سر مست ان کے پوتے تھے۔ وہ وحدۃ الوجودی مسلک کے مبلغ ہیں اور اس کے ترجمان اور شارح۔ ان کا کلام زیادہ تر ابیات پر مشتمل ہے اور ان کے ابیات ان کے فکر و نظر کی عکاسی کرتے ہیں۔ انہیں اپنی ذہنی برتری اور فکری بلندی کا بھی احساس ہے، جس کا اظہار انہوں نے حسب ذیل ابیات میں کیا ہے، جن سے شاعرانہ تعلی جھلکتی ہے۔

کنين جو نيهن نھر سان کنين
دہايا درياھ
صاحبڏني جي ساه سارو سمنڊ سمائيو

کسی کا عشق محض نہر تک محدود ہے اور کسی نے دریا اپنے اندر جذب کرلیا ہے۔ لیکن صاحبڈنہ کے دل میں پورا سمندر سمایا ہوا ہے۔

کي پڙهہ سان پتجي ويا کي
چريا منجھ چاه
صاحبڏني جي ساه سارا ورق ورائيا

بعض سنتے ہی مدھوش ہوگئے اور بعض کو عشق نے پاگل بنا دیا۔ لیکن صاحبڈنہ نے (اس دفتر کے) تمام اوراق الٹ دیئے۔

سید فقیر محمد

نصرپور کے باشندہ تھے اور کلہوڑہ دور میں گذرے ہیں۔ اس

---

(۱) تذکرۂ لطفی از لطف اللہ بدوی طبع سوم ص ۵۶۳، ۵۶۴۔

زمانہ میں ان کا کلام مشہور اور مقبول تھا اور سماع کی محفلوں میں گایا جاتا تھا۔ لیکن آج نایاب ہے۔

سید محمد بقا

خاندان راشدیہ کے مورث اعلیٰ حضرت محمدبقا شاہ کا سندھی کلام بھی دستیاب ہوا ہے۔ جن کا نسبی سلسلہ بیسویں پشت میں سید علی مکی کے ساتھ ملتا ہے، جو راجہ دلورائے کے عہد میں تشریف لائے۔ سید محمد بقا کی ولادت سنہ ۱۱۳۵ ھ (۱۷۲۲ء) میں ہوئی اور شہادت سنہ ۱۱۹۸ ھ (۱۷۸۳ء) میں۔ ان کے جو ابیات مل سکے ہیں ان میں عشق حقیقی کی راہ سمجھائی گئی ہے۔ چند ابیات بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:- (۱)

جي کسان تہ کوک نہ نکري صبر سان آءُ سهان، اکيون لا يو پر کي وينئي سورسهان، کنهن کي کين چوان تہ کنهن پر اکنڊي آهيان	اگر قتل کیا جاتا ہوں تو فریاد تک نہیں نکلتی اور صبر سے سہہ لیتا ہوں۔ آنکھیں محبوب پر جمی ہوئی ہیں اور تکلیف برداشت کر رہا ہوں۔
——	——
اوڈا جي هئام تہ نت نياپا آئيا سنگهارا سانگ پئي ولهيا وس ويام مارو ٿرتيام، ڏيان ڏوراپو کنهن کي	جب وہ قریب تھے تو روزانہ پیغام آتے تھے اب سانگ کی وجہ سے وہ میری دسترس سے باہر ہیں۔ میرے مارو تھر میں ہیں۔ میں کس سے شکوہ کروں۔
——	——

سج لهي سانجهي ٿيو، پکي پياوٽين
آڏ هينئڙا پونر ٿي، آسهه پرمٽين
توري ڏينهين، ميڙو ٿيندء سڄٽين

سورج غروب ہوگیا، پرندوں نے درختوں میں بسیرا کرلیا۔ اے دل! تو بھونرا بنکر سویرے تیار ہو اور پرواز کر۔ عنقریب محبوب کے ساتھ تمہاری ملاقات ہوجائیگی۔

مخدوم عبدالرحیم گرھوڑی

کبت اور الف اشباع والی نظم کے علاوہ مخدوم صاحب نے ابیات بھی کہے ہیں جو معنوی اعتبار سے انتہائی گہرے ہیں۔ ایک بیت بطور نمونہ درج ذیل ہے:-

کارو کج قريب سين، کهين بار کٽيج
کسب کج معدوم جو اسم عين پسيج
ساٿهو مڙئي مت پسي ضعيفن کرم کريج
سٿي دعوت حق جي هنجن جيئن هليج
نيزي کنان نيهن جي کنڌ م کڌائيج
بخاري سريج سيوئي سهک ٿئي.

محبوب کے حضور میں آہ و زاری کر، دردمندوں کی مدد کر، اپنی ہستی کو فنا کرنے اور محبوب کا مشاہدہ کرنے کی کوشش کر۔ لوگوں کو اپنا عزیز سمجھ اور کمزوروں کی مدد کر۔ دعوت حق پر ہنس کی چال چل۔ عشق کے نیزے سے گردن نہ موڑ۔ آتشدان سے قریب ہوجا تو سب کچھ آسان ہوجائے گا۔

عنایت ڈیرہ

شاہ لطیف کے رشتہ داروں میں سے تھے اور ان کے طالب اور جان نثار۔ والد کا نام جانی تھا۔ شاہ صاحب سے سلوک کے متعلق ابیات میں سوالات کئے، جن کا جواب شاہ صاحب نے بھی ابیات ہی میں دیا ہے۔ ایک مرتبہ کہا:-

مرد گڏبئي سسئي! سوڙهيءَ منجهه سهي
طرح پچندءِ تکڙي باروچا ٻئي
پنهنجي پاڻ هٿن سان واچيندين ُ وهي
ثمر جن سهي، تن کو اهک عنايت چوي.

اے سسئی! تجھے تنگ راستے میں مرد ملینگے (یعنی اے انسان! قبر میں تیرے پاس نکیرین آئینگے) وہ دونوں تم سے سوال کرینگے۔ تم اپنا اعمالنامہ خود ھی دیکھ لوگی جس کے پاس ثمر ھوگا، انھیں کوئی دقت نہیں ھوگی۔

اسکے جواب میں شاہ صاحب نے فرمایا:-

ثمر نہ جنين ساڻ، هوت حمايتي تن جو
کري جيءَ ڇپرين پنهون ايندو پاڻ
ٿيندي روح رهاڻ لحظي منجهه لطيف چئي

جن کے پاس ثمر نہیں ھوگا محبوب خود ھی ان کی مدد کرینگے. محبوب ھمارے خسخانہ میں قدم رنجہ فرمائینگے۔ لطیف کہتے ھیں کہ محبوب کے ساتھ ایک گھڑی کے اندر خوب راز و نیاز ھونگے۔

مدن بھگت

کوٹڑی مغل کے باشندہ تھے اور شاہ لطیف کے ھمعصر اور ھمصحبت، شاہ صاحب کی رحلت کے کچھ عرصہ بعد انتقال کرگئے۔ شاہ صاحب کے ساتھ ابیات میں سوال و جواب کرتے تھے. ان کا ایک بیت حسب ذیل ھے:-

محبت ستو تو کڪ، ميون م مدن چئي
ڇا ڄاڻي لوڪ، قدر ان ڪيميا جو

میوہ جات میں سب سے مٹھاس بھرا میوہ محبت ھے، لوگ اس اکسیر کی قدر کیا جانیں.

تماچی فقیر

حضرت شاہ لطیف کے مرید اور خلیفۂ خاص تھے۔ انھوں نے بھی ابیات کہے ھیں جن میں سے ایک بیت درج ذیل ھے:-

گھر پریوئي گھور، نينھن نماڻي نجھري
تاڻي تنگ تماچي چئي، اٿي ڏونگر ڏور
سسئي سگ سنڌور، ڪرڪا ڀانڀ ڀاروچل جي

اے عشق کی ماری اور ستائی ہوئی! بھرا بھرایا گھر قربان کردے۔ تماچی کہتا ھے کمر کس کر اٹھ اور پہاڑوں کو طے کر۔ اے سسئی! رشتہ کا لحاظ کر اور بلوچ کی کنیز بنجا۔

صالح فقیر گوھری

شاہ لطیف کے عقیدتمندوں میں سے تھے۔ کچھ کے ایک گاؤں "گوھر" کے باشندہ تھے۔ وھیں سے شاہ صاحب کے ساتھ بھٹ میں آئے اور یہیں ٹھیر گئے۔ شاہ صاحب کی رحلت کے بعد زیادہ دن زندہ نہیں رھے۔ انہوں نے بھی ابیات کہے ھیں، جن میں چند شاہ صاحب کے رسالہ کے "سر دھناسری" میں شامل ھو گئے ھیں۔ نمونہ کے طور پر ان کا ایک بیت درج ذیل ھے:-

لوئيون ليڙان لاڪ جون اڃا آلڙيون
ڪين پائيندي ڪاڻي ويھي والڙيون
ڇڏ ڳر ھي ڳالھڙيون، تہ وڃين منھن ماروئڙن جي

مارئی کے سر پر جو لوئی تھی وہ ابھی ملیر کی لاکھ میں رنگی ہوئی اور گیلی تھی (یعنی عمر کوٹ آئے ہوئے اسکو تھوڑے دن ہوئے تھے)۔ وہ کانوں میں بالیاں (عمر کے دیئے ہوئے زیور) نہیں پہنیگی۔ اے عمر! یہ بیسود باتیں چھوڑدے تو مارئی اپنے عزیزوں کے پاس واپس چلی جائے۔

تمر فقیر

شاہ لطیف کے مریدوں میں سب سے بلند درجہ رکھتے تھے۔ ان کا اصل نام حاجی علی تھا، لیکن شاہ صاحب انہیں "تمر" کہہ کر پکارتے تھے۔ انہوں نے بھی سندھی میں ابیات کہے ہیں، جن میں سے بہت ہی کم دستیاب ہوسکے ہیں۔ نمونہ کے طور پر دو بیت پیش کئے جاتے ہیں:-

منهنجو من منجهائيو جتن جي جمال
وڏو سور سرير ۾ ڪيڇين جي ڪمال
هوت نه پائي حال، مٽ نه ٿيا معذور جا

بلوچ (پنھوں) کے حسن و جمال نے میرا دل پریشان کردیا ہے۔ کیچ والوں کے کمال نے میرے انگ انگ میں درد سمودیا ہے۔ بلوچ (پنھوں کے بھائی) میرے ہمدرد اور محرم راز نہیں بنے اور مجھ معذور کے ساتھ رشتہ نہ جوڑ سکے۔

ذاتي مان صفاتي ٿيو، صفاتيءَ مان جڳ
آديسي الڪ، مشاهدو محبوب جو

ذاتی سے صفاتی ہوا، اور صفاتی سے تمام کائنات، لا مکانی کا مشاہدہ ظاہری آنکھوں سے نہیں کیاجاسکتا۔

عارف کلہوڑہ

سندھ کے آخری کلہوڑہ حکمران میاں عبدالنبی کے فرزند تھے۔ عبدالنبی جب افغانستان کی طرف فرار ہوئے، تو اپنا اھل و عیال اپنے ولی عہد محمد عارف خاں کے ساتھ، جودھپور کے راجہ بجے سنگھ

کے پاس بھیجدیا. اس کے بعد ابھی میاں عبدالنبی زندہ ھی تھے کہ میاں محمد عارف سنہ ۱۷۹۴ع میں ایک لڑائی میں مارے گئے۔ ان کی تربت لیہ ضلع مظفرگڑھ میں ہے (۱)۔ انہوں نے "مارئی کی راتیں" کہی ھیں (قید و بند کی وہ راتیں جو مارئی نے عمر کوٹ میں کاٹیں). بیس راتیں خود کہی تھیں اور باقی راتیں کہنے کے لئے اپنے فرزند غلام محمد کو وصیت کی تھی، جنھوں نے تیس راتیں مکمل کیں۔ "پہلی رات" میں سے ایک بیت پیش کیا جاتا ہے:۔

چي: عمر! آچ نہ اھڙا ويڻ مياں! مون کي	اے عمر! مجھ سے ایسی ناشائستہ بات نہ کر۔ میں اپنا وطن کیسے
وطن وساري پانھنجو آئون ڇڏيان ڇا کي	اور کس لئے بھلاؤں۔ تو مجھ ضعیف کے ساتھ زبردستی کیسے
تون ڇا ڪندين زور ضعيف سان جي رکندڙ را کي	کرسکے گا جبکہ حفاظت کرنے والا میرا محافظ ہے۔
توڪل ڪوٽ تنھين جو آھي اصل اسان کي	توکل اس کا قلعہ ہے اور ھم لوگ شروع ھی سے اس کے اندر محفوظ
نہ آھي ڪي آن ڪي، ڪنجيون ھٿ قھار جي (۲)	ھیں۔ تمہارے ھاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اس قلعہ کی چابیاں اسی قہار کے پاس ھیں۔

(۱، ۲) "ھفتے، دن اور راتیں" از ڈاکٹر بلوچ ص ۱۵۰، ۱۵۴۔

سنگھار کے ابیات

سنگھار کے ابیات میں محبوب کے حسن و جمال کی تعریف کی جاتی ہے , اور اس کے حسن و زیبائش کے اوصاف کو تشبیہات و استعارات کے ذریعہ زیادہ مؤثر اور رنگین بنایا جاتا ہے۔ یہ صنف ہندی شاعری میں بھی موجود ہے جسے "شرنگار رس" کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ صنف سندھی شاعری نے ہندی شاعری سے اخذ کی ہے , اس لئے سنگھار کے ابیات میں ہندی شاعری کی تشبیہات استعمال کرنے کا رواج ہے۔ اس قسم کے ابیات شاہ عنایت رضوی اور شاہ لطیف کے رسالوں میں بھی موجود ہیں لیکن اس دور میں سنگھار کے خاص دو شاعر ہوئے ہیں , جن میں سے جلال رنگریز اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ جلال کے بعد اس سلسلے میں صابر موچی کا نام لیا جاتا ہے۔

صابر موچی

ایک روایت کے مطابق وہ مدیجی (ضلع سکھر) کے قریب جنگل میں رہتے تھے اور دوسری روایت کے مطابق وہ شکارپور کے باشندہ تھے۔ ان کے مزید حالات معلوم نہیں ہوسکے, البتہ اسقدر پتہ چلا ہے کہ وہ شاہ لطیف کے ہمعصر تھے۔ سنگھار کے بلند پایہ شاعر تھے۔ چونکہ سنگھار کے ابیات میں تشبیہہ کیلئے مختلف زبانوں کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں اس لئے لغوی اعتبار سے وہ الفاظ کا کشکول بنجاتے ہیں۔ صابر کا ایک بیت بطور نمونہ درج ذیل ہے(۱):-

---

(۱) "سندھ کا سنگھار" از عبدالکریم سندیلہ ص ۳۳۔

جھڙا گل گلاب جا انھيء اعليٰ پرين
پسي مين دھن دوست جو مجرو
کيو مھتاب
کيسن ساڻ قريب جي چاڪارنھن
پچندي قاف
ڪن پيا ويس وڏاندرا صابر چٽي
سر صاف
ظاھر اگيئون زاف اچي ڪونہ
عجيب جي

گلاب کے پھول کس قدر خوبصورت ھیں لیکن محبوب ان سے بھی زیادہ خوبصورت ھیں۔ محبوب کا منہہ دیکھکر چاند آداب بجا لایا۔ محبوب کی زلفوں کے ساتھہ کوہ قاف کی سیاھی کیا مقابلہ کرسکتی ہے۔ صابر کہتے ھیں کہ محبوب سفید ململ کا عمدہ اور نفیس لباس پہنتے ھیں۔ کیسا ھی سنگدل کیوں نہ ھو، محبوب کے سامنے آنے کا حوصلہ نہیں کرسکتا۔

جلال دھوبی

مندر ضلع دادو کے باشندہ تھے۔ دھوبی بھی تھے اور رنگریز بھی۔ ان کی تربت دادو کنال کے قریب "پیر طرحے" کے قبرستان میں ہے۔ ان کے مزید حالات معلوم نہیں ھوسکے۔ صرف یہ معلوم ھوا ھے کہ وہ بارھویں صدی ھجری (اٹھارویں صدی عیسوی) میں گذرے ھیں(۱)۔ سنگھار کے باکمال شاعر تھے۔ بڑے اھل دل اور عاشق رسول تھے۔ ان کے سنگھار کے ابیات میں بڑی تاثیر ھے۔ محبوب کے حسن و جمال اور زیبائش و آرائش کا ذکر کرتے ھوئے نہایت ھی خوبصورت تشبیہیں استعمال کی ھیں اور اس سلسلہ میں متعدد زبانوں سے الفاظ مستعار لئے ھیں جس سے ان کے ابیات، لغات کا بڑا ذخیرہ بن گئے ھیں۔ نمونہ کے طور پر ایک بیت پیش کیا جاتا ھے:۔

پھہ رپ پاڄي پرجو، نس رپ راس
نہ روءِ
ڦن رپ ڦور ڦتي ڪئي، آن رپ
آب نہ آوءِ
آل رپ ادب ۾ آيا، ست رپ،
سانگ نہ سوءِ
ڪنجل جو رپ ڪارڊو، مئينڊڪ
جو رپ ھوءِ
آگم رپ نہ اگمي، ڪنڪن اڇي
نہ ڪوءِ
ھڪ تنھنجو جلوو جوءِ، ٻيو جلوو
ناھ جلال ڇئي.

سورج محبوب کا غلام ہے اورچاند
ان کے چہرہ کے آگے ہیچ ہے۔
سور نے ان کے سامنے شوخی
چھوڑدی اور آگ میں تاب نہیں
رہی۔ پھول ان کے سامنے مؤدب
کھڑے ہیں اور ھنس اپنی چال
بھول گیا ہے۔

محبوب کی کمر شیر ببر جیسی ہے
اور بال کالے سانپ جیسے۔ بدن
قوس قزح جیسا ہے اور روپ سونے
جیسا۔ اے محبوب! فقط تیرے
ہی حسن و جمال کا جلوہ ہے، اور
کوئی جلوہ اس دنیا میں نہیں ہے۔

عام شاعری

سندھ کی عام شاعری سندھ کے عام لوگوں کے جذبات کی ترجمان اور ان کے ذھنی معیار کے مطابق ھے۔ اس میں سادگی ضرور ھے لیکن اس سادگی میں بھی حسن ھے۔ اس میں فکری گہرائی زیادہ نہیں ھے لیکن عام انسان کے رھن سہن کی عکسی ضرور ھے۔ یہ شاعری زیادہ تر کوھستان اور لس بیلہ میں پھلی پھولی اور وھاں کے عوام کی انسیت اور ذھنی خوراک کا ذریعہ بنی۔

یہاں اُس دور کے شعرا کا حال بیان کیا جاتا ھے۔ ان کا کلام فنی اعتبار سے سندھی ابیات اور کبت پر مشتمل ھے۔

شیخ حمر

لس بیلہ کے "کڑیانی شیوخ" کے خاندان کے فرد تھے۔ ان کے جد امجد شیخ کڑیو قلات سے نقل مکانی کر کے لس بیلہ گئے اور "حمرانی والاریجا" گاؤں میں آباد ھوگئے۔ شیخ حمر کی ولادت سنہ ۱۷۳۰ع میں ھوئی اور وفات ۱۷۵۰ع اور ۱۷۷۶ع کے درمیانی عرصہ میں (۱)۔ ان کے شعر میں حقیقت کا رنگ چڑھا ھوا ھے اور تمثیلی انداز میں کہا گیا ھے۔ زبان نہایت ھی لطیف اور سلیس استعمال کی ھے۔ ایک شعر بطور نمونہ درج ذیل ھے:-

---

(۱) "بیلائیوں کے بول" (یا بیلہ والوں کے بول) از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ طبع دوم سنہ ۱۹۷۰ع ص ۲۷۲ تا ۲۷۷۔

جھکمک جھروکان، راٹیون رتولن مہ،
کیسر پنین کپڑین ککوریا
کٹیان،
اکیون کجل، منھن ماٹکیون،
پرون پوںئر پریان
منجھان ھیم حمر چئي پھی، پچن
پیان
سرھا سحر سندان تلئ کوثر کنڌيء
تي (۱)

رانیاں شاھی محلوں میں جلوہ گر ھیں جنکے جھروکے جگ مگ جگ مگ کرتے ھیں۔ زعفرانی لباس میں ملبوس ھیں اور عشاق یہ دیکھ کر مخمور ھو رہے ھیں۔ آنکھوں میں کاجل ہے۔ آنکھوں کی پتلیاں اور ابرو بھونرے کی طرح سیاہ ھیں۔ حمر کہتا ہے بڑے اشتیاق اور بےتابی کے ساتھ محبوب کیلئے پوچھتی ھیں۔ وہ بڑے ناز و انداز والیاں ھیں اور کوثر کے کنارے ٹہل رھی ھیں۔

---

(۱) "بیلائیوں کے بول" (یا بیلہ والوں کے بول) از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ طبع دوم سنہ ۱۹۷۰ع ص ۲۸۶۔

وائی اور کافی

نام

"کافی" اور "وائی" پر یہ نام پڑنے کے متعلق مختلف رائیں ھیں۔ بعض کا خیال ھے کہ وائی پراکرت "وایا" سے ماخوذ ھے، اور بعض نے اسے سنسکرت "وارتا" یا "ورت" سے ماخوذ بتایا ھے۔ بعض کا خیال ھے کہ یہ لفظ عربی زبان کے لفظ "واء" سے بنا ھے، جو کلمۂ افسوس ھے۔ بعض نے اسے "وائی" یا "بانی" سے بنا ھوا بتایا ھے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو سندھی کے محاورہ میں یہ لفظ شاہ لطیف نے اپنے کلام میں "آواز"، "الحان"، "پر درد آواز"، "فکر" اور "خیال" کے مفہوم میں استعمال کیا ھے۔ چونکہ "وائی" میں درد دل بیان کیا جاتا ھے، اس لئے اس پر یہ نام پڑگیا ھے۔

"کافی" کے متعلق بھی مختلف آراء ھیں۔ بعض کا خیال ھے کہ کافی موسیقی کے ٹھاٹھ سے نکلی ھوئی راگنی کا نام ھے۔ سندھ میں اس کا یہ حشر ھوا کہ صرف بولوں کو کافی کہا جانے لگا، خواہ "سر" کوئی بھی ھو۔ بعض نے کافی کو مختلف عربی الفاظ سے ماخوذ بتایا ھے مثلاً "کفہ" (دف)، "استکاف" (بھیک مانگنا)، بعض نے اس کی بنیاد فارسی کے مصدر "کافتن" (چیرنا) پر رکھی ھے۔ ایک محقق کا کہنا ھے کہ یہ لفظ قافیہ کا جمع قوافی ھے، جو آخر قافی، اور پھر کافی بنا ھے۔ دراصل یہ لفظ راگ مالا ھی سے لیا ھوا معلوم ھوتا ھے، کیونکہ راگ ودیا میں کافی ایک ٹھاٹھ کا نام ھے۔

تاریخی ارتقا

تاریخی آثار سے معلوم ھوتا ھے کہ سندھ میں کافی کا رواج قدیم زمانہ سے ھے۔ سموں کی شکست اور ارغونوں کے تسلط کے بعد پاٹ کے بعض بزرگوار سندھ سے ھجرت کر کے ھندوستان کے ایک شہر برھان پور میں جا کر آباد ھوئے۔ ان کی خاص محفلوں میں شیخ لاڈ جیو کافیاں گا کر اپنے ھموطنوں کو بہلاتے تھے۔ اس سے ظاھر ھے کہ سندھ میں کافی کا رواج قدیم ھے، لیکن افسوس کہ کافی کا کوئی بھی قدیم نمونہ دستیاب نہیں ھوا جس سے یہ معلوم کیا جا سکے کہ قدیم سندھی کافی فن اور ساخت کے اعتبار سے کس نوعیت کی تھی۔ کلہوڑہ دور کے وائی اور کافی کے بعض نمونے موجود ھیں۔ شاہ عنایت رضوی اور شاہ لطیف کے رسالوں میں وائیاں موجود ھیں، اور اسی دور کے دوسرے شعرا میاں صاحبڈنہ، روحل فقیر اور خلیل لاشاری کی کافیاں بھی موجود ھیں، اور پنجابی شاعر بلھے شاہ کی کافیاں بھی موجود ھیں، جو سندھ میں مشہور اور مقبول ھیں۔

اس دور کی وائیوں اور کافیوں کی فنی ساخت کے تقابلی مطالعہ کے بعد معلوم ھوتا ھے کہ شاہ لطیف اور شاہ عنایت کی وائیوں اور میاں صاحبڈنہ، روحل فقیر، خلیل لاشاری اور بلھے شاہ کی کافیوں کی فنی ساخت تقریباً ایک ھی جیسی ھے۔ شاہ عنایت رضوی کی ایک وائی پیش کی جاتی ھے:-

چانگي چڙھو چڪيو، ڪي جو ڪاڪ تڙاء

۱- ڪرھو سرھو ڏيھہ ۾ تھين ڏپ نہ ڏاء، ڪي جو ڪاڪ تڙاء

۲- ڪرھي ڪرايون رتيون نائي ناگيلا، ڪي جو ڪاڪ تڙاء

۳- پڪون جي پانن جون ھاريائين حلقا، ڪي جو ڪاڪ تڙاء

۴- پاھ پرائي آئيو لالي لڌوڻاء، کي جو کاک تڙاء
۵- وڳ واسيائين پانھجو سيڱي سراھياء، کي جو کاک تڙاء
٦- ھوج پياري ھليا ڏاڻي ڍول ملاء، کي جو کاک تڙاء
۷- ٻنھي کاک کنڌين ھيو وڃي پرلاء، کي جو کاک تڙاء
۸- مومل محتاجون کري عاجزيون اڳياء، کي جو کاک تڙاء
۹- تون سوڍو تون سپرين تون راڻو تون راء، کي جو کاک تڙاء
۱۰- مومل ماڻي مينڌري لٿس گيرب ۽ گاء، کي جو کاک تڙاء

ترجمہ:-

اونٹ نے کاک کے تڑ پر بڑی مزیدار چیز کھائی (یعنی پان کے پتے چبائے)

۱- اونٹ بڑا خوش نظر آتا ہے اور کسی قسم کا خوف و خطرہ محسوس نہیں کرتا

۲- اونٹ نے اپنی گردن جھکا کر اپنی ٹانگوں کو پان کی پیک سے رنگین بنادیا ہے

۳- اور پان کی پیک اپنے حلق سے نکالی ہے

۴- وہ لڈانہ میں خوشبو اور پان کی سرخی لیکر آیا ہے

۵- اور اونٹوں کے پورے گلے کو خوشبو سے مہکادیا ہے

٦- رانو اس کو خوب کھلا پلا کر لے آیا ہے

۷- کاک کے دونوں اطراف میں یہ بات (رانو کی آمد) مشہور ہوگئی ہے

۸- مومل نے آہ و زاری کی اور عجز و انکسار کا اظہار کیا ہے

۹- کہ آپ میرے سوڈھو ہیں، محبوب ہیں، رانو ہیں اور راجہ ہیں

۱۰- مومل نے رانو کو حاصل کرلیا ہے، اور مومل کی ساری شوخی اور سرکشی ختم ہوگئی ہے۔

اس سے معلوم ہوگا کہ کافی کا تھل (مطلع) ایک مصرعہ پر مشتمل ہے، لیکن اس کے حصے ہیں، اور قافیہ دوسرے حصہ میں ہے۔ ہر بند ایک مصرعہ کا ہے اور تھل سے ہم قافیہ ہے۔ شاہ لطیف کی مندرجہ ذیل وائی بھی تقریباً ویسی ہی ہے۔ ترجیعی فقرہ کے علاوہ ہر بند ایک مصرعہ پر مشتمل ہے اور تھل کے ساتھ ہم قافیہ۔ البتہ تھل کے دونوں حصوں میں قافیہ ہے:-

تل :- لوئي م لائون، مون ماروءَ سين لڌيون
سون برابر سڳڙا بانهن ٻڌائون
مون ماروءَ سين لڌيون

۱- سو ڪيئن پٽ پهريان سومرا، گهوريو عمر جو، آئون؟
مون ماروءَ سين لڌيون

۲- ڪاج ڪتيرن سفر و سڳر ۽ سائون
مون ماروءَ سين لڌيون

۳- سا ڪيئن ڪائي ڪارڪون، جنهن ڪي ڏونراڏيهِ ڏنائون
مون ماروءَ سين لڌيون

۴- ڪه مانڌائيون، مڪئي، قوت جنين جو سائون
مون ماروءَ سين لڌيون

ترجمہ :-

یہ لوئی جو میں نے سر پر اوڑھ رکھی ہے، اسی میں میں نے اپنے مارو (خاوند) کے ساتھ شادی کی رسوم ادا کی ہیں۔
شادی کے وقت جو دھاگے میرے ہاتھوں میں باندھے گئے تھے، وہ میری نظر میں سونے سے کم نہیں ہیں۔

۱- اے عمر سومرے! میں یہ ریشم کیسے پہن سکتی ہوں۔ یہ ریشمی لباس غارت ہو۔

۲- موٹا کپڑا پہننے والوں کی خوراک بہت ہی اچھی ہے، جو سنگر اور سائوں ہے(۱)۔

۳- وہ عورت کھجوریں کیسے کھا سکتی ہے، جسے جہیز میں ڈونرے دیئے گئے ہیں۔

۴- ماروؤں کی خوراک کھبھ، ماندھانی، مکھنی اور ساؤں ہے۔

میاں صاحبڈنہ فاروقی نے اس قسم کے کلام کو کافی کا نام دیا ہے۔ ان کی ایک کافی ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ موازنہ سے معلوم ہوگا کہ دونوں کی ساخت ایک جیسی ہے۔ اس کافی کا ہر بند یک سطرہ یعنی ایک مصرعہ پر مشتمل ہے اور تھل کے ساتھ ہم قافیہ۔ تھل کے دو حصے یا دو پد ہیں اور قافیہ دوسرے پد کے آخر میں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یکساں ساخت والے شعر کو زیریں سندھ میں شاہ لطیف اور شاہ عنایت نے وائی کہا ہے، اور بالائی سندھ میں میاں صاحبڈنہ فاروقی نے کافی:-

تل:- ووڑیان ڇا ڪون وڙراہ ۾ جيڏيون آهي جيءَ اندر ۾

۱- صحيح سڄاتم سرتيون دل ۾ آهي دلدار

۲- ڪاڪيون آهي قلوب ۾ ڪيچ ڏڻي ڪوهيار

۳- ناحق وندر ڇو وڃان پاڪر ۾ پوتار

۴- و نحن اقرب اوڏڙو لڌم لالن يار

۵- ساهڙون اوڏو سپرين ڪوہ پڇان پيو پار

۶- صاحبڏني سمجهيو تن اندر تڪرار

ترجمہ :-

اے سہیلیو! میں آسے ان سرسبز و شاداب راستوں پر کیوں تلاش کروں، وہ تو میرے من میں ہے۔

---

(۱) خود رو اناج کی قسمیں۔

۱- اے سہیلیو! میرا محبوب میرے دل میں ہے، میں نے اسے اچھی طرح سے پہچان لیا ہے۔

۲- اے لڑکیو! کیچ کا بادشاہ میرا آقا اور محبوب میرے دل میں ہے۔

۳- میں خوامخواہ "وندر" کو کیوں جاؤں، مالک تو میری آغوش میں ہے۔

۴- و نحن اقرب (سے ثابت ہوا کہ) وہ قریب ہے۔ میں نے اپنے پیارے محبوب کو پالیا ہے۔

۵- محبوب جان سے بھی قریب تر ہے۔ میں کسی اور جگہہ پر اس کی جستجو کیوں کروں۔

۶- اس مادی جسم میں جو کشمکش ہے، صاحبڈنو نے اسے سمجھ لیا ہے۔

روحل فقیر کی کافیاں بھی تقریباً اسی ساخت کی ہیں۔ ایک کافی درج ذیل ہے:-

ٿل:- پوءِ پروڙيم پنڌ، وو، جيجان جوڳيئڙن جو

۱- نڪي ڏاهي هليا، نڪي جوڙيائون هنڌ، وو جيجان جوڳيئڙن جو

۲- نڪي وڄائين مرليون، نڪي چوريائون چنگ، وو جيجان جوڳيئڙن جو

۳- نڪي ڏوتائون ڏوتيون، نڪي ڏوتائون لنگ، وو جيجان جوڳيئڙن جو

۴- نانگا نڪتا ننگ مؤن، تن نانگن کهڙو ننگ، وو جيجان جوڳيئڙن جو

۵- لڳو لاهوتين جو، روحل توکي رنگ، وو جيجان جوڳيئڙن جو

ترجمہ:-

اے سہیلی! میں نے جوگیوں کی راہ پہچان لی ہے۔

۱- انہوں نے چلتے وقت نہ تو اپنی قیام گاہ کو توڑا پھوڑا، اور نہ ہی شروع میں اسے جوڑا تھا۔

۲- وہ نہ تو بین بجاتے ہیں اور نہ ہی چنگ کو حرکت دیتے ہیں۔

۳- انہوں نے نہ اپنی دھوتیوں کو دھویا، اور نہ اپنے جسموں کو۔

۴- جب نانگے (جوگی) ننگ و ناموس ہی سے دست بردار ہوئے، تو پھر انہیں ننگ و عار کیوں ہو۔

۵- اے روحل! تجھ پر لاھوتیوں کا رنگ چڑھ گیا ہے۔

سنگھار کے مشہور شاعر جلال دھوبی بھی اسی دور کے تھے۔ ان کی چند کافیاں بھی دستیاب ہوئی ہیں، اور ان کی ساخت بھی ویسی ہی ہے۔ ایک کافی پیش کی جاتی ہے :-

ٹل :- وئڙم سانگ سنگھار، جيڪس ويڙهيچن آئ وساري

۱- قضا آنديس ڪوٽ ۾، لکئي جي لغار

۲- اچي عمرڪوٽ ۾، ٽيس ڏراڙن ڏار

۳- سيخ محبت سندي، هينڙي منجھ هزار

۴- اٿم اھڙو آسرو، پرچن مان پنھوار

۵- جاني ميڙ جلال چئي، جنھن لئي سڪان سپ جمار

ترجمہ :-

میرے ہم قوم اور ہمسائے یہاں سے کوچ کر کے کہیں اور چلے گئے اور شاید مجھے بھول گئے۔

مجھے اس قلعہ میں قضا لے آئی ہے۔ کیونکہ تقدیر نے یہی لکھا تھا۔

عمرکوٹ میں آ کر میں مال مویشی چرانے والے اعزا اور اقربا سے علحدہ ہوگئی ہوں۔

میرے جی میں محبت کی ہزاروں میخیں جڑی ہوئی ہیں۔

مجھے امید ہے کہ آخر مارو کبھی نہ کبھی مجھ سے راضی ہو جائیں گے۔

جلال کہتا ہے میرے پیارے مجھ سے ملادے جن کے لئے

ہمیشہ تڑپتی رہتی ہوں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلع میں قافیہ کی تبدیلی ہوتی رہتی ہے لیکن کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ شاہ لطیف کے رسالہ میں بعض ایسی وائیاں بھی ہیں جو دو مصرعوں پر مشتمل ہیں اور دونوں مصرعوں کے آخر میں ایک ہی قافیہ ہے۔ اس قسم کی ایک وائی بطور نمونہ پیش کی جاتی ہے:

تھل :- کا جا ڳالھہ ھجي، سا جا لوڪ سڻي،

لو، ٻاروچي جي من ۾

۱- سر سڳر پر پيچري تون جا لوڪ سڻي

۲- سڻي سڳر پڻين، ڪير چوندو مئي

ترجمہ :-

اگر کوئی بات ہو اور لوگ اسے سن لیں، تو وہ محبوب تک ضرور پہنچ جائیگی۔

۱- تم، جس کے متعلق لوگوں نے سنا کہ راہ میں چلی جا رہی تھی

۲- تو پھر کون کہہ سکتا ہے کہ تم مر گئی ہو۔

خلیل لاشاری (۱)

ان کی ایک کافی دستیاب ہوئی ہے، جس کا ہر بند دو مصرعوں پر مشتمل ہے، اور ہر مصرعہ میں دو پد ہیں۔ دونوں مصرعوں کے تین پد ہم قافیہ ہیں اور چوتھے پد کا قافیہ مطلع سے ملتا ہے۔

---

(۱) خلیل لاشاری، اسلام لاشاری گاؤں تحصیل گھوٹکی ضلع سکھر کے باشندے تھے۔ میاں نور محمد کلہوڑہ کے عہد (اٹھارہویں صدی عیسوی) میں گذرے ہیں۔ "سرے کے سر مور" (غیر مطبوعہ) از شیخ محمد فاضل۔

تھل:- کھ کا ڳالھ سڻا واہ وہ، سودا سچ دا ٿيا نھ پھ

۱- ڇاتي دے وچ جھاتي هے، سانون فيض حياتي هے
لڳي اڙک تے جھنگ و ساقي هے، لڳي ڀڙک بره دي باه

۲- خارج خارج کري کري، جاء نہ لھندا ذري ذري
عشق دا پيندا پري پري، گھڙ گھتيان ولي راه

۳- محمود اياز آيل شامل، قابو عشق کيتو ٺي کامل
نفس ندار پڙهن پٺے عامل، عشق بنا گمراه

۴- بکت ڇپت خليل کھاوين، هووين چور تے ساڌ سڏاوين
سؤ ساداتي وچ سهاوين، الار کلا ڦھ ڦاه(۱)

ترجمہ:-

کھہ بول، کوئی مزیدار بات سنا، سچ کا سودا ایکدم ہوگیا

۱- میری نظر اپنے من پر ہے، مجھے ابدی فیض (مشاہدہ) حاصل ہوچکا ہے۔ عشق کے ساتھ تعلق قائم ہوتا ہے تو جنگل بسانا پڑتا ہے اور آگ بھڑک اٹھتی ہے۔

۲- جو لوگ عشق سے الگ تھلگ رہتے ہیں انہیں کوئی منزل نہیں ملتی۔ عشق کی منزل دور ہے اور راہ دشوار۔

۳- محمود اور ایاز ایک دوسرے سے ملے تو عشق نے دونوں کو جکڑدیا، جو لوگ ورد وظیفہ کرتے ہیں اور ان کا نفس سرکش رہتا ہے، وہ عشق کے بغیر گمراہ ہیں۔

۴- تو نام نہاد خلیل ہے، چور ہوکر اپنے آپ کو شریف کہلواتا ہے، اور شرفا کے درمیان بیٹھکر دم زنی کرتا ہے، یہ غرور کی ٹوپی سر سے اتار دے۔

---

(۱) "سرے کے سرمور" اور تذکرۂ شعرائے سکھر۔

یہ کافی اگرچہ سرائکی زبان میں ہے لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شمالی سندھ میں کافی ایک مقبول صنف تھی۔

پنجابی شعرا کی کافیاں بھی اسی ساخت کی ہیں۔ بلھا شاہ (ولادت ۱٦۸۰ع - وفات ۱۷۸۵ع) کی کافی کا نمونہ درج ذیل ہے، جس کا ہر بند دو مصرعوں کا ہے اور شاہ لطیف کی مذکورہ بالا وائی کی طرح ہر بند کے دونوں مصرعے ایک دوسرے سے بھی اور مطلع سے بھی ہم قافیہ ہیں:-

تهل:- اب ڪيون ساجن چر لائيو ري

۱- ايسي آئي من ۾ ڪاءِ، دک سک سپ وچائيو ري
هار سنگار ڪون آگ لڳائون، گهٽ اپر ڍانڊ مچائيو ري

ترجمہ:-

محبوب نے دیر لگائی ہے۔

دل میں کوئی ایسا احساس بیدار ہوا کہ دکھ سکھ کی تمیز ہی نہیں رہی۔

ہار سنگھار کو آگ لگاؤں، کیونکہ میرے دل میں آگ بھڑک رہی ہے۔

بلھا شاہ کی کافیوں کی ساخت خلیل لاشاری کی ساخت سے ملتی ہے۔ اسی قسم کی ایک کافی میں سے ایک بیت بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

تهل:- اب لگن لگی ڪجھ ڪريئي، نہ جي سکئي تي نہ مريئي

۱- تم سنو هماري بينان، مرهي رات ڏي نهين چينان
هن پي بن پلڪ نہ سريئي، اب لگن لگي ڪجھ ڪريئي

ترجم :-

اب تو محبت ہوگئی ہے، کچھ کرنا چاہیئے۔ نہ زندگی نصیب ہے، نہ موت آتی ہے۔

۱- ہماری فریادیں سن لیجئے، رات کو آرام اور چین نہیں ہے۔ اب محبوب کے بغیر ایک ساعت بھی بسر نہیں کی جاسکتی۔ اب تو محبت ہوگئی ہے، کچھ کرنا چاہیئے۔

پنجابی زبان کی کافی کے پہلے شاعر شاہ حسین (وفات ۱۰۰۸ھ) ہیں جن کی کافیاں دستیاب ہوئی ہیں۔ ان کی بعض کافیاں ایسی ہیں جن کا ہر بند ایک مصرعہ کا ہے۔ مثلاً :-

تهل:- ساجن رُٺڙا جاندا وي، مين پليان وي لوڪا

۱- ساجن سيڏاوي، مين ساجن دي، ڪارن وي مين جليان — وي لوڪا

ترجم :-

میرا محبوب مجھ سے روٹھا جا رہا ہے، اے لوگو! مجھ سے بھول ہوئی ہے۔

۱- محبوب میرا ہے اور میں محبوب کا ہوں، اے لوگو! میں اس کی محبت میں جل رہا ہوں۔

ان کی بعض کافیاں خلیل لاشاری کے طرز کی ہیں۔ ایک دوبیت بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے :-

تهل:- متراندي مجماني خاطر لهو دل دا ڇاني دا

۱- ڪيد ڪليجه ڪيتم بيري، سو پي نهين لائق تيري
هور توفيق نهين ڪجھ ميري، اڪ ڪٽورا پاني دا

ترجم:-

دوستوں کی مہمانداری کے لئے خون دل چھان رہا ہوں۔

کلیجہ نکالکر تیرے سامنے پیش کردیا، لیکن وہ بھی تیرے
شایان شان نہیں ہے۔
اب مجھہ میں مزید توفیق نہیں ہے، فقط پانی کا ایک کٹورہ
رہ گیا ہے۔

نتیجہ:

اس فنی موازنہ کے بعد معلوم ہوگا کہ وائی اور کافی ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ جیسے ایک ہی صنف کو بیت اور دوھا کہا جاتا ہے، بالکل اسی طرح ایک ہی صنف کو وائی اور کافی کا نام دیا جاتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ لاڑ میں "وائی" نام مروج تھا اور شمال میں "کافی"۔ شمالی سندھ چونکہ بہاولپور اور پنجاب سے قریب ہے، اور ان علاقوں میں شاعری کی اس صنف کو کافی کہا جاتا تھا، لہذا ہوسکتا ہے کہ اس جغرافیائی قرب کی وجہ سے شمالی سندھ میں یہ نام مروج ہوگیا ہو۔ میرے خیال میں جنوبی سندھ کے لوگ بھی کافی کے لفظ سے آشنا ضرور ہوں گے، لیکن اس قدر نہیں، جس قدر وائی کے لفظ سے۔ پھر شاہ لطیف جیسے عظیم شاعر نے جب وائی کے لفظ کو اپنایا، تو وائی نے کافی کے لفظ پر تقریباً پردہ ڈال دیا۔ شاہ لطیف کے دور کے بعد کافی کا لفظ جابجا مروج ہوگیا کیونکہ حضرت سچل سرمست نے اس میں تنوع اور رنگینی پیدا کر کے اسے شہرت دوام اور قبول عام عطا کیا۔ اس لئے بعد میں کافی کا لفظ لاڑ میں بھی مروج ہوگیا۔

ادبی جائزہ

کلہوڑہ دور کے شعرا کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ یہاں اس دور کی سندھی شاعری کے ارتقا کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے، جس سے

معلوم ہوگا کہ کلہوڑہ دور سندھی شاعری کی ترقی و ترویج کیلئے بہترین دور تھا۔ اسی سنہری دور میں سندھی شاعری ہر پہلو اور ہر نقطۂ نگاہ سے پھلی پھولی اور ترقی کی منزلیں طے کرکے ایک بلند ترین مقام پر جا پہنچی۔

(۱) اسی دور میں شاہ لطیف جیسے عظیم شاعر پیدا ہوئے، جنہوں نے سندھی شاعری کو فکر کی بلندی اور وسعت بخشی، اور فنی پختگی عطا کی۔ ان کے بعد آج تک تمام سندھی شعرا نے ان کا تتبع کرنے کی کوشش کی ہے لیکن کوئی بھی ان کے مقام تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔

(۲) بیت نے فن اور ھیئت کے اعتبار سے ارتقا کی منزلیں طے کرکے پختگی اور وسعت حاصل کی۔ اس کی آرائش اور زیبائش کے لئے شاہ عنایت رضوی نے راہ ھموار کی، اور شاہ لطیف نے اسے عروج کی آخری منزل تک پہنچایا۔ اس دور سے قبل اگرچہ چار مصرعوں تک ابیات کہے گئے تھے لیکن کلہوڑہ دور میں اس سلسلہ میں اور بھی تجربات کئے گئے، اور بیت میں بڑی خوبی اور خوبصورتی پیدا کی گئی۔ صرف یہی نہیں، بلکہ زیادہ مصرعوں پر مشتمل طویل اور پختہ ابیات بھی کہے گئے، جنہیں کبت کہا جاتا ہے۔ یہ کبتیں خصوصیت کے ساتھ مخدوم ابوالحسن، مخدوم محمد ھاشم ٹھٹوی اور مخدوم ضیاء الدین وغیرھم کی دینی کتابوں میں موجود ھیں۔

مضمون کے لحاظ سے بیت میں تصوف کے مسائل بھی جمالیاتی رنگ میں دلکش اور رنگین بنا کر پیش کئے گئے۔ اس دور کے بیت میں حسن و عشق اور ھجر و وصل کا ذکر بھی بڑی خوش اسلوبی سے کیا گیا۔ محبوب کے حسن و جمال کے ساتھ اس کے سنگھار کی ستائش

کے لئے هندی شاعری کے زیر اثر "سینگار" کے نام سے ایک نئی صنف ایجاد کی گئی۔ شاہ عنایت رضوی اور شاہ لطیف کے کلام میں بھی سنگھار کے ابیات موجود هیں لیکن سنگھار کے ابتدائی اور خاص شاعر جلال دھوبی اور صابر موچی هیں۔ ان کے بعد سنگھار کے اور شاعر بھی پیدا ہوئے، لیکن وہ جلال کے درجہ تک پہنچ نہیں سکے۔

(۳) کتب تاریخ سے معلوم ہوا ہے کہ اس دور سے پیشتر بھی سندھ میں "کافی" کے نام سے شاعری کی ایک صنف موجود تھی جو سندھ میں مقبول عام تھی اور گائی بھی جاتی تھی۔ لیکن قدیم دور کی کافی کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہوا۔ پہلی بار شاہ لطیف کے بڑے معاصر، شاہ عنایت رضوی کے رسالہ میں شاعری کی ایک صنف ملی ہے جسے "وائی" کا نام دیا گیا ہے۔ شاہ لطیف نے وائی کو اور بھی پر اثر اور خوبصورت بنایا۔ اسی دور میں شمالی سندھ میں میاں صاحبڈنہ فاروقی اور خلیل لاشاری کے یہاں بھی اسی قسم کا کلام نظر آتا ہے، جسے کافی کہا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شمال میں جس صنف کو کافی کہا جاتا تھا، لاڑ میں اسے وائی کہا گیا۔ آگے چل کر شاعری کی اس صنف نے بڑی ترقی کی اور شمال خواہ لاڑ میں ایک ہی نام "کافی" سے مشہور ہوئی۔ لیکن فنی اعتبار سے اس کی بنیاد میں پختگی کلہوڑہ دور میں پیدا ہوئی، اور اسی بنیاد پر بعد کے شعرا نے خوبصورت عمارت تعمیر کی، اس پر نقش و نگار کرکے اور بھی رنگین اور دلکش بنادیا۔ خاص طور پر حضرت سچل سرمست نے اس کی رنگینی، دلکشی، اثر انگیزی اور فنی پختگی کو بام عروج پر پہنچایا۔

(۴) الف اشباع والی نظم جس کے ہر مصرعہ کے آخر میں

الف بڑھا کر قافیہ بنایا جاتا ہے، پہلی بار شاہ مراد شیرازی اور مخدوم پیرمحمد لکھوی کے کلام میں ملتی ہے۔ اس کے بعد اس دور میں مخدوم ابوالحسن نے اس صنف میں ایک مکمل دینی کتاب مقدمہ"الصلواۃ تصنیف کر کے سندھی ادب میں بڑا اضافہ کیا۔ ان کے بعد مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی، مخدوم عبداللہ، مخدوم عبدالخالق، مخدوم محمد ابراہیم بھٹی، مخدوم عبدالرحیم گرھوڑی، مخدوم غلام محمد بگائی اور دیگر شعرا نے بھی متعدد کتابیں تصنیف کیں۔

(۵) سندھی میں ایک مکمل کتاب لکھنے کا آغاز اسی دور سے ہوا۔ اس قسم کی پہلی کتاب مخدوم ابوالحسن کی مقدمہ"الصلواۃ ہے۔ اس کے بعد مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی اور دیگر مصنفین نے متعدد تصنیفیں کیں۔ دینی کتب کے علاوہ سندھی شعر کے مجموعے تیار ہوئے اور لکھے گئے، جنہیں "رسالہ" کا نام دیا گیا۔ شاہ لطیف کا رسالہ اسی دور کی یادگار ہے۔

(۶) مولود کی صنف کی ابتدا پہلے سے ہو چکی تھی، لیکن مخدوم غلام محمد بگائی اور مخدوم عبدالرؤف بھٹی کی منظوم کردہ مولودوں میں یہ صنف اپنے عروج کو پہنچی۔ ان کے بعد کئی شعرا نے مولود کہے اور مولود نے بڑی ترقی کی۔

(۷) سندھی کی مدحیں، منقبتیں اور معجزے بھی اسی دور کی یادگار ہیں۔ معجزوں اور منقبتوں کے پہلے شاعر مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی تصنیف قوۃالعاشقین میں حضور انور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے بھی درج ہیں اور منقبتیں بھی۔ مدح کے ابتدائی شاعر جمن چارن ہیں۔ ان کے بعد مخدوم غلام محمد بگائی اور میاں سرفراز کلہوڑہ کی مدحیں ملتی ہیں۔ میاں سرفراز مدح کے بلند مرتبت اور بے نظیر شاعر ہیں۔

(۸) سندھی شاعری کو عروض کے قالب میں بھی اسی دور میں ڈھالا گیا۔ مخدوم عبدالرؤف بھٹی پہلے شاعر ھیں جن کے متعدد مولود عروض کی بحروں اور وزنوں کے مطابق ھیں۔ میاں سرفراز کی مدح میں بھی عروض کے اثرات کارفرما ھیں۔ عروض کے قواعد و ضوابط کے مطابق سندھی کی غزلیں بھی سب سے اول اسی دور کی ملی ھیں۔ نور محمد خستہ، حافظ حالی اور میاں چھتن کی غزلوں کے نمونے دستیاب ھوئے ھیں۔ ان کی زبان لطیف اور تغزل کے شایان شان ھے۔

باب ششم

ٹالپوروں کا دور (۱۷۸۳ء — ۱۸۴۳ء)

تاریخی پس منظر

سنہ ۱۷۸۲ء میں کلہوڑوں اور ٹالپوروں کے درمیان ہالانی کے قریب جنگ ہوئی جس میں میر فتح علی خان ٹالپور فتحیاب ہوئے اور کلہوڑہ حکومت کا خاتمہ ہوا۔ ہالانی کی فیصلہ کن جنگ کے بعد حکومت کے استحکام کی خاطر میر فتح علی خان نے اپنے تین بھائیوں میر غلام علی، میر کرم علی اور میر مراد علی کو بھی کاروبار حکومت میں شریک کر لیا۔ اس طرز حکومت کا نام "چویاری" رکھا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد میر فتح علی خان نے سندھ کی حکومت کو سات حصوں میں تقسیم کر دیا، جس میں سے چار حصے ان کی "چویاری" نے لے لئے۔ ان کا دارالحکومت حیدرآباد میں رہا، باقی تین حصوں میں سے دو حصے سہراب خان کو ملے جن میں پورا شمالی سندھ شامل تھا۔ ان کا دارالحکومت خیرپور مقرر ہوا۔ ایک حصہ میر ٹھارو خان کو ملا، جس کا دارالحکومت میرپور خاص متعین ہوا۔

میر فتح علی خان کے بعد سندھ کے حکمران میر غلام علی خان ہوئے۔ انہوں نے بھی اپنے بھائیوں میر کرم علی خان اور میر مراد علی خان کو حکومت کے کاروبار میں شریک کیا۔ میرپور خاص کے حکمران میر ٹھارو خان کے ساتھ میر غلام علی خان کی لڑائی ہو گئی لیکن آخرکار آپس میں شیر و شکر ہو گئے۔ میر فتح علی خان

کے آخری ایام میں سندھ کو امن و سکون نصیب ہوا۔ میر غلام علی خان کا دور ٹالپور حکومت کے عروج کا دور تھا۔ اس دور میں ایران اور افغانستان کے ساتھ سندھ کے تعلقات استوار ہوئے۔ بہاولپور کے نواب محمد صادق سے میر غلام علی کی جنگ ہوئی جس کے نتیجہ میں سبزل کوٹ اور بھنگ بھاڑ والے حصے سندھ کے قبضہ میں آئے۔ افغانستان کے حکمران شاہ شجاع الملک فوج لیکر سندھ پر چڑھ دوڑے۔ میر غلام علی خان بھی مقابلہ کے لئے ایک بڑی فوج لیکر شکارپور کے قریب پہنچ گئے، لیکن جنگ نہیں ہوئی اور دونوں کے درمیان صلح ہوگئی۔ ۲۲۔ اگست سنہ ۱۸۰۹ء کو ٹالپوروں اور انگریزوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ اس معاہدہ کے تین سال بعد ۱۸۱۲ء میں میر غلام علی خان نے انتقال کیا۔ ان کے بعد میر کرم علی خان تخت نشیں ہوئے۔ ان کے عہد حکومت میں عمر کوٹ کا قلعہ فتح ہوا، جس پر جودھپور کے راجہ کا قبضہ ہوگیا تھا۔ کوھستان کے علاقہ میں "رنی کوٹ" کے نام سے ایک وسیع و عریض اور مضبوط و مستحکم قلعہ ان ھی میر صاحب کے عہد میں تعمیر ھوا۔ میر کرم علی خان نے سنہ ۱۸۲۸ء میں انتقال کیا۔ ان کے بعد میر مراد علی خان سندھ کے حکمران ہوئے۔ سنہ ۱۸۳۰ء میں خیرپور کے میر سہراب خان کا انتقال ھوا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے فرزند میر علی مراد خان کا اپنے بڑے بھائی میر رستم خان کے ساتھ تنازعہ ھوا جس سے انگریزوں کو موقعہ مل گیا اور انہوں نے میر علی مراد خان کی طرفداری میں میر صاحبان پر دباؤ ڈالا۔ سنہ ۱۸۳۱ء میں الیگزینڈر برنس پنجاب جانے کے لئے دریائے سندھ کے ذریعے سفر کرتے ہوئے گذرے اور انگریز نے اسی بہانہ سے تمام سندھ کو

دیکھ لیا۔ سنہ ۱۸۳۲ء میں میر صاحبان اور انگریزوں کے درمیان ایک معاھدہ ھوا، جس کی رو سے انگریزوں نے میر صاحبان کی یہ شرائط قبول کیں کہ (۱) کوئی انگریز سندھ میں مستقل سکونت نہیں کریگا (۲) کوئی انگریز تاجر بغیر پاس کے سندھ میں نہیں آئیگا (۳) انگریزوں کا کوئی جہاز سندھ میں نہیں آئیگا (۴) سندھ میں جنگی ساز و سامان نہیں لایا جائیگا۔ سنہ ۱۸۳۳ء میں میر علی مراد خان نے انتقال کیا۔

اس کے بعد دوسری "چوپاری" قائم ھوئی، جس میں میر نورمحمد خان، میر نصیر خان، میر محمد خان اور میر صوبدار خان شامل ھوئے۔ میر نورمحمد خان اس چوپاری کے سربراہ بنے۔ سنہ ۱۸۳۴ء میں افغانستان کے معزول حکمران شاہ شجاع دوسری بار بھٹکتے ھوئے سندھ میں آئے۔ سکھر میں کھرڑی کے میدان پر افغانوں اور میر صاحبان کے درمیان جنگ چھڑی، جس میں بڑی خونریزی ھوئی۔ اسی سال (۱۸۳۴ء میں) انگریزوں اور میر صاحبان کے درمیان ایک نیا معاھدہ ھوا جو بہت ھی سخت تھا۔ سنہ ۱۸۳۷ء میں پنجاب کے راجہ رنجیت سنگھ نے سندھ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا لیکن انگریزوں نے حرفت کرکے رنجیت سنگھ کو روکدیا، اور اس طرح میر صاحبان کو اپنا احسان مند بنایا۔ ۲۰۔ اپریل سنہ ۱۸۳۸ء کو انگریزوں نے میر صاحبان کے ساتھ ایک نیا معاھدہ کیا، جس کی رو سے انگریزوں کا سفیر سندھ میں رھنے لگا۔ اسی سال پہلی انگریز۔ افغان جنگ کے موقعہ پر انگریزی فوج زبردستی سندھ سے گذر کر کابل گئی اور بکھر کا قلعہ بھی میر رستم خان سے لے لیا گیا۔ بعد میں کراچی کے سیٹھ ناؤں مل کی غداری کے باعث انگریزوں نے کراچی پر قبضہ کر لیا۔ سنہ ۱۸۴۱ء میں میر نورمحمد خان نے انتقال کیا اور میر نصیر خان تخت نشین ھوئے۔

سنہ ۱۸۴۲ء میں سر چارلس نیپئر جیسے فرعون صفت شخص کو ایک نیا اور سخت قسم کا معاہدہ کرنے کے لئے بھیجا گیا، جس نے میر صاحبان کو تنگ کرنا شروع کردیا۔ آخر سنہ ۱۸۴۳ء میں میر صاحبان اور انگریزوں کے درمیان "میانی" میں جنگ چھڑ گئی۔ میدان کارزار گرم ہوا۔ سندھی سورمے اور بلوچ بڑی بہادری کے ساتھ لڑے، زبردست اور انتہائی خونریز جنگ ہوئی، جس میں سندھ کے کئی دلیر اور جنگجو شہید ہوئے۔ انگریزوں کی فتح ہوئی اور وہ حیدرآباد کے قلعہ میں داخل ہوکر قلعہ اور میر صاحبان کی حویلی کو لوٹنے کھسوٹنے لگے۔ ۱۲- مارچ ۱۸۴۳ء کو لارڈ ایلنبرو کے ایک اعلان نے سندھ کو برطانوی حکومت کا حصہ بنادیا۔ میر نصیر خان کو پونہ بھیجدیا گیا جہاں سنہ ۱۸۴۵ء میں انہوں نے انتقال کیا۔

میانی کی جنگ کے بعد میرپور خاص کے حکمران میر شیرمحمد خان ایک بڑی فوج لیکر انگریزوں کے مقابلہ کے لئے میدان میں آئے۔ "دو۔ آبہ" کے قریب زبردست جنگ ہوئی، جس میں میر شیرمحمد خان کے سپہ سالار ہوشو شیدی نے یہ نعرہ بلند کیا:

"مر ویسوں، پر سندھ نہ ڈیسوں"۔

یعنی مر جائیں گے لیکن سندھ نہیں دینگے۔ ہوشو شیدی نے اپنا قول پورا کیا، سندھ کی آزادی کے لئے خون کے آخری قطرہ تک بڑی مردانگی اور بلند حوصلگی کے ساتھ لڑا۔ مادر وطن سندھ کی عزت و عظمت پر میدان جنگ میں اپنا سر قربان کر دیا، لیکن ھتھیار نہیں ڈالے۔ اس جنگ میں بھی انگریزوں کو غلبہ حاصل ہوا، اور اس طرح تمام سندھ پر ان کا تسلط ھوگیا۔

ٹالپوروں کے دور میں سندھ کے اندر امن و سکون تھا۔ حکمرانوں

کے دروازے ہر خاص و عام اور ھندو اور مسلمان کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ میر صاحبان بڑے علم دوست اور ادب پرور تھے۔ شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ خود بھی شعر کہتے تھے اور علما و شعرا کی بیحد قدر کرتے تھے۔ فقرا اور درویشوں سے غیر معمولی عزت اور احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اگرچہ مذھباً شیعہ تھے لیکن ان میں مذھبی تعصب نہیں تھا۔ اھل سنت اور اھل تشیعت کے ساتھ یکساں سلوک کرتے تھے۔ اس زمانے میں فارسی شاعری کا اچھا خاصا چرچا تھا۔ اس دور کے حسب ذیل فارسی گو شعرا کے اسما قابل ذکر ھیں :- میر جان علی شاہ رضوی (روھڑی)، آخوند محمد بچل انور، سید عظیم الدین ٹھٹوی، میر کرم علی خان، میر مراد علی خان، میر شہداد خان، میر نصیر خان، نواب ولی محمد خان لغاری، شیوک رام عطارد، طوفان ٹھٹوی، مرزا مظھر طباطبائی، محمد ابراھیم ابری، حضرت پیر صاحب پاگارہ صبغت اللہ شاہ راشدی، ملا اویس، ملا صاحبڈنہ، محمد عارف صنعت (شکارپور)، سید وفا لکھوی، سید شجاع لکھوی، غلام علی ٹھٹوی وغیرھم۔

اس زمانہ میں سندھی شاعری نے بھی بڑی ترقی کی۔ خاص طور پر سندھی زبان میں عروضی شاعری کا رواج عام ھوا، اور سندھی میں عربی اور فارسی الفاظ کا اضافہ ھوا۔ سندھی کافی نے بھی اس دور میں کافی ترقی کی اور اس میں مزید رنگینی، دلکشی اور نغمگی پیدا ھوئی۔ شعرا نے صرف عروضی شاعری ھی پر طبع آزمائی نہیں کی، بلکہ قدیم نوع کی سندھی شاعری کے ذخیرہ میں بھی کافی اضافہ ھوا۔

اس دور میں سندھی شعر کی ھر صنف نے ترقی کی۔ سندھی

بیت میں وسعت اور رنگینی پیدا ہوئی۔ کافی بھی درجہ کمال کو پہنچی۔ سندھی نظم میں دینی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ قصے اور کہانیاں بھی منظوم کی گئیں۔ مدحیں، مناجاتیں، منقبتیں، معجزے اور مولود بھی کہے گئے، مرثیے اور غزلیں بھی کہی گئیں۔

"کافی" کا رواج پہلے ہی سے موجود تھا، لیکن خاص طور پر اس دور میں کافی نے خوب ترقی کی۔ متعدد باکمال شعرا پیدا ہوئے، جنہوں نے اس میں مزید وسعت، رنگینی اور فنی پختگی پیدا کی، اور کافی سندھ کے کونہ کونہ میں گونجنے لگی۔ صوفی شعرا نے کافی کو درجۂ کمال تک پہنچایا اور اسے ان کی بیٹھکوں میں، اور ان چوپالوں میں گایا گیا، جو سندھ کے ہر شہر، ہر قصبہ، ہر گاؤں اور ہر بستی میں موجود تھیں۔ اس طرح کافی سندھ کا حسن، سندھ کی جان، اور سندھ کا آنس بنگئی اور اہل سندھ کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہوگئی۔ ذیل میں اس دور کے شعرا کا ذکر کیا جاتا ہے:۔

حضرت سچل سرمست

اس دور میں کافی کے اولین باکمال اور عظیم ترین شاعر سرتاج الشعرا، شاعر ہفت زبان حضرت سچل سرمست ہیں۔ ان کی ولادت ۱۱۵۳ھ(۱۷۳۹ء) میں ہوئی۔ ان کا اصل نام عبدالوہاب تھا، لیکن ان کی راست گوئی اور راست بازی کی وجہ سے ان کو سچو، سچل اور سچیڈنہ کے نام سے پکارا جانے لگا۔ ان کا نسبی سلسلہ حضرت عمر فاروق رضہ سے جا ملتا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضہ کی اولاد میں سے شیخ شہاب الدین، محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ میں وارد ہوئے تھے، جنہیں محمد بن قاسم نے سندھ کی فتح کے بعد سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ سندھ میں اس خاندان میں سے کئی بزرگ ہستیاں پیدا ہوئیں،

جن میں سے حضرت خواجہ محمد حافظ عرف سائیں صاحبڈنہ درگاہ درازا کے سلسلہ کے بانی ھیں۔ حضرت سچل سرمست ان کے فرزند خواجہ صلاح الدین کے نور نظر تھے۔ حضرت خواجہ محمد حافظ کے سجادہ پر ان کے چھوٹے صاحبزادہ اور حضرت سچل سرمست کے چچا خواجہ عبدالحق جلوہ افروز ہوئے جو حضرت سچل سرمست کے پیر طریقت بھی تھے۔ سچل سرمست نے ظاھری علوم کی تکمیل کی۔ قرآن مجید حفظ کیا اور عربی اور فارسی زبانوں میں مکمل دسترس حاصل کی۔ ۱۴ رمضان سنہ ۱۲۲۲ھ (۱۸۳۹ء) کو رحلت فرمائی۔ متعدد طالبان حق ان سے فیضیاب ہوئے۔ خیرپور کے ٹالپور حکمران بھی ان سے عقیدت رکھتے تھے اور ان کا بہت احترام کرتے تھے۔

سچل سرمست سندھی زبان کے عظیم شاعر تو تھے ھی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ فارسی، اردو، ھندی، سرائکی، ملتانی اور پنجابی زبانوں کے بھی بلند پایہ شاعر تھے۔ فارسی میں ان کے دو دیوان "دیوان آشکار" اور "دیوان خدائی"، اور دس مثنویاں ھیں، جنھیں محترم قاضی علی اکبر درازی نے سندھی اور آردو ترجمہ کے ساتھ چھپوا کر شایع کیا ھے۔

موضوع کے لحاظ سے سچل سرمست کا کلام "ھمہ اوست" اور "منصوری مسلک" (انا الحق) کا ترجمان ھے۔ وہ انسان کے مجد و شرف کے قائل ھیں۔ ان کا تمام تر کلام رندی، بے باکی اور جذب و سرمستی کا آئینہ دار ھے، اور کیف، دلکشی اور رنگینی سے معمور۔ فنی اعتبار سے ان کی کافی میں بڑی وسعت اور گہرائی ھے۔ فن اور ھیئت کے لحاظ سے ان کی کافی کے بیس سے زیادہ نمونے ملے ھیں۔ جذبات و احساسات کے اعتبار سے ان کی کافی ان کے رندانہ اور عارفانہ مزاج کی عکاس ھے۔ کہیں جذب و سرمستی کی کیفیت ھے اور

کہیں عجز و انکسار کا اظہار۔ معرفت کے نکات کی توضیع و تشریح کے ساتھ ساتھ حسن و عشق کا ذکر بھی نظر آتا ہے۔ وحدۃالوجود کا فلسفہ سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں:-

سڀ ڪنهن پار پريءَ جو پرتو، خوابڻ عين ڪلايو

۱- وحدت مون وو ڪثرت ڪيائين، رنگيءَ رنگ رچايو

۲- تون، مان جي پردي مون ٻاهر، سرتيون ڇو نہ سڏايو

۳- طرحين طرحين پوشاڪان پهري، لالڻ پاڻ لڪايو

۴- هيءَ سڀ حسن هاديءَ جو آهي، ڀينر ڪيم ڀلايو

۵- پاڻ ڳجهو ڪيائين پڌرائي ۾، هيءَ تنهن هنر هلايو

۶- سچيڊني جي صورت ۾ تنهن اهڙي رمز رلايو

ترجمہ:-

ہر سو اور ہر جہت محبوب کا جلوہ ہے، جس نے نیند سے آنکھیں کھلوادی ہیں۔

۱- وحدت سے کثرت کر کے عجیب رنگ رچایا ہے۔

۲- اے سہیلیو! "من و تو" کے پردہ سے باھر آ کر کیوں نہیں دیکھتی ہو۔

۳- محبوب نے قسم قسم کے لباس پہن کر اپنے آپ کو چھپالیا ہے۔

۴- اے بہنو! مجھے بہکانے کی کوشش نہ کرو، یہ تمام حسن و جمال اس ھادی کا ہے۔

۵- اس کی حرفت دیکھئے کہ اظہار میں اخفاء کیا ہے یعنی ہر چیز کو ظاہر کر کے خود کو اس میں چھپا دیا ہے۔

۶- یہ بھی اس کی ایک رمز ہے کہ سچل کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔

عاشق، محبوب کے فراق میں تڑپ رہا ہے اور وصل کیلئے اظہار بے تابی کرتے ہوئے آہ و زاری کرتا ہے:-

آهي هھڑو حال ويچاريءَ جو، سهڻا ڪر ڪو ڪرم ستاريءَ جو

۱- لئي پنهل جي ڪانگ اڏايان، ڪونيو پوتيدار پتايان
ور وري ور واريءَ جو

۲- حال ڏسي پنهنجو پال پلائيج، پر پڇاڻو ورھ ورائيج
ڪيچ ڏيپ دارون ڏک واريءَ جو

۳- درد فراق جا دونهان دکن ٿا، مچ مگر هن من مچن ٿا
شل ور وري ويچاريءَ جو

۴- سڪ سچل جي توکي ساري، ڪيچي ايندم نرتئون نهاري
ساه سکي سڪ واريءَ جو

ترجمہ :-

بیچاری کا حال یہ ہے، اے محبوب! نظر کرم فرما کر لاج رکھئیے گا۔

۱- پنھوں کے لئے کوے اڑاتی ہوں، فال دیکھنے والوں کو بلا کر فال نکلواتی ہوں

کہ خاوند والی کا خاوند واپس آجائے۔

۲- میرا حال دیکھکر اپنا کرم کر، جو سال گذرا،

اسکو واپس لا بیمار کا علاج کر۔

۳- فراق کے درد نے دھوئیں پھیلادیئے ہیں، اور دل میں آگ سلگ رہی ہے

خدا کرے بیچاری کا خاوند واپس آجائے۔

۴- سچل کی محبت تجھے یاد کرتی ہے، کیچ والا (پنھوں) آ کر اپنی نظر کرم سے نوازے گا

محبت کرنے والی کی جان مشتاق اور بے تاب ہے۔

(۲)

هوت اسان وٽ ايندا، وٺي نال پي نيندا

۱- سو دلاسا سرتيون، هن ڏکيءَ کي ڏيندا
گولي پاڻ گڏيندا

۲- پکا پاڇاڻين جي، اوڏا آڻ اڏيندا
ڇوري تان نہ ڇڏيندا

۳- جانچي ڏسجو جيڏيون، هڪ ٿکيءَ سان ٿيندا
وري پوءِ نہ ايندا

۴- پسي حال حقير جو، بديون تان بخشيندا
"سچو" ناءُ سڏيندا

ترجم :-

هوت (پنھوں) میرے پاس آئینگے، اور مجھے اپنے ساتھ لیجائینگے

۱- اے سہیلیو! وہ اس دردمند کو سینکڑوں دلاسے دینگے
اور اس کنیز کو اپنی کنیزوں میں شامل کرینگے

۲- وہ اپنا نشیمن میرے قریب آکر تعمیر کرینگے
مجھے تنہا چھوڑ نہیں دینگے

۳- اے سہیلیو! تم خود اچھی طرح سے دیکھ لینا، وہ اس عاجز و درماندہ سے مل کر ایک ہو جائینگے
اور پھر لوٹ کر نہیں جائینگے

۴- اس حقیر کا حال دیکھکر تمام خطائیں معاف کر دینگے
اور مجھے "سچو" کہکر بلائینگے

حضرت سچل سرمست نے کافی کے ساتھ ساتھ بیت میں بھی بڑی وسعت اور رنگینی پیدا کی۔ ان کے ابیات میں فکر کی گہرائی

بھی ہے اور خوبصورت الفاظ کا استعمال بھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے جو قافیے استعمال کئے ہیں، ان میں بھی جدت، ندرت اور انفرادیت ہے، جس سے بیت میں مٹھاس اور روانی پیدا ہوئی ہے۔ فرماتے ہیں:-

وروٺا ويڙهيچن جا اهي موتئين مالهڙيون
راس نه اچن روح کي ٿالهه ۽ ٿالهڙيون
سنگهارن جون سومرا، چڱيون چالڙيون
جو فجر ڦوڪي سنديون، کن دانهه دالڙيون
درسي لويون لاک جون، ٻن شال شالڙيون
اٿ ئي ڀهر آهن اکيون، منهنجون عمر آلڙيون
ڪامل تنهنجي ڪوٽ ۾، وجهان فلڪين فالڙيون
شال سڻندو سو ڏڻي، مون نذر نالڙيون
وڃي ڳجهيون ڳالهڙيون، ڪنديس سرتين سان سائيهه ۾.

میری ھمسائیوں کی چوٹیاں موتیوں کی مالائیں ہیں۔ میرے دل پہ طشت اور طشتریاں اچھی نہیں لگتی ہیں۔ اے سومرے! سنگھاروں (ماروؤں) کا رہن سہن اچھا ہے۔ جو صبح سویرے اٹھکر خودرو اناج کو صاف کرکے اس سے دالیں نکال کر پکاتے ہیں۔ لاکھ میں رنگی ہوئی لوئی اچھی ہے، ریشمی شالیں جہنم میں جائیں۔ اے عمر! میری آنکھیں آٹھوں پہر نم آلود رہتی ہیں۔ میں تیرے قلعہ میں بیٹھکر فال نکالتی رہتی ہوں۔ وہ مالک مجھ ضعیف کی فریاد سنے گا۔ وطن جا کر اپنی سہیلیوں کو راز کی باتیں بتاؤنگی۔

حضرت سچل سرمست کی فکری گہرائی کا اندازہ حسب ذیل ابیات سے لگایا جا سکتا ہے۔

سندھی	اردو
(۱)	(۱)
هڪ سفر ساعت، ٻيو سفر سال جو پهريون تا راحت، پويون تا پوءِ ٿيو.	ایک سفر تو ایک ھی ساعت کا ھے، اور دوسرا سال بھر کا۔ پھلا سراسر راحت ھے، اور آخری تو پھر آخری ھی ٹھیرا۔
(۲)	(۲)
جتي ماڻهن ميڙ آهه، آءُ تتي نا هيان سسي سنباهيان، پنيءَ شاه حلاج جي	جہاں لوگوں کا ھجوم ھے، وھاں میں نہیں ھوں، میں سر ھتھیلی پر رکھ کر منصور کے پیچھے جا رھا ھوں۔

مراد فقیر

حضرت سچل سرمست کے ھمعصر مراد فقیر بیت اور کافی کے اچھے شاعر تھے۔ روحل فقیر کے نسبتی بھائی اور مرید تھے۔ سنہ ۱۷۴۲ء یا سنہ ۱۷۴۳ء میں متولد ھوئے اور ۱۷۹۶ء کے قریب انتقال کیا۔ ھندی، سرائکی اور فارسی زبانوں کے بھی اچھے شاعر تھے۔ ان کا اکثر کلام ابیات پر مشتمل ھے۔ متفرق ابیات بھی کہے ھیں اور بعض عنوانات پر سلسلہ وار بھی۔ اس کے علاوہ سہ حرفیاں بھی کہی ھیں۔ ان کے ابیات کا ایک سلسلہ "عشقیہ" کے نام سے موجود ھے جس میں معرفت کی راہ کی چھ منزلیں بیان کی گئی ھیں۔ ھر منزل کا حال ایک طویل بیت کے ذریعہ بیان کیا گیا ھے جو کبت کا بہترین نمونہ ھے۔ پھلی منزل سے متعلق بیت بطور نمونہ پیش کیا جاتا ھے:-

پهرين منزل — درد

پهرين منزل تن جي، گهاٽي درد چون
بانڪا بي پرواه ٿي وڃي هيج هلن
جت حاجت ناهه هلڻ جي، سر پر
آت رڙهن
تنگ تاريڪي جاه جي ڏسي
ڪين پلن
ٻولي ٻولين ڪينڪي، توڙي
سور سهن
اندر اورين پاڻ سان ٻاهر ڪين سلن
سختيون ڏونگر جون ڏسي طالب
نا ترسن
اکيون پريل آب سان پر ڦوڙها
ڪين ڇنڊين
همت ساڻ مراد چوي، سي چاڙها
سخت چڙهن
موجون محبت جون سي، ماڻيو
ٿا ماڻين

پهلی منزل — درد

پهلی منزل درد کی وادی کو کہتے ہیں۔ بہادر اور بے پروا بڑے اشتیاق سے چلتے ہیں۔ جہاں پاؤں سے چلنے کی گنجائش نہیں ہوتی، وہاں سر کے بل رینگتے ہیں۔ گذرگاہ کی تنگی اور تاریکی دیکھ کر راستہ نہیں بھولتے۔ حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے، خواہ کتنی ہی اذیت کیوں نہ برداشت کریں۔ دل کا حال اپنے آپ ہی سے کہتے ہیں، کسی اور کو کچھ نہیں بتاتے۔ پہاڑ کی دشواریاں دیکھ کر ٹھیرتے نہیں ہیں۔ آنکھیں آنسوؤں سے پر، لیکن ایک قطرہ نیچے نہیں گراتے۔ مراد کہتا ہے جو طالب حوصلہ کرکے دشوارگذار بلندیوں پر چڑھ جاتے ہیں، وہ مسلسل محبت کے مزے لیتے رہتے ہیں۔

ان کے کلام سے چند اور ابیات بھی پیش کئے جاتے ہیں:-

(۱)

جن کي سيٺھ سڄ جي، سي ترهي
تات نہ ڪن
ڪڍن نہ ڪاڻ ڪنيار جي، پيلي
تني نہ پلن
رکني روح رضا تني ٿا طالب تار ترن
سي محبتي مڙن وڃي محب ساڻ
مراد چئي

(۱)

جن کے پاس سچائی کی مشک ھے وہ کوئی اور سہارا نہیں ڈھونڈتے۔ وہ کمہار کی خوشامد نہیں کرتے اور کچا گھڑا دیکھکر ورغلا نہیں جاتے - ایسے طالب اپنی روح کو راضی برضا کر کے تیرتے ھیں۔ مراد کہتا ھے کہ یہ محبت کرنے والے آخر جاکر محبوب سے ملتے ھیں۔

(۲)

ڪني، ڪوجهي، ڪوڙي، نوري
نماڻي
هٿئون وٺي جنهن جي ڪو پٽي
نا پاڻي
سا محلن منجھ مراد چئي ٿي
مرڪي مهاڻي
جيلهان سمي سيباڻي، تيلهان سونهين
منجھ سرتئين

(۲)

نوری گندی، بدصورت، جھوٹی اور حقیر جس کے ھاتھ سے کوئی پانی لیکر پینا بھی گوارا نہ کرے مراد کہتا ھے کہ اب وہ مچھلیاں پکڑنے والی شاھی محل کی زینت بنی ھوئی ھے، اور جب سے جام سمہ کو پسند آئی ھے، تب سے سہیلیوں کے درمیان خوب سج رھی ھے -

(۳)

سائل سڻي آئيو سهڙ سر سندوء
ڪڏهن ڪونہ ھڏوء تہ ڪو هٿئون
موٽيو منگتو

(۳)

یہ سائل تیرے عظیم المرتبت سر کی بات سنکر آیا ھے کبھی یہ سننے میں نہیں آیا کہ یہاں سے کوئی بھکاری خالی ھاتھ گیا ھو۔

پیر محمد راشد

سید محمد بقا جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، ان کے اٹھارہ فرزند تھے، جن میں سے مشہور پیر محمد راشد (صاحب الروضہ) تھے۔ ان ھی بزرگ نے درگاہ پیر گوٹھ کی بنیاد رکھی، اور راشدی خاندان ان ھی کے نام سے منسوب بھی ہوا اور مشہور بھی۔ سنہ ۱۱۷۰ھ (۱۷۵۶ع) میں متولد ہوئے اور ۷ شعبان سنہ ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ع) کو ان کی شہادت واقع ہوئی۔ ظاہری تعلیم مخدوم محمد عاقل (قصبۂ کھہڑا) سے حاصل کی، اور باطنی فیض اپنے والد ماجد اور حضرت مخدوم محمد اسماعیل (پریان لوء) سے۔ اور خود سندھ، بلوچستان، جودھپور، جیسلمیر اور کچھ کے ہزارہا عقیدتمندوں کو اپنے سرچشمۂ فیض سے سیراب فرمایا۔ ان کے مریدوں میں بڑی بڑی بزرگ ہستیاں بھی گذری ھیں، جن میں سے خلیفہ محمد حسین درگاہ سوئی شریف کے بانی اور سجادہ نشین، خلیفہ محمود کڑیہ والے، خلیفہ نبی بخش لغاری اور خلیفہ گل محمد ہالائی کے دادا قابل ذکر ھیں۔

سید صاحب بہت بڑے عالم و فاضل تھے۔ ان کے ملفوظات ان کے دو بڑے خلیفوں محمد حسین مہیسر اور محمود نظامانی کڑیہ والے نے مرتب کئے ھیں۔ اس کے علاوہ ان کے "مکتوبات"، "شرح اسمائے حسنیٰ" اور لغت میں "جمع الجوامع" یادگار تصنیفات ھیں۔ سندھی اور فارسی میں شعر بھی کہا ہے۔ سندھی میں بیت کے علاوہ مولود اور کافی پر بھی طبع آزمائی فرمائی ہے۔ حسب ذیل بیت میں عقیدۂ وحدۃ الوجود پر اظہار خیال کیا ہے:-

وحدت مان کثرت ٿي، کثرت وحدت کل	وحدت سے کثرت ہوئی، کثرت اور وحدت دراصل ایک ھی چیز ہے۔

اندر ٻاهر سپرين، ڀول نہ ڀيءَ ڪنهن ڀل	اندر اور باهر محبوب هی محبوب هے۔ کسی غلط فهمی میں مبتلا نہ رهنا۔ یہ تمام هنگامے محبوب هی کے برپا کئیے هوئے هیں۔
هيءُ هنگامون هل، سڙوئي محبوب جو	

صوفی دلپت

سهون کے باشندے تھے۔ نقل مکانی کر کے حیدرآباد گئے اور وهیں آباد هو گئے۔ کچھ عرصہ میر صاحبان کے ملازم بھی رهے، لیکن بعد میں ان کی کیفیت بدل گئی اور ملازمت ترک کردی۔ ان کے گرو (استاد) حیدرآباد کے آسرداس "آسو" نامی ایک شخص تھے جو خود بھی سندھی کے شاعر تھے۔ صوفی دلپت رائے درگاہ جھوک سے بھی عقیدت رکھتے تھے۔ سنہ ۱۸۴۱ء میں انتقال کیا۔ سندھی کے علاوہ هندی، سرائکی اور فارسی میں بھی اشعار کہے هیں۔ ان کے اشعار میں هندی اور سنسکرت کے الفاظ کا استعمال زیادہ ہے۔ کافی میں ویدانت اور تصوف کی باتیں بھی کی هیں اور حسن و عشق کا ذکر بھی۔ ان کی ایک کافی بطور نمونہ پیش کی جاتی هے، جس سے لفظاً خواہ معناً فارسی غزل کا رنگ جھلکتا هوا نظر آتا هے:-

چو نہ پسندا، سي پرين، جي عشق جي ڪوڙ، ڪتا
عاشقن جي جان تي خوني خنجر چشمن ڪتا
آسر ڏنو جن سرڪ تي ساقي ڪري متي آن عطا
بي خمر مخمور ٿيا مشتاق محبت ۾ متا
مشعل نيڻن جي متان تن ڏنا ميچ ۾ متا
ڪٽي نيهن جا ننگ جانب اچي جيءَ ۾ جتا
فنا فاني جي ٿيا دلپت دلبر جي متان
ڀاڻ وڃائي ڀاڻ ۾ وڃي رمز رانول جي رتا

ترجمہ :-

جو لوگ عشق کی بھٹی میں جل رہے ہیں، وہ محبوب کا مشاھدہ کیوں نہیں کرینگے۔
محبوب کی آنکھوں نے عشاق کی جان میں خونخوار خنجر گھونپ دیئے ہیں۔
جو ایک گھونٹ پر اپنی جان قربان کردیتے ہیں، ساقی انھی کو مئے عطا کرتا ہے۔
جو عشاق محبت سے معمور ہیں وہ شراب کے بغیر ہی مخمور ہیں۔
وہ آنکھوں کی مشعل پر (پروانہ وار) اپنے سر آگ کی بھٹی میں جھونک دیتے ہیں۔
محبوب عاشق کی قدردانی کرتے ہوئے دل میں سما گئے ہیں۔
اے دلپت! جو دلبر کے ھاتھوں شہید ہوئے،
وہ اپنی ہستی کھو کر محبوب کے وجود میں جذب ہو گئے۔

کافیوں کے علاوہ ان کے ابیات بھی ملتے ہیں۔ حسب ذیل بیت میں اپنے آپ کو پہچاننے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

پيچ پوري پرم کي پيھي پاڻ سڃاڻ؛
رلين چو روھن ۾ ڪاھي ڪيچين ڪاڻ؛
دلپت سو سپرين سدا توئي ساڻ؛
تون ساگيو پنھون پاڻ؛ وچڙي ٿو واڪا ڪرين.

ترجمہ :-

اے سادہ لوح! وسوسے دل سے نکال دے، اپنے میں سما کر اپنے آپ کو پہچان۔

جنگلوں اور بیابانوں میں کیوں مارا مارا پھر رہا ہے، کیچ والوں کے واسطے۔

اے دلپت! وہ محبوب تو تیرے ساتھ ھی ہے۔

تو تو خود پنھوں ہے اور خود سے الگ ھوکر فریاد کرتا پھرتا ہے۔

فتح فقیر

ٹالپوروں کے دور میں حیدرآباد میں نہر ڈومن پر رہتے تھے لیکن دراصل تحصیل ککڑ ضلع دادو کے ایک گاؤں کے باشندہ تھے۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد حیدرآباد سے ھجرت کرکے تحصیل جاتی ضلع ٹھٹہ کے ایک گاؤں "بھاڈ" میں جاکر سکونت پذیر ھوگئے جہاں کافی سن رسیدہ ھوکر سنہ ۱۸۷۳ء میں انتقال کیا۔ سید قنبرعلی شاہ اور حضرت پیر صاحب پاگارہ کے عقیدتمند تھے۔ میر صاحبان ان سے عقیدت رکھتے تھے اور انھیں خانقاہ کے اخراجات بھیجدیتے۔ کافی کے باکمال شاعر تھے۔ ان کی کافی میں بڑی روانی، تاثیر اور فنی پختگی ہے۔ موضوع کے لحاظ سے ان کی کافیاں وحدۃالوجود کے عقیدہ کی ترجمان ھیں۔ ان میں حسن و عشق کی چاشنی بھی ہے اور ھجر و وصل کا ذکر بھی۔ حسب ذیل کافی میں ھجر کا حال بڑے دلگداز انداز میں بیان کیا ہے:-

نینھن سجڻ جي کيس نماڻي، ڏاتر شال ڏيکاريندو

۱- ورھ وڏي ڪٺي دل ويڳاڻي، سالڪ مٺي جو مرض سڄاڻي
ايندو آزار اتاريندو

۲- چاڻ اِجھو منھنجو آري آيو، ڪندو ھوت ملڻ جو سعيو
قول ڪيل اچي پاريندو

۳- آءٌ آهيان عيبن هاڻي، پنهل ايندو پاڻ سڃاڻي
آري ننگ اجاريندو

۴- فتح فراق برهه جو باري، ساجن چڙهي ٿيو آهه شڪاري
محبت واريون ماريندو

ترجمہ :-

محبوب کے عشق نے مجھے عاجز و درماندہ کر دیا ہے، خدا اس سے ملائیگا۔

۱- عشق نے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پریشان کر دیا ہے، سالک مجھ مری ہوئی کا مرض پہچانیں گے،
اور آ کر اس آزار کو دفع کریں گے

۲- میرے محبوب بس ابھی آنے والے ہیں، اور آتے ہی مجھ سے ملینگے،
اور جو قول و قرار انہوں نے کئے ہیں وہ پورے کریں گے

۳- میں تو عیبدار ہوں، لیکن محبوب اپنی شان کو دیکھکر میرے پاس آئینگے
اور میری لاج رکھیں گے

۴- اے فتح! عشق میں سب سے بڑی الم انگیز چیز فراق ہے۔ محبوب سوار ہوکر شکار کو نکلے ہیں،
اب محبت کرنے والیوں کا شکار کھیلیں گے

صدیق فقیر سومرہ

فقیر محمد صدیق سومرہ درگاہ جھوک کے سجادہ نشین فضل اللہ کے مرید تھے۔ سنہ ۱۱۷۰ھ میں متولد ہوئے اور سنہ ۱۲۶۵ھ میں اپنے گاؤں ڈھورو نارو میں انتقال کیا۔ شاہ لطیف کے رسالہ کی طرح ان کا

بھی ایک مکمل رسالہ ھے۔ کلام صوفیانہ ھے اور بہت ھی اثرانگیز اور دلکش۔ زبان سادہ ھے لیکن پرلطف اور دلچسپ۔ ان کی کافی کی ساخت شاہ لطیف کی وائی کی طرح ھے۔ ایک کافی بطور نمونہ پیش کی جاتی ھے:-

ساٿي سنيري ويھہ، ڪاڪ گھڙندو ڪرھو

۱- مومل صحيح ماڻبي، دور ٿيندو ھيءُ ديھہ

۲- ننڍا وڏا ھلندا، راڻي رتيءَ ريھہ

۳- آخر انڌا سي چئبا، جن ھت نہ ڏٺو ڏيھہ

۴- وئي ڪونہ ڪي وريا، ان ڇپر سندو ڇيھہ

۵- صادق ڪنھن جو نہ ھلي، اتي مڪر ميھہ

ترجمہ:-

اے دوست! خیال رکھنا، اونٹ کاک میں آنے ھی والا ھے

۱- مومل سے ملاپ ھوگا، اور مادیت کا جو حجاب درمیان میں حائل ھے، وہ نہیں رھے گا۔

۲- مشاھدہ عام ھوگا، اور چھوٹے بڑے سب کو یہ سعادت حاصل ھوگی۔

۳- وہ اندھے سمجھے جائینگے، جنھوں نے یہاں اپنے محبوب کا مشاھدہ نہیں کیا۔

۴- جو یہاں سے گئے ھیں، وہ اُس عالم کی خبر لیکر واپس نہیں آئے۔

۵- صادق! وھاں کسی کی مکاری اور بہانہ بازی نہیں چلیگی۔

صدیق فقیر کے ابیات بھی فن اور فکر کے لحاظ سے اعلیٰ پایہ کے ھیں۔ میر صاحبان کے آخری عہد کی حکومت میں ایک مظلوم عورت نے ان سے میر صاحبان کی شکایت کی، جس پر اضطراب کے عالم میں یہ بیت ان کی زبان سے نکلا:-

پورا اچي پيل ساري سنڌ صديق چٽي	اے گورے! صدیق کہتا ہے کہ آؤ، اور تمام سندھ کو تاخت و تاراج کردو۔
ٻاروچاڻي ٻيل، ٻڌي نہ ٻڌي جهڙي(۱)	بلوچوں کا اتحاد نہ ہونے کے برابر ہے۔

شاہ لطیف کے رسالے کے طرز پر ان کا بھی ایک مکمل رسالہ ہے۔ کلام صوفیانہ ہے اور تاثر اور دلکشی سے معمور ہے۔ نمونہ کے طور پر چند ابیات پیش کئے جاتے ہیں:-

(۱)	(۱)
سارنگ سکي وڄ کي، وڄ وسي منجهہ کين	برسات بجلی کے لئے ترستی ہے، اور بجلی وہیں چمکتی ہے جہاں کچھ بھی نہیں ہوتا۔
ڏاسک سنيها ڏين ٻرين پاڻ لکائيو	محبوب اپنے آپ کو چھپا کر محبت کے پیغام بھیجتا رہتا ہے۔
(۲)	(۲)
ساکن هٺا سير ۾ ڪنڊا گل کي کي	بعض پھول اور کانٹے دریا کے بہاؤ میں ثابت قدم رہے۔ لیکن سب کے سب دریا کے رحم و کرم پر ہیں
سپ ساريڪا سائر کي تک تاڻيون تي نئي	اور تیز بہاؤ ان کو بہائے لئے جا رہا ہے۔
ٻير ٻهڻ کي، جن وس ويچارن چڙيو	بہاؤ اسقدر تیز ہے کہ بڑے بڑے درختوں کو بھی بہا کر لے جا رہا ہے، اور ان کا کوئی بس نہیں چلتا۔

---

(۱) "سندھ کی ادبی تاریخ" از محمد صدیق میمن، طبع دوم سنہ ۱۹۴۴ء ص ۲۱۹۔

(۳)

شکاري شعور سين ڪوڙين هئا
ڪي
سجاڻي صورت ڪي، وسهي ويناسي
ڪنيائون الف ڪي، عنقا آنڌائون
ڪينڪي

(۳)

شکاری تو کروڑوں کی تعداد میں تھے، لیکن ان میں باخبر بہت ھی کم تھے، جنھوں نے صورت دیکھتے ھی پہچان لیا اور اس پر یقین کرلیا۔ وہ الف کو لے آئے اور عنقا کو وھیں چھوڑ آئے۔

صوفی بایزید

صدیق فقیر کے فرزند صوفی بایزید (متوفی سنہ ۱۲۶۶ھ) بھی کافی اور بیت کے اچھے شاعر تھے۔ روحانی فیض اپنے باپ سے حاصل کیا اور شاعری میں بھی انھی کے نقش قدم پر چلے۔ ان کی ایک کافی پیش کی جاتی ہے :-

لنوءِ لائي ويا، پوري ماءُ جيجا منهنجي جيءَ ۾

۱- وتيون وھ ڳاڏيون، ڏکيءَ کي ڏيئي ويا

۲- آڌيءَ اٿي ويا مٽي ڪان، جوڳي پنهنجي جاءِ

۳- اوسيڙي ان جي اديون، چري چاڪ چڪيا

۴- بايزيد برھ مان، ڏونگر مون ڏوريا

ترجمہ :-

محبوب میرے دل میں محبت کی جوت جگا گئے

۱- اِس درد مند کو زھر سے بھرے ھوئے پیالے دے گئے۔

۲- جوگی آدھی رات کو میرے پاس سے اٹھکر اپنے مقام کو چلے گئے۔

۳۔ ان کے انتظار میں میرے زخم رسنے لگے ھیں۔

۴۔ اے بایزید! میں نے عشق میں پہاڑوں کو طے کیا ھے۔

سرھو فقیر

نائی قوم سے تعلق رکھتے تھے اور قصبہ "غلام نبی شاہ" کے باشندہ تھے۔ ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں ھو سکیں۔ ان کی تربت تحصیل ماتلی (ضلع حیدرآباد) میں منگریہ گاؤں کے قریب ھے۔ ان کی ایک وائی بطور نمونہ پیش کی جاتی ھے:-

آءٌ قربان ٿيان تن تان، مهر ڪري جي مون وٽ آيا

۱۔ تن طنبورو ڪري اڳيان ان جي، مون واڄٽ سڀ وڄايا

۲۔ ڪاڄ سيئي سريا سرتيون، ٿيڙا لايا سجايا

۳۔ اڳيان آريءَ جام جي، مون پٽر وار وڇايا

۴۔ سرھو چوي ڙي سرتيون، پرينءَ پال پلايا

ترجمہ:-

میں ان پر سے صدقے جاؤں، جو کرم کر کے خود میرے پاس آئے۔

۱۔ میں نے اپنے جسم کو طنبورہ بنایا، اور ان کے سامنے تمام ساز و سرود بجائے۔

۲۔ سہیلیو! میری تمام محنتیں و مشقتیں بار آور ھوئیں۔

۳۔ میں نے آری جام (پنھوں) کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔

۴۔ سہیلیو! سرھو کہتا ھے کہ محبوب نے بڑی نوازشیں کر دیں۔

فقیر ناڈک یوسف

ان کا نام محمد یوسف اور والد ماجد کا محمد ھاشم تھا۔ قوم کے کھوکھر تھے۔ جھل (بلوچستان) کے باشندہ تھے اور وھیں سنہ ۱۷۹۲ء میں متولد ھوئے۔ تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور تمام

علوم کی تحصیل و تکمیل کے بعد تلاش حق میں نکل کھڑے ہوئے اور درازا کے درویش حضرت سچل سرمست کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس عارف کامل کے سرچشمۂ فیض سے سیراب ہوکر رنگپور (ضلع خیرپور) میں آستانہ بناکر بیٹھ گئے۔ والیٔ خیرپور میر علی مراد خان ان کے عقیدتمند تھے۔ سنہ ۱۸۴۵ء میں رحلت فرمائی۔ سندھی کے علاوہ ہندی اور سرائکی میں بھی شعر کہا ہے۔ ان کی کافیوں میں کہیں کہیں ہندی اور سرائکی الفاظ کا امتزاج بھی ہوا ہے۔ فقیر نانک یوسف فلسفۂ وحدۃ الوجود کے شارح ہیں۔ فرماتے ہیں:-

تنهنجي تار تڳان تن من ۾، منهنجو مالڪ تون

۱- هندو مؤمن هر مظهر ۾، صحي سڃاتو مون

۲- آل اولاد کي عشق اوهان جو، تڪيو تو هئون

۳- پن ٻوڙين پاتال ۾، پاهڻ تارين تون

۴- حيف تنين ارواحن کي، جيڪي ڄاڻين ڏون

۵- نانڪ يوسف تي يار سچل جا، آهن هٿ مٿون

ترجمہ:-

میں تیرے سہارے جی رہا ہوں، میرا مالک تو ہی ہے

۱- ہندو خواہ مومن، میں نے تجھے ہر مظہر میں اچھی طرح سے پہچان لیا ہے۔

۲- میرے اہل و عیال کو بھی تیرا ہی عشق ہے، اور تجھی پر تکیہ ہے۔

۳- تو پتے کو پاتال میں غرق کر دیتا ہے، اور پتھر کو سطح آب پر تیرا دیتا ہے۔

۴- ان لوگوں پر افسوس ہے، جو دو سمجھتے ہیں۔

۵- نانک یوسف کے سر پر سچل کا دست شفقت ہے۔

پیر محمد اشرف کاسارائی

قصبۂ کرم خان جمالی تحصیل ٹنڈو باگو (ضلع حیدرآباد) میں سنہ ۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء) میں متولد ہوئے اور سنہ ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) میں انتقال کیا۔ ان کا نسبی سلسلہ حضرت غوث بہاءالدین ذکریا ملتانی سے ملتا ہے۔ سندھی زبان کے بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کا کلام مدح، مولود، منقبت اور کافی پر مشتمل ہے۔ ایک کافی درج ذیل ہے:-

اچ میان راڻا ڪا رھ رات، ڪا وڻن ۾ تون ڪڏھين

۱- راتيان ڏينھان روح ڪي، طلب تنھنجي تات
هيڻ م وسارج مون هڏهين

۲- ورڻ سنديون ولها، وايون ڪر وات
تن مون جياريندين تڏهين

۳- توڪي ساري سپرين، پرهه ٿي پربات
موٽ مرنديس آءٌ مڏهين

۴- اشرف آءٌ تون، سوڌا سپاجهي رات
منهنجو جنڻ ٿئي جڏهين

ترجمہ:-

اے رانے! آؤ، اور کبھی کوئی رات ٹھیر جاؤ

۱- روح کو دن رات تیری ہی طلب اور تیری ہی گفتار ہے
مجھے بھول نہ جانا

۲- اے محبوب! واپس آنے کی بات کر
تو میرے مردہ جسم میں جان پڑ جائے

۳- اے محبوب! تجھے یاد کرتے ہوئے صبح ہو جاتی ہے
واپس آجا، ورنہ میں مر جاؤنگی

۴- اشرف کی عرض ہے کہ اے شفیق و کریم سوڈھے! آجا
میری زندگی کا دارومدار تجھ پر ہے

بلال شاہ

شاہ عنایت رضوی کے پوتے بلال شاہ ولد شریف شاہ بیت کے اچھے شاعر تھے۔ ٹالپور دور کے ابتدا میں گذرے ھیں۔ ان کا ایک بیت بطور نمونہ پیش کیا جاتا ھے:۔

اپ تارا، مينهن ڦڙا، جيئن سي پن وڻان ڌراوڙ، پاهڻ، واريءَ ڌهم ڪڻان شهر بحر بلال چئي، جان هنيين سان هڻان طرح نہ پيم طومار جي، ڪيڏنهن نظر ڪڻان آونهو علم الله جو، آءٌ پائي منهن پڙهان تنهان ٿي گهڻان، آءٌ پال پلي جا پانئيان	جتنے آسمان کے تارے ھیں، برسات کے قطرے ھیں اور درختوں کے پتے ھیں۔ یا زمین پر پودے، پتھر اور ریت کے ذرے ھیں۔ اور بلال کہتا ھے کہ دنیا میں جسقدر شہر اور بحر ھیں۔ میں جب اپنے دل میں ان کی کثرت کا خیال کرتا ھوں تو مجھے ان کا ایک لامحدود اور لامتناھی سلسلہ نظر آتا ھے۔ اللہ کا علم بہت وسیع ھے۔ میں اپنے اندر جھانک کر دیکھتا ھوں اور اسے پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ھوں تو کائنات کی ان تمام چیزوں سے بڑھکر اپنے اوپر اللہ کی مہربانیاں نظر آتی ھیں۔

قطب شاہ

بلال شاہ کے فرزند قطب شاہ بھی بیت کے شاعر تھے۔ ان کے ابیات فن اور فکر کے لحاظ سے بہت ھی خوب ھیں۔ ان کا ایک بیت درج ذیل ھے:۔

نیڙ، نکون، کرڙا، کپون، ات
گور کرن جا گس
اهابيل اتهين، پيا لوڪڙ گهڻا لس
ويٺيون آهن وات تي، ات تا نگهيون
ڪن تس
ات پير نہ پئي پاھئين، ڪنهن
مجازائي مس
هيءَ هلي ڪارڻ هوت جي، پئيءَ
سات سرس
قطب چئي ڪيترا، تنهن ڪي
جبل ڏنا جس
پرڻائي پنهونءَ جي، تن
ٻ آهم ترس
تيلان رهيا رس، وڃي ٻانهن جا
ٻروچ مين

راہ بہت ہی دشوار ہے، اس میں کانٹے بھی ہیں اور درندے بھی۔ خطرناک پرندے بھی پرواز کرتے رہتے ہیں اور راستے میں خوفناک جانور بھی دندناتے پھرتے ہیں۔ ایسی سنگلاخ اور خطرناک سرزمین پر کسی مجاز والے کا پاؤں کبھی کبھی پہنچتا ہے۔ اس کے باوجود وہ (سسئی) اسی راہ پر اپنے محبوب کی تلاش میں چل پڑی۔ قطب کہتا ہے کہ پہاڑ نے بھی بڑی اذیتیں دیں۔ آخر پنھوں (محبوب) کے دل میں رحم پیدا ہوا اور سسئی کا اپنے محبوب سے وصال ہوا۔

خلیفہ نبی بخش لغاری

ان کے والد کا نام بالاچ خان تھا۔ ٹھی تحصیل ٹنڈو باگو کے باشندہ تھے۔ بعد میں وہاں سے نقل مکانی کرکے "نار" نامی گاؤں میں جا کر سکونت پذیر ہوئے۔ ان کی ولادت سنہ ۱۷۷۶ء میں ہوئی اور وفات سنہ ۱۸۶۳ء میں۔ حضرت پیر صاحب پاگارہ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ سندھی اور سرائکی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کے کلام میں تصوف کے نکات بھی ہیں اور حسن و عشق اور ھجر و وصل کا بیان بھی۔ یہ پہلے شاعر ہیں، جنھوں نے سر "کیڈارو"

کو قومی حالات اور حریت کے جذبات کا ذریعہؑ اظہار بنایا۔ ان کے رسالہ میں سر کیڈارو میں کھرڑی (سکھر) کی جنگ کا ذکر ہے جو سنہ ۱۸۳۴ء میں میر صاحبان اور شاہ شجاع کے درمیان ہوئی۔ کیڈارو میں سے چند ابیات پیش کئے جاتے ھیں:-

(۱)

شجاع! ويھ نہ سنڌ، اوڏا اڏي نجهرا
هتي راوت رند، وتن قلعي ڪوڏيا

(۱)

اے شجاع! سندھ میں اپنے پاؤں جمانے کی کوشش نہ کرنا۔ یہاں وہ بہادر رہتے ھیں جو میدان جنگ اور قلعوں کو تسخیر کرنے کے شائق ھیں۔

(۲)

ڪونڌ قلعي جا ڪوڏيا، نونڌ نچندا پس
چڙي تن ترس، پلٽيو شاه پٺاڻ تي

(۲)

بہادر قلعے تسخیر کرنے کے شائق ھیں اور تم ان کو ھنستے کودتے ھوئے میدان جنگ میں اترتے دیکھوگے۔ پٹھانوں پر حملہ کرتے ھوئے ان کے دل میں رحم نہیں ھوتا۔

(۳)

مٿي آرڻ اڄ، ڪونڌر ڪڏندي آئيا
هڙ ۾ ھلوانن ڪي لڏڻ ڏئي نہ لڄ،
پيئو وجن پڄ، سائر ٿين سامھان.

(۳)

آج بہادر میدان جنگ میں بڑے شوق سے کود گئے جو میدان جنگ سے فرار ھونے پر شرماتے ھیں جو بزدل اور بے غیرت ھوتے ھیں وھی بھاگ جاتے ھیں، بہادر مقابل ھو کر لڑتے ھیں۔

حمل خان لغاری

ان کی ولادت خیرپور کے ایک گاؤں میں سنہ ۱۲۲۵ھ(۱۸۱۰ء) میں ہوئی اور وفات سنہ ۱۲۹۶ھ(۱۸۷۸ء) میں۔ حضرات لنواری کے مرید تھے اور پیر صاحب پاگارہ سے بھی عقیدت رکھتے تھے(۱)۔ شروع میں درس و تدریس میں مشغول رہے، پھر شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ سندھی اور سرائکی زبانوں میں بلند مقام حاصل کیا۔ ان کا اپنا خاص اسلوب تھا۔ ان کا کلام سندھ کے کونے کونے میں پھیل گیا اور زبان زد خاص و عام ہوا۔ ان کے بعض اشعار ضرب الامثال بن گئے۔ ان کی خاص اور نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے شعر میں نہ صرف حسن و عشق اور ہجر و وصل کی باتیں دلکش اور اثرانگیز پیرایہ میں بیان کرتے ہیں، بلکہ معاشی اور معاشرتی حالات کی عکاسی بھی نہایت موثر اور حقیقت پسندانہ انداز میں کرتے ہیں۔ خلیفہ نبی بخش کے ساتھ ان کی سخن گسترانہ باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ حمل خان کے چند ابیات بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:-

(۱)

مشڪ عنبر خوشبوءِ لڌي ھے، خال
اونڌي ھڪ وال ڪنون
سر، جان ڏتي سرجان، ڏنس جان
لالي تنھن لب لال ڪنون
ماہ مھر ييي نور لڌا ھے، تنھن
دي جوت جمال ڪنون

(۱)

مشک اور عنبر نے میرے محبوب کے رخسار کے خال اور سر کے ایک بال سے خوشبو حاصل کی ہے۔ مرجان نے جب میرے محبوب کے لب لعلین کی سرخی دیکھی تو مرکر جان دیدی۔ ماہتاب اور آفتاب نے بھی میرے محبوب کے حسن و جمال سے نور پایا ہے۔

---

(۱) "کلیات حمل" مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ص ۵ اور ۱۲ تا ۱۹

(۲)

ڪاڻ ڪنين جي ڪاڻ، آءٌ ڪاٽون
ڪيدان ڪن جون
نہ تہ ڪير ڪاٽون، ڪير اسين،
ڪنهن جي ڪيدون نہ ڪاڻ
اسين پاڻ اتامرا، ڪنهن جي ڪيدون
نہ ڪاڻ
پر حمل! سرهي ساجن ڪاڻ، تا
ڪاٽون ڪيدون ڪن جون

(۲)

میں "کسی" کی خاطر بعض لوگوں کی خوشامد کرتا ہوں ورنہ میں کہاں اور خوشامد کہاں۔ میں تو کسی کی خوشامد کرنے کا عادی ہی نہیں ہوں۔ ہم خود عزت دار ھیں اور کسی کی خوشامد نہیں کرتے لیکن اے حمل! اس محبوب کی خاطر ھم بعض لوگوں کی خوشامد کرنے پر مجبور ھیں۔

(۳)

ڪهہ ڪانگا ڪر بات، اڄ عجيبن
اچڻ جي
اچي ويهہ اکين تي، لنوءُ سہاجهي
لات
تان ڪانگل تنهنجو وات مصريءَ
سان منو ڪريان

(۳)

اے کوے! آج محبوب کی آمد کی خبر سنا، میری آنکھوں پر بیٹھ جا اور میٹھی سی راگنی الاپنا شروع کر۔ اے کوے! میں تیرا منہ مصری کے ساتھ میٹھا کردوں گا۔

بھائی چین رائے لنڈ (سامی)

بھائی چین راۓ شکارپور کے باشندہ تھے۔ ان کی قومیت "لُنڈ" تھی۔ ان کے والد بچومل ایک خوشحال شخص تھے۔ اس لئے چین رائے کی پرورش ناز و نعم سے ھوئی۔ عین عالم شباب میں ان کی دوستی بھاولپور کے ایک سنت سوامی مینگھراج کے ساتھ ھوگئی، جنھوں نے ان پر ویدانت کا رنگ چڑھادیا۔ شعر میں اپنا نام نظرانداز کرکے اور اپنے

اپنے گرو کا نام اجاگر کرنے کے لئے "سامی" تخلص اختیار کیا۔ آخر خود بھی سامی ھی کے نام سے مشہور ہوگئے۔ سو برس کی عمر میں سنہ ۱۸۵۰ء میں انتقال کیا۔ سامی ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ انہوں نے جو "سلوک کہے ھیں، ان کی ھیئت بیت جیسی ھے اور ان میں آتم گیان کی تلقین کی ھے۔ ان کے سلوکوں میں ویدانت کی تعلیم سیدھے سادے طریقے سے دی گئی ھے۔ وہ اپنا مقصد اشاروں، کنایوں اور تمثیلی انداز میں بیان کرنے کے بجائے بالکل سیدھے طریقے سے بیان کرتے ھیں۔ البتہ بعض مقامات پر اپنے مقصد کی وضاحت کے لئے تشبیہات و استعارات کا سہارا بھی لیا ھے۔ سامی کے سلوکوں میں ھندی اور سنسکرت کے الفاظ کثرت سے استعمال ھوئے ھیں۔ فنی اعتبار سے ان کے سلوک چھند ودیا کے مطابق ھیں اور نہایت ھی پختہ ھیں۔ ان کے کسی سلوک میں بھی چار سے زیادہ مصرعے نہیں ھیں۔ دو سلوک نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ھیں:-

(۱)

ڀانئڻ ڀڃيءِ ڇڏ، مٿان ڇاڻ وجهيئي
ڇار ۾
آهيون اسين جن جا، تنين ونءُ اڏ
پاڻ تنين سان گڏ، نيهن جن جو
ناهه سان

(۱)

پندار کو توڑ دے، ممکن ھے یہ آگاھی تجھے کسی جال میں پھنسا دے۔ ھم اصل میں جن کے ھیں، انہی سے اپنی تعمیر میں مدد لے۔ اپنے آپ کو ان میں شامل کردے جن کو "نہیں" (لا) کے ساتھ عشق ھے۔

(۲)

جنين هٺ هاريو، تنين جيتيو جڳ
نرمل ڀاءُ ڀڳت سان، سڀ جو چت
ٺاريو
گهٽ گهٽ نهاريو، سامي سپرين کي

(۲)

جنہوں نے غرور کو ترک کیا، انہوں نے نرمی اور خوش خلقی کے ساتھ سب کے دل موہ لئے سامی نے ایک ایک موڑ پر محبوب کو دیکھا۔

شیخ ابراھیم

شیخ حمر کے فرزند تھے، جن کا ذکر کلھوڑہ دور میں ھوچکا ھے۔ ان کی ولادت سنہ ۱۱۷۰ھ کے قریب ھوئی اور وفات سنہ ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) کے بعد۔ ان کے شعر کی شہرت دور دور تک پھیلی ھوئی تھی۔ کبیر شاہ سندھ سے چل کر لس بیلہ ان سے ملاقات کرنے کے لئے جا پہنچے۔ دونوں کے درمیان بڑے معرکے ھوئے۔ محترم ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے ابراھیم اور کبیر شاہ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ھوئے لکھا ھے کہ:-

> بیلہ کے یہ دونوں شاعر اپنے دور کے جریر اور فرزدق (عرب شعرا) تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے حریف اور ھمسر تھے . . . . لیکن دونوں میں فرق بھی ضرور تھا۔ شیخ ابراھیم کی محاوراتی گہرائی نے انھیں بلیغ بنایا، اور کبیر شاہ کی خالص سندھی زبان کی سلاست نے ان کو فصیح بنادیا . . . . . زبان کی گہرائی اور بلاغت میں شیخ ابراھیم بلند ھیں لیکن سلاست اور فصاحت میں کبیر شاہ ان پر فوقیت رکھتے ھیں (۱).

شیخ ابراھیم ھر فن مولا ھیں۔ انھوں نے سندھی دوھے میں بھی اپنے کمال فن کا مظاھرہ کیا ھے اور قصیدہ گوئی میں بھی اپنے جوھر دکھائے ھیں۔ اس کے علاوہ "لوک ادب" (عوامی ادب) کی ھر صنف میں بھی طبع آزمائی کی ھے۔ ان کا ایک بیت بطور نمونہ پیش کیا جاتا ھے:-

---

(۱) "بیلہ والوں کے بول" ص ۲۷۱

تند تند تات پرينءَ جي، نس نس اندر نيهن	رگ رگ میں محبوب کی یاد ھے، اور نس نس میں اس کا عشق۔
هر هر حب حبيب جي، سند سند ساجن سيئن	ھرساعت اس کی محبت، اور ھرعضو اس سے لو لگائے ھوئے۔ یہ راستہ
پورج انهيءَ پنڌ کي راتو ڏينهن رميج	طے کر اور دن رات چلتا رہ۔
اکين مان ابراهيم چئي موڪ وسايم مينهن	ابراھیم کہتا ھے کہ میں نے آنکھوں سے بیحد بارش برسائی۔
اچي ملج ائين، جيئن رهان معرفت ۾ محبوب جي(۱)	اس طرح سے آکر مل، کہ میں محبوب ھی کی معرفت میں رھوں۔

کبیر شاہ

سندھ کے متعلوی سادات کی "گوڑھا" شاخ سے تھے۔ سنہ۱۷۷۶ء اور سنہ ۱۷۸۶ء کے درمیانی عرصہ میں لس بیلہ گئے اور اتھل میں رہ گئے۔ شیخ ابراھیم کے ساتھ ان کے بڑے معرکے ھوئے۔ تیرھویں صدی ھجری کے پہلے ربع میں انتقال کیا (۲)۔ ان کا ایک بیت درج ذیل ھے:۔

ڏڄ هڙ دونس درياه جي، جت موج ڪري مهراڻ	جب مہران میں موج آتی ھے تو دریا کی دھشتناکی دیکھنے کے قابل ھوتی ھے۔
تني تو کي تار مان، پار لنگهائيندو پاڻ	وھاں پانی کے تیز بہاؤ میں سے تجھے خود ھی اس پار پہنچائینگے۔
جن جي محبت ميهر ساڻ، تن کي لهر لوڏيندي ڪانه ڪا.	جن کو میہر کے ساتھ محبت ھے، دریا ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔

(۱) "بیلہ والوں کے بول" ص ۲۹۹، ۳۰۰

(۲) ایضاً ص ۳۳۴ تا ۳۳۸

مذہبی شاعری

اس دور میں ابوالحسن کی سندھی کے طرز پر متعدد منظوم کتابیں تصنیف کی گئیں، جو زیادہ تر الف اشباع کے قافیہ میں ہیں۔ بعض کتابوں میں صحیح اور مروج قافیہ کے بھی ابیات اور کبتیں ملی ہیں۔ مولوی ولی محمد نے سنہ ۱۸۰۵ء میں فارسی سے "حکایات الصالحین" کا سندھی ابیات میں ترجمہ کیا۔ شکارپور کے فارسی گو شاعر محمد عارف صنعت (وفات ۱۸۴۹ء) نے "کریما" کا ترجمہ اسی بحر (متقارب مثمن محذوف) میں کیا۔ اس سے پہلے سنہ ۱۷۲۴ء میں عبدالرؤف نامی ایک شاعر نے بھی کریما کا ترجمہ کیا تھا لیکن صنعت کا ترجمہ زیادہ صاف اور بہتر ہے، نمونہ درج ذیل ہے:-

لهي علم کان ٿو شرف آدمي
نہ دولت کنان ۽ نہ کنهن خادمي
پٽيان علم جي شمع جيئن ڳار پاڻ
جو ريءِ علم مشڪل خدا جي سڃاڻ
سياڻو طلبگار ٿئي علم جو
سدا نرخ بالا رهي علم جو

انسان علم سے شرف حاصل کرتا ہے
نہ کہ دولت اور عہدہ سے
حصول علم کے لئے اپنے اندر شمع کی طرح گداز پیدا کر یعنی اور مشقت کر کیونکہ علم کے بغیر خدا کو نہیں پہچانا جا سکتا
عقلمند انسان علم کا طلب گار ہوتا ہے
علم کا نرخ ہمیشہ اونچا رہتا ہے

اس دور کی ایک مشہور کتاب "حکایات الصالحین" ھے، جس کا ترجمہ مولوی ولی محمد نے (۱) فارسی سے سندھی میں کیا (۲)۔ برٹن نے لکھا ھے کہ حکایات الصالحین کو ملا عبدالحکیم نے عربی سے سندھی میں منتقل کیا، جس میں اسلام کے ابتدائی دور کے مشہور اولیاء اللہ مرد خواہ خواتین کے سوانح حیات، کارنامے اور دیگر روایات درج ھیں (۳)۔ معلوم ھوتا ھے کہ برٹن کو غلط فہمی ھوئی ھے۔

مخدوم عبداللہ نرئے والے

اس سلسلے میں اس دور کے عظیم شاعر اور مصنف مخدوم عبداللہ نرئے والے ھیں۔ برٹن نے ان کو مخدوم محمد ھاشم ٹھٹوی کے بعد دوسرا مشہور سندھی مصنف بتایا ھے (۴)۔ وہ مندھرو قوم سے تعلق رکھتے تھے (۵) اور تحصیل بدین کے جنوبی علاقہ کے باشندہ تھے۔ برٹن نے لکھا ھے کہ بُھج کے قریب کچھ کے ایک گاؤں "نرئی" میں متولد ھوئے، لیکن اصل حقیقت یہ ھے کہ وہ بعد

---

(۱) مولوی ولی محمد کمال الدین ھالا کے قریب ایک گاؤں میں تولد ھوئے۔ زندگی بھر تعلیم و تدریس میں مشغول رھے اور سنہ ۱۸۴۴ع میں انتقال کیا۔

(۲) "سندھی ادب" (اردو) از پیر حسام الدین راشدی ص ۶۷

(۳) "سندھ اور وادی سندھ میں بسنے والی قومیں"، از برٹن (سندھی ترجمہ) ص ۱۲۶۔

(۴) ایضاً ص ۸۰

(۵) تحصیل بدین کے جنوبی حصہ کو "ماندھر" کہا جاتا ھے کیونکہ وھاں مندھرا قوم بستی ھے۔

میں نقل مکانی کر کے نرئی میں جا کر سکونت پذیر ہوئے (۱) اور اسی لئے ان کو "نرئی والا" کہا جاتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد وہاں سے بھی منتقل ہو کر سسری (تحصیل بڑاسو) میں جا کر آباد ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔ برٹن نے لکھا ہے کہ تقریباً تیس برس گذرے کہ وفات پائی ہے (۲)۔ برٹن سنہ ۱۸۴۴ء میں سندھ میں آئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مخدوم عبداللہ نے سنہ ۱۸۱۴ء کے قریب وفات پائی۔ ان کی تربت سسری میں ہے۔ کچھ کے ہندو راجہ ان کے مرید تھے اور انہیں سالانہ وظیفہ دیتے تھے (۳)۔ مخدوم صاحب نے سندھی میں متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے حسب ذیل تصنیفات کے نام معلوم ہوئے ہیں:۔

(۱) کنزالعبرت، (۲) قصص الانبیاء، (۳) خزانۃ الابرار، (۴) خزانۂ اعظم، (۵) خزانۃ الروایات، (۶) تنبیہہ الغافلین، (۷) معیار سالکان طریقت، (۸) القمرالمنیر، (۹) نورالابصار، (۱۰) ھفت بہشت، (۱۱) البدر المنیر، (۱۲) تفسیر سورۂ یوسف، (۱۳) غزوات، (۱۴) خلفائے راشدین۔

"غزوات" میں انتہائی تحقیق و تدقیق اور سیر کی مستند کتابوں کے حوالہ جات سے غزوات کی تفصیلات اور حضور پر نور محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مطہرہ کے بعض پہلو واضح کئے ہیں۔ اس کتاب کی زبان بھی سلیس اور شیریں ہے اور اس میں بڑی روانی اور شعریت ہے۔ ان کی غیر مطبوعہ کتابوں میں سے "خزانۂ اعظم" ایک لاجواب اور بے مثال کتاب ہے۔ اس میں اخلاقیات

(۱، ۲، ۳) "سندھ اور وادیٔ سندھ میں بسنے والی قومیں"، از برٹن (سندھی ترجمہ)۔

پر نہایت ھی تفصیل کے ساتھ گفتگو کی گئی ھے۔ یہ کتاب آٹھ جلدوں پر مشتمل ھے اور اس کا قلمی نسخہ پیر صاحبان جھنڈہ (صاحب العلم) کے کتب خانہ میں موجود ھے۔ مخدوم صاحب کی مذکورہ بالا تصنیفات میں مندرجۂ ذیل تصنیفات شایع ھو چکی ھیں:-

کنزالعبرت، القمر المنیر، نورالابصار، البدر المنیر، ھفت بہشت، تفسیر سورۂ یوسف اور غزوات۔

مخدوم صاحب نے اپنی تصنیفات میں لاڑی سندھی استعمال کی ھے۔ ان کی نظم فن اور ساخت کے اعتبار سے بڑی پختہ ھے۔ زیادہ الف اشباع کا قافیہ استعمال کیا ھے، اور مروج قافیہ کے ساتھ بھی طویل ابیات کہے ھیں۔ چند ابیات بطور نمونہ درج ذیل ھیں:-

کنزالعبرت سے

اھو منھنجي اکین جو ٺار منجھ دنیا	وہ دنیا میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک تھا۔ میرے دل کا ثمر
۽ ھڻ میوو ھوم دل جو وندر وجودا	اور میری جان کے لئے انسیت کا
ھیجان سانڍیو مون ھنج ۾ سو پیارو پاٺا	باعث تھا۔ میں نے اسے گود میں لے کر محبت اوراشتیاق کے ساتھ
کوڏان پنایم جنھن کي جھجھي سک منجھا	پالا تھا اور وہ مجھے اپنے وجود سے زیادہ پیارا تھا۔ وہ دلبر اس
ھوم آڳاندو اکیین دلبر منجھ دنیا	دنیا میں ھمیشہ میری آنکھوں کے سامنے رھا کرتا تھا۔

البدرالمنیر سے

مون کي جئڻ مشکل ٿیو ڌاران دوستن	دوستوں کے بغیر میرا جینا مشکل ھو رھا ھے (لیکن)

سندھی	اردو
نفسانيت نابود کي منائي مڙن	نفسانیت نے سب کا اخلاق ختم کردیا ہے۔
عادت ويئي احسان جي منجهان ئي ماڻهن	لوگوں میں نیکی کی عادت نہیں رہی
وڏا شڪ سيں کي سرهي شيطان	شیطان نے سب کے دلوں میں شکوک پیدا کردیئے ہیں۔
مهر محبت لڏيو هيج نہ منجهہ هنين	مہر و محبت ختم ہوگئی اور دلوں میں ذوق و شوق نہیں رہا۔

غزوات سے

سندھی	اردو
تيلاه آهيون اهک سهک م سيئي هيڪاندا	ہم سب دکھ سکھ میں اس لئے یکساں شریک ہیں کہ
آخر ٿيندي تيهين جيڪا رب رضا	آخر وہی ہونا ہے جو پروردگار کا منشا ہوگا
پسو جهہ پر اوچتي جاري ٿئي قضا	جدھر نظر کروگے یہی دیکھوگے کہ ہرطرف اللہ ہی کا حکم چلتا ہے
دوس کهائي دشمنن هٿان، کرن کير پياء	اللہ تعالیٰ دوستوں کو دشمنوں کے ہاتھوں مرواتا ہے اور نااہلوں کو نوازتا ہے
ڏئي بادشاهيون بيڪارن کي اشراف کي اپرا	بادشاہی بیکار لوگوں کو دیتا ہے اور شرفا کو کمزور کرتا ہے
ڪونہ پروڙي ڪريم جو ئي علم حڪمتا	کریم کے علم و حکمت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

خلفائے راشدین سے

هاڻ ڪريهون امام حسين جو ڪي مذڪور هن متا	اب حضرت امام حسین علیہ السلام کا ذکر کرتے ھیں جو عابد، زاھد،
جو عابد زاهد متقي اڪمل اطهرا سنه سنهارو مه موچارو ڪامل ڪلاما	متقی اور اکمل و اطہر تھے۔ صورت اور سیرت میں بہت اچھے اور گفتگو میں کامل ۔
جائو سنهارو چام سو پنجينءَ تاريخا مهيني شعبان جي سڪي ياد ڪجا تن ورهه چوٿون سو هئو ڪنان هجرتا	وہ مقدس انسان پانچ تاریخ کو پیدا ھوئے ۔ شعبان کا مہینہ اور ھجرت کا چوتھا سال تھا اس بات کو یاد رکھنا ۔

اس قسم کی اور بھی کئی کتابیں تصنیف کی گئیں۔ مخدوم انور نے جو ایک عالم و فاضل تھے ، نماز کے متعلق شیخ فتح محمد بن شیخ عیسیٰ عبداللہ کی فارسی نثر میں لکھی ھوئی ایک کتاب کا سندھی میں منظوم ترجمہ کیا۔ اس کتاب کا نام "مفتاح الصلوٰۃ" ھے۔ ترجمہ میں بھی اسی نام کو قائم رکھا گیا ھے۔ اسی کتاب کا ایک ترجمہ بعد میں بھی کیا گیا، جو دائری درگاہ کے سید علی محمد شاہ نے کیا۔ غرض کہ اس دور میں اس قسم کی تصنیف و تالیف اور ترجمہ کا رواج عام تھا۔ جس کا اندازہ برٹن کے حسب ذیل بیان سے لگایا جا سکتا ھے :-

> سندھی زبان کے ادب کے متعلق وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ھے کہ جب ھم نے سندھ کو فتح کیا، تو ایسی ایک بھی دیسی زبان نہیں تھی ، جس میں سندھی سے زیادہ اور کارآمد تصانیف ھوں۔ ان کی زیادہ تعداد

عربی سے ترجمہ کی ہوئی اور مذہبی کتابوں پر مشتمل ہے۔ سندھی میں کس قدر تصنیفیں ہوں گی، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، تاہم دو تین سو سے کم بھی نہیں ہوں گی (۱)۔

اس سے منظوم سندھی تصنیفات کا بھی اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ یہاں صرف چند تصنیفات کا تعارف کرایا گیا ہے۔

---

(۱) "سندھ اور وادیٔ سندھ میں بسنی والی قومیں" از برٹن (سندھی ترجمہ) ص ۴۷

داستان گوئی

اس دور میں داستانیں بھی منظوم کی گئیں۔ سندھ کی خواہ بیرون سندھ کی رومانی داستانیں اور دیگر قصے کہانیاں نظم میں لکھی گئیں۔ اسماعیل نامی ایک شاعر نے "سؤ مسئلے" کے عنوان سے ایک کتاب تصنیف کی، جس میں فقیر عبدالحلیم کا قصہ بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح ایک فقیر نے سلطان روم کی شہزادی کے سو سوالوں کے جوابات دیکر اس کے ساتھہ شادی کی (۱)۔

ضلع لاڑکانہ کے ایک گاؤں کے ایک باشندہ شیر خان (۱۷۶۶ء — ۱۸۸۰ء) نے ایک مثنوی لکھی جس میں "گل بکاؤلی" کا قصہ منظوم کیا گیا۔ اسی ضلع کے ایک اور شاعر حفیظ نے "مومل رانو"، "سوھنی مہینوال" اور "عمر مارئی" کے قصے منظوم کئے، جن میں سے مومل رانو فنی، فکری اور ادبی لحاظ سے ایک شاھکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاعر اگرچہ نابینا تھے، تاھم واقعہ نگاری اور منظرکشی میں کمال کیا ہے۔ ان کے چند ابیات بطور نمونہ پیش کئے جاتے ھیں:-

ڏسيو هر ڪوئي ڏريو تي عذر سندو اسرار	اس خود ساختہ طلسم کو دیکھ کر سب ڈر رہے تھے۔
ڪڪوري ڪاڪ وهي، نيهن سندي نروار	عشق کی کاک (ندی) مست و مخمور بہہ رہی تھی۔

---

(۱) "سندھ اور وادیٔ سندھ میں بسنے والی قومیں"، از برٹن (سندھی ترجمہ) ص ۱۲۶

پاٹي سر کنڊ گاڏئون ھو قاتل
کيف قرار
گھوڙو ۽ ھسوار تسي گنوايائين
گار ۾

کا ک کا پانی کیف آور اور قاتل تھا گھوڑوں اور ان کے سواروں کو گرداب میں غرق کر رہا تھا۔

جي زر ڏني زاري اگھي منھنجي
تو سان مير
تہ سوين ورھايان سفرا سڏي سيد
فقير
حال في الحال حفيظ چئي سپ
پھرايان پير (۱)

اے امیر! اگر دولت لٹانے سے میری التجا تیرے سامنے شرف قبول حاصل کر سکتی ہے تو میں پیروں اور فقیروں کو بلا کر ان کو سینکڑوں دعوتیں کھلا سکتا ہوں۔ حفیظ کہتا ہے کہ پل بھر میں تمام پیروں کو خلعتیں پہنا سکتا ہوں۔

خلیفہ محمود کڑیہ والے کے فرزند خلیفہ حاجی عبداللہ کی تصنیف کردہ ایک مثنوی ملی ہے جس میں لیلیٰ مجنوں کا قصہ منظوم کیا گیا ہے۔ انہوں نے یہ مثنوی ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳ء) میں مکمل کی تھی۔ اس کے چند ابیات بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

مرگھہ نيني، چار بدني، گنير
چال چلت (۲)

آھو چشم، متناسب الاعضا اور چال ھاتھی کی طرح باوقار۔

---

(۱) یہ بیت غیر مکمل ہے (مترجم)۔

(۲) یہ بیت نہیں ہے، بلکہ ایک مصرعہ ہے (مترجم)۔

مڙهي آهي موتين سان مورتون موچاري
لڏي لامن وچ ۾ ڪر ڏاڙهونءَ جي ٽاري
وتڙ متان اوتڙ پو سونها ٿا منجهن
ماهيت ۾ مهراڻ جي اوليون ٿيو اجهن

موتیوں سے مرصع اور مورتیوں سے خوبصورت۔
شاخوں کے درمیان اس طرح جھول رہی ہے، جیسے درخت انار کی شاخ۔
دریا کا بہاؤ اس قدر تیز اور خطرناک ہے کہ جو اس کے گھاٹ سے واقف ہیں، ان کی سمجھ بھی کام نہیں کرتی۔

راسخ سندي راز ڪي پيو تان ڪير رسي
پاڻ منجهان ئي پاڻ تو پاڻيهي پاڻ پسي

راسخ کے راز تک کوئی بھی پہنچ نہیں سکتا۔
اپنے اندر آپ ہی اپنا مشاہدہ کرتا ہے۔

لڳي هوءِ ته ڪل پوئي نه ته لڳيان سڻ (۱)

جہاں آگ لگتی ہے، وہی جگہ جلتی ہے۔ آس پاس والوں کو کیا معلوم، اگر تیرے دل کو لگی ہوگی تو تجھے معلوم ہوگا ورنہ جن کے دل کو لگی ہو، ان سے معلوم کر۔

---

(۱) یہ بیت نہیں ہے، صرف ایک مصرعہ ہے (مترجم)

نثر نویسی

عرب دور کا حال بیان کرتے ہوئے ذکر کیا گیا ھے کہ منصورہ کے ایک عرب عالم عبداللہ بن عمر ھباری نے شمالی سندھ کے ایک راجہ کے کہنے پر سندھی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تھا۔ یہ روایت تو تاریخ کے اوراق پر محفوظ ھے، لیکن اس دور کی نثر کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ھوسکا۔ اس کے بعد بھی میر صاحبان کے دور تک نثر کا کوئی باقاعدہ نمونہ نہیں ملا۔ بعض ادیبوں نے اس سلسلہ میں جستجو اور تحقیق کی کوشش کی ھے۔ بعض ادیبوں نے شاہ کریم کے ملفوظات "بیان العارفین" میں، بعض نے مخدوم جعفر بوبکائی، مخدوم عبدالرحیم گرھوڑی اور دیگر علما و فضلا کی تصانیف میں سندھی نثر کے نمونے تلاش کئے ھیں، لیکن دراصل وہ مقفیٰ فقرے ھیں، انہیں باضابطہ نثر نہیں کہا جاسکتا۔

نثر نویسی کی باقاعدہ ابتدا میر صاحبان کے دور میں، آخوند عزیزاللہ کے ترجمۂ قرآن مجید سے ھوتی ھے۔

آخوند عزیزاللہ

مٹیاری کے باشندہ تھے اور قوم کے میمن۔ سنہ ۱۷۴۶ء میں ولادت ھوئی اور سنہ ۱۸۳۴ء میں وفات۔ درس دیتے تھے اور اسی سلسلہ میں کافی عرصہ تک بزرگان لنواری کے پاس رھے۔ قرآن مجید کا تحت اللفظ ترجمہ کیا اور حاشیہ میں آیات کی شان نزول بھی سندھی نثر ھی میں لکھی۔ سندھی نثر کا یہ پہلا نمونہ ھے۔ سندھی زبان

اور ادب کی یہ خوش بختی ہے کہ اس کی ابتدا قرآن مجید کے ترجمہ سے ہوئی - ترجمہ کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

(۱)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ.

(۱)

اے مومنان! همراهی پکڑو مشکلات میں ساتھ صبر اور نماز کے - تحقیق اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

(۲)

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ.

(۲)

اور مت کهو واسطے ان کے جو ذبح ہوتے ہیں خدا کی راہ میں۔ وہ مرے ہوئے نہیں ہیں، بلکہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں جانتے۔

(۳)

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ .... الآیہ

(۳)

اور آزماتے ہیں ہم ساتھ چیزوں کے خوف، بھوک اور کم ہونے مال کے ......

سندھی لغات

اس دور میں سندھی لغات کا پتہ بھی چلا ہے - برٹن نے لکھا ہے کہ انہوں نے سندھی لغات دیکھی ہے (۱)۔

انجیل کے ترجمے

بعض عیسائیوں نے جو میر صاحبان کے عہد حکومت میں سندھ میں اقامت گزیں ہوگئے تھے، سنہ ۱۸۱۵ء اور ۱۸۲۵ء کے درمیان انجیل کے بعض حصوں کے ترجمے کئے، جو اس وقت ناپید ہوچکے ہیں -

---

(۱) "سندھ اور وادیٔ سندھ" ص ۶۹

ادبی جائزہ

میر صاحبان کے عہد حکومت میں سندھی زبان اور ادب نے ترقی کی اور بھی منزلیں طے کیں اور سندھی شعر کی متعدد صنفوں میں مزید پختگی اور شستگی پیدا ہوئی۔ ذیل میں اس دور کا ادبی جائزہ پیش کیا جاتا ہے:-

(۱) اس دور کی شاعری میں عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال کثرت سے نظر آتا ہے، سید ثابت علی شاہ اس سلسلے میں سب سے پیش پیش ہیں۔ انہوں نے عربی اور فارسی الفاظ کے امتزاج اور ان کی بندش کی نہایت ہی خوبصورت مثالیں پیش کی ہیں۔

(۲) عروضی شاعری اور غزل کے آثار کلہوڑہ دور میں ملے ہیں لیکن اس دور کے اکثر شعرا نے غزل پر طبع آزمائی کی اور بہت اعلیٰ پایہ کی غزلیں کہیں۔ اس سلسلے میں حضرت سچل سرمست، محمد عارف صنعت، سید ثابت علی شاہ، خلیفہ کرم اللہ، میر نصیر خان، میر شہداد خان، میر حسین علی خان، میر حسن علی خان اور آخوند محمد بچل انور کے اسما قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ اس دور میں مرثیہ، سلام، مثنوی، رباعی، مخمس اور مسدس وغیرہ کی صنفیں بھی رائج ہوئیں اور عروضی شاعری میں کثرت سے شعر کہا گیا۔ سید ثابت علی شاہ کے مرثیے اور سلام قدامت کے علاوہ فنی اعتبار سے خواہ مضمون آفرینی کے لحاظ سے سندھی ادب میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

(۳) اس دور میں منظوم قصہ گوئی بھی رائج ہوئی۔ پیر پاگارہ سید محمد راشد صاحب پہلے شاعر ہیں، جنھوں نے "ادن جو قصو" کے عنوان سے ایک قصہ منظوم کیا۔ ان کے علاوہ دیگر قصہ گو

شعرا حفیظ تیونہ اور خلیفہ عبداللہ ھیں۔ حفیظ تیونہ کا "مومل رانو" اور خلیفہ عبداللہ کا "لیلیٰ مجنوں" شاھکار کی حیثیت رکھتے ھیں۔

(۴) اس دور میں کافی کی بڑی پختگی ھوئی اور اس میں مزید دلکشی اور اثرانگیزی اور رنگینی پیدا ھوئی۔ کافی کو نقطۂ عروج پر پہنچانے والے حضرت سچل سرمست ھیں جن کے کلام میں کافی کے بہت زیادہ نمونے ھیں۔ کافی آجکل جس ھیئت میں نظر آتی ھے، اس کی تکمیل حضرت سچل سرمست کے ھاتھوں ھوئی ھے۔ کافی کے دیگر بلند پایہ شعرا ھیں فتح فقیر، صدیق فقیر، مراد فقیر، حمل خان لغاری، خلیفہ نبی بخش لغاری، پیر محمد اشرف اور صوفی دلپت۔

(۵) سندھی شاعری میں "گھڑولی" کی صنف بھی اس دور میں ایجاد ھوئی، جس کے موجد حضرت سچل سرمست ھیں۔

(۶) جھولنہ بیت کی ایک قسم ھے، اور اس کے موجد بھی حضرت سچل سرمست ھی ھیں (۱)۔

(۷) اس دور میں الف اشباع والے قافیہ میں چند کبتیں اور کتابیں تصنیف کی گئیں اور اس قسم کا شعر سید خیر شاہ، پیر محمد اشرف اور مولوی ولی محمد وغیرھم نے کہا۔

(۸) سی حرفی کچھ عرصہ پہلے رائج ھوچکی تھی، لیکن اس صنف کے خاص اور بلند پایہ شعرا اس دور میں ھوئے جنھوں نے اس کو درجۂ کمال تک پہنچایا۔ ان میں سے حمل خان لغاری،

---

(۱) گھڑولی اور جھولنہ کی تشریح ضروری ھے۔ ان دونوں صنفوں اور شعر کی دیگر صنفوں کے درمیان کیا فرق اور کیا تعلق ھے، اور ان دونوں صنفوں کی امتیازی علامات کیا ھیں؟ ان باتوں کی وضاحت کرنی چاھیئے۔ (مترجم)

ملا صاحبڈنہ، خلیفہ نبی بخش لغاری اور آخوند محمد بچل کے نام قابل ذکر ہیں۔

(۹) مدح اگرچہ کلہوڑہ دور میں بھی رائج تھی، لیکن اس دور میں مدح کے متعدد شعرا پیدا ہوئے۔ مثلاً ملا صاحبڈنہ، صدرالدین چارن، حمل خان لغاری، فتح فقیر اور آخوند محمد بچل انور وغیرھم۔ ملا صاحبڈنہ کی مدح "اغثنی یا سیدا" ایک شاھکار کی حیثیت رکھتی ہے اور سندھ کے کونہ کونہ میں مشہور و مقبول ہے۔

(۱۰) مولود کا رواج بھی پہلے سے تھا، لیکن اس دور میں اس صنف نے بڑی ترقی کی اور متعدد شعرا نے مولود کہے۔ مثلاً فتح فقیر، خلیفہ کرم‌اللہ، پیر محمد اشرف اور ملا صاحبڈنہ۔

(۱۱) رزمیہ شاعری کا نمونہ سب سے پہلے شاہ لطیف کے "سر کیڈارو" میں ملتا ہے۔ اس دور میں بھی رزمیہ شعر کہا گیا۔ اس سلسلہ میں خلیفہ نبی بخش کا سر کیڈارو خصوصی اھمیت کا حامل ہے، جسے ہم پہلا قومی شعر کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ اس میں سندھ کے بہادروں کی تعریف و توصیف قومی جذبہ اور ولولہ کے ساتھ کی گئی ہے۔ سید ثابت علی شاہ اور سید حیدر شاہ کے کلام میں بھی رزمیہ شاعری کے نمونے ملتے ہیں۔

(۱۲) مناظرہ کی صنف بھی پہلی بار اس دور ملی ہے۔ سید خیر شاہ اولین شاعر ہیں جن کا ایک منظوم مناظرہ "ٹوپی اور پگڑی" کے عنوان سے ملا ہے۔ اس کے بعد اس صنف پر متعدد شعرا نے طبع آزمائی کی ہے۔

(۱۳) ھجوگوئی کا رواج بھی اس دور میں ہوا۔ سید حیدر شاہ اور سید ثابت علی شاہ کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی، جس پر سید

ثابت علی شاہ نے سید حیدر شاہ کی ھجو میں "چنگاری" اور "لکڑی" کے عنوان سے طویل نظمیں کہیں۔ یہ چھوٹے کتابچے ھیں جو ابھی تک شایع نہیں ھوئے۔ سید حیدر شاہ نے بھی جواب میں ھجویہ اشعار کہے، اور اس طرح ھجوگوئی رائج ھوئی۔

(۱۴) معجزے بھی اس دور میں کہے گئے۔ سید خیر شاہ معجزہ کے بہترین شاعر ھیں۔ اس قسم کی نظم میں حضور پرنور محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے منظوم کئے جاتے ھیں۔ لیکن بعض شعرا نے اولیائے کرام کی کرامتیں منظوم کر کے انہیں بھی معجزہ کا نام دیا ھے۔

(۱۵) منقبتیں پہلی بار اس دور میں کہی گئیں۔ نظم کی اس صنف میں اھلبیت عظام، اصحاب کرام اور اولیاء اللہ کی تعریف کی جاتی ھے۔ پیر محمد اشرف منقبت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

(۱۶) مناجات میں التجا، پکار اور آہ و زاری ھوتی ھے۔ سب سے پہلے آخوند محمد بچل انور کی مناجات دستیاب ھوئی ھے۔

(۱۷) اس دور میں ھندو شعرا کے نام بھی ملے ھیں، اور ان ھی کی بدولت "سلوک" کی صنف رائج ھوئی۔ اس دور میں سامی کے سلوک قدامت کے اعتبار سے خواہ فنی پختگی کے لحاظ سے بڑی اھمیت رکھتے ھیں۔ ویدانت کی اصطلاحات کا رواج بھی اسی دور میں نظر آتا ھے۔ ھندو شعرا سامی اور دلپت کے علاوہ روحل فقیر اور مراد فقیر کے کلام میں بھی ویدانتی اصطلاحات کا استعمال عام ھے۔

(۱۸) اس دور میں پہلی مرتبہ نثر کے ابتدائی نمونے ملے ھیں۔ پہلی نثر آخوند عزیزاللہ کا قرآن مجید کا تحت اللفظ ترجمہ ھے۔ اس کے بعد عیسائی مبلغین نے انجیل کے بعض حصوں کے ترجمے کئے۔ خلیفہ محمود کے ملفوظات بھی سندھی نثر میں ھیں۔

باب ہفتم

برطانوی دور (۱۸۴۳ء – ۱۹۴۷ء)

فصل اول

تاریخی پس منظر

انگریزوں نے سازشوں اور فریب کاریوں کے ذریعہ سنہ ۱۸۴۳ء میں میانی اور دوآبہ کی لڑائیوں میں میر صاحبان کو شکست دیکر سندھ پر قبضہ کر لیا۔ سر چارلس نیپئر کو سندھ کا پہلا گورنر مقرر کیا گیا اور سندھ کا دارالحکومت حیدرآباد سے کراچی منتقل کر دیا گیا۔ چارلس نیپئر نے جس طریقے سے سندھ کو فتح کیا، اس کے متعلق خود لارڈ ایلنبرو گورنر جنرل نے اعتراف کیا ہے کہ "میں نے سندھ کو فتح کرکے ایک عظیم گناہ کیا ہے"۔

چارلس نیپئر چھ برس تک سندھ کے گورنر رہے۔ اس کے بعد سندھ کا الحاق صوبۂ بمبئی کے ساتھ کر دیا گیا اور مسٹر پرنگل کو سندھ کا پہلا کمشنر مقرر کیا گیا۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں عوام نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی، جسے انگریز دبانے میں کامیاب ہو گئے۔ سندھ میں جیکب آباد کے دریا خان اور دلمراد خان نے اس میں اچھا کردار ادا کیا۔ سر سید احمد خان کی تحریک سے متاثر ہو کر حسن علی آفندی نے کراچی میں "نیشنل محمڈن ایسوسیشن" قائم کی، اور سنہ ۱۸۸۵ء میں "سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی" کی بنیاد رکھی۔

لوگوں نے جدید تعلیم حاصل کی تو ان میں سیاسی شعور پیدا ہوا اور رد عمل کے طور پر سنہ ۱۸۸۵ء میں "انڈین نیشنل کانگریس" قائم کی گئی، جس میں ہندوؤں کا غلبہ تھا۔ لہذا اس برصغیر کے مسلمانوں نے سنہ ۱۹۰۶ء میں "آل انڈیا مسلم لیگ" کے نام سے ایک علیحدہ جماعت برپا کی۔ سندھ میں مسلم لیگ کی صوبائی شاخ سنہ ۱۹۱۷ء میں مرحوم غلام محمد خان بھرگڑی کی کوشش سے قائم ہوئی۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں ترکی کے ایک علاقہ طرابلس پر اٹلی نے حملہ کیا۔ سندھ اور ہندوستان کے مسلمانوں نے اخبارات میں ترکی کے مسلمانوں پر اٹلی کے مظالم کے حالات دیکھے تو ان میں بڑا جوش و خروش پیدا ہوا، اور ان کے دلوں میں ترکی کے لئے ہمدردی اور محبت کا جذبہ موجزن ہوا، اور سندھ کے مسلمانوں نے چندہ جمع کر کے ترکی بھیجا۔ سندھ میں ترکی ٹوپی کا رواج انھی دنوں کی یادگار ہے۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی، جس میں ترکی انگریزوں کا حریف تھا۔ اس برصغیر کے مسلمانوں کی تمام تر ہمدردیاں ترکی کے ساتھ تھیں۔ اس موقعہ پر علی برادران نے اپنی شعلہ بار تقریروں اور تحریروں سے پورے برصغیر میں آگ لگادی۔ کراچی میں ان پر بغاوت کا مقدمہ قائم ہوا، جس میں سندھ کے ایک بزرگ عالم حضرت مولانا پیر غلام مجدد سرہندی (مٹیاری ضلع حیدرآباد) بھی ملزم تھے اور علی برادران کے ساتھ سزایاب ہوئے۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی نے ہندوستان کو انگریزوں کے تسلط سے آزادی دلانے کے لئے ایک

خفیہ تحریک چلائی، جس میں علمائے کرام اور نوجوان مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں نے بھی شرکت کی۔ اس تحریک میں سندھ سے حضرت مولانا تاج محمود امروٹی، حضرت مولانا محمد صادق (کھڈہ، کراچی) حضرت مولانا عبیداللہ سندھی اور شیخ عبدالرحیم (آچاریہ کرپالانی کے بڑے بھائی) نے سرگرم حصہ لیا۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں اسی تحریک سے متعلق ریشمی رومال پر کاڑھا ہوا خفیہ عہدنامہ پکڑا گیا، جس کی وجہ سے یہ تحریک ناکام ہوگئی، اور اسی ناکامی کے باعث حضرت مولانا عبیداللہ سندھی پچیس برس تک اس ملک سے باہر جلاوطنی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ یہ تحریک "ریشمی رومال کی تحریک" کے نام سے مشہور ہوئی۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی پچیس برس جلاوطن رہنے کے بعد سنہ ۱۹۳۹ء میں خان بہادر اللہ بخش سومرو وزیراعلیٰ سندھ کی کوشش سے اپنے وطن میں واپس آئے۔

ترکی کے خلاف انگریزوں کی سازشیں بڑھتی رہیں، اس لئے برصغیر کے مسلمانوں نے سنہ ۱۹۱۹ء میں خلافت اور حرمین شریفین کے تحفظ کی خاطر "آل انڈیا خلافت کمیٹی" قائم کی۔ سندھ کے مسلمانوں نے اس تحریک میں بے پناہ جوش و خروش اور انتہائی جذبہ اور ولولہ کے ساتھ حصہ لیا۔ اس حد تک کہ برصغیر کو "دارالحرب" قرار دیکر یہاں سے ہجرت کی تحریک شروع کی گئی اور لاڑکانہ کے نوجوان بیرسٹر جناب جان محمد جونیجو کی سرکردگی میں سندھ کے ہزاروں مسلمان اپنا مال و متاع اونے پونے بیچ کر اور ملازمتیں چھوڑ کر افغانستان کو ہجرت کرنے لگے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کو کامیاب بنانے کے لئے حاجی عبداللہ ہارون اور شیخ عبدالمجید سندھی نے کراچی سے "الوحید" کے نام سے ایک روزانہ اخبار جاری کیا، جس نے نہ صرف اس تحریک میں نئی جان ڈالی، بلکہ سندھ کے

مسلمانوں کی صحیح رہنمائی بھی کی۔ اس تحریک میں جن حضرات نے نمایاں حصہ لیا ان میں سے چند قابل ذکر اسما درج ذیل ھیں:-

حضرت مولانا تاج محمود امروٹی، حضرت مولانا محمد صادق (کراچی)، رئیس غلام محمد خان بھرگڑی، جناب جان محمد جونیجو، حاجی عبداللہ ھارون، شیخ عبدالمجید سندھی، پیر صاحب جھنڈے والے، حکیم فتح محمد سہوانی، پیر غلام مجدد سرھندی (مٹیاری)، پیر تراب علی شاہ (قنبر ضلع لاڑکانہ)، قاضی خدابخش اور مولانا سید اسداللہ شاہ ٹکھڑائی وغیرھم۔

اس دور میں سندھ کے شعرا نے تحریک خلافت سے متاثر ھو کر انگریزوں کی سخت مذمت کی اور ترکی کے احرار مجاھدین کی فتح و نصرت کے لئے دعائیں مانگیں۔ اس سلسلے میں خود مولانا تاج محمود امروٹی کے اشعار بھی دستیاب ھوئے ھیں۔ فرماتے ھیں:-

ڏي ڏٹي تون فتح ڪامل مصطفيٰ احرار کي	اے مولا! مصطفیٰ کمال پاشا اور ان کے احرار کو فتح کامل عطا فرما۔
مرد غازين کي مدد ڏي هرجاء سندن هر ڪار کي	مردان غازی کی ھر جگہ اور ھر کام میں مدد فرما۔
ويڙهه ويرين جي مٿان تکڙو ڪيو ترڪن تمام	ترکوں نے دشمنوں پر بڑی تیزی کے ساتھ یلغار شروع کردی ھے۔
ڌڙ مسيون سورهه ڪٽين ويرين سندي ڪاپار کي	اور وہ بہادر ان کے سر، ان کے جسموں سے کاٹ کر الگ کر رھے ھیں۔
ترڪ تازا ڪر توانا آل عثمان جي سدا	ترکان آل عثمان کو ھمیشہ تازگی اور توانائی عطا فرما۔
ناس ڪر سارا نصارا راڄ روسين زار کي	اور نصاریٰ کی ھستی اور زار روس کی حکومت کو تہس نہس فرما۔

شکارپور کے حبیب اللہ خادم نے بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے:-

اِجھا ڪئي اسان جي خدا سوب ساري
هاريندين هند مؤن حڪومت هچاري
رهي شل شادان هميشه تاب ترڪي
ڏسي ڏورئون جهنڊ و جهادي ڏڪي ويو ڏڪاري
مرد غازيءَ کي ميدان ۾ مدد ڏيندو مولا
هڻن نعرو حيدري وجي ويرين ساهه ساري
صليبي سر نگون هر جاءِ ڪر علم اسلام جو اعليٰ
مبارڪ باد ڪمال پاشا، ملعون جنهن ماري
اهڙو هٿئون ويلو نه ڇڏ مور خادم!
پڙهي الحمد نڪر پڙ ۾ پري ڪر پرت پياري

بس، ابھی خدا نے ہمیں فتح و نصرت عطا کی اور ہندوستان کی منحوس حکومت شکست یاب ہوئی ترکی ہمیشہ خوش اور باحشمت رہے اور دشمن دور سے اس کا علم جہاد دیکھ کر لرز جائے مردان غازی کی میدان کارزار میں مولا مدد کریگا۔ مجاھد جب نعرۂ حیدری بلند کرتے ہیں تو دشمن کی جان نکل جاتی ہے۔ اے خدا! صلیبیوں کو ہر جگہہ سر نگوں کر اور اسلام کے علم کو بلند رکھ۔ مصطفےٰ کمال کو مبارک ہو، جنہوں نے ملعونوں کو مار بھگایا۔ اے خادم! وقت ضایع نہ کر، الحمد للہ پڑھکر میدان کار زار میں کود جا، اور مجازی عشق و محبت کی باتیں بھول جا۔

میر علی نواز علوی شکارپوری نے ترکوں کی تعریف و توصیف میں ایک طویل قصیدہ لکھا۔ ان کے علاوہ دیگر متعدد شعرا نے بھی اشعار کہے، اور اس طرح سندھی شاعری میں "قومی شاعری" کی

ابتدا ہوئی۔ اس سلسلہ میں جن شعرا نے نمایاں حصہ لیا، ان میں سے اللہ بخش ابوجھو، محمد ہاشم مخلص، حکیم فتح محمد سہوانی، شمس الدین بلبل اور غلام احمد نظامی کے اسما قابل ذکر ہیں۔ ابوجھو مرحوم، سندھ والوں کا حال زار بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

سندھی	اردو
جڏهن هاڻ اڻ هوند گهيريو گهرن کي	اب جبکہ افلاس نے گھروں کو گھیر لیا ہے
ورايو اچي وير اسلامين کي	اور ہلاکت خیز موج نے مسلمانوں کا احاطہ کرلیا ہے
پئي ڪل غفلت جي هاڻ ٿي کرين کي	تب ان کو اپنی غفلت کا احساس ہوا ہے
تڏهن ٿيا ڪرڻ پاڻ دانهن تي دانهون	اور فریاد پر فریاد کرنے لگے ہیں
تہ تاري ڪو هيءَ تار پاڻي اتانهون	کہ کوئی اس سیلاب بلا سے تیرا کر ہمیں پار پہنچا دے

سنہ ۱۹۳۶ء میں سندھ صوبہ بمبئی سے علیحدہ ہوا۔ سر لانسی لاٹ گراہام سندھ کے پہلے گورنر ہوئے۔ اسی زمانہ میں لوگ سوشلسٹ نظام سے اثر پذیر ہونے لگے، اور سندھ میں کسانوں کی حالت زار کی اصلاح کے لئے "ھاری حقدار" تحریک کی بنیاد رکھی گئی۔ ابتدا میں اس کے روح رواں کامریڈ عبدالقادر تھے۔ بعد میں حیدر بخش جتوئی ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ سے مستعفی ہوکر اس تحریک سے وابستہ ہوئے، اور اس طرح اس عوامی تحریک کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔

اس زمانے میں آزادی کی تحریک بھی روز افزوں ترقی کرتی اور زور پکڑتی گئی۔ سندھی ادب پر ترقی پسندی کا اثر ہوا، اور اس میں نئے رجحانات کی ابتدا ہوئی۔ سندھی کے بعض شعرا نے گل

و بلبل کی شاعرانہ روایت کو ترک کر کے عوامی جذبات و احساسات کی ترجمانی کی اور عوام میں بیداری پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس قسم کی شاعری کے بنیادی اور ابتدائی شعرا میں سے شمس الدین بلبل، حیدر بخش جتوئی اور کشن چند بیوس کے اسما قابل ذکر ہیں۔ کشن چند بیوس کو اولیت حاصل ہے اور اس سلسلہ میں ان کی حیثیت ستارۂ صبح کی سی ہے۔

سنہ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی، جس کے نتیجہ میں تحریک آزادی نے اور بھی زور پکڑا۔ آخر کار سنہ ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا، اور پاکستان کے نام سے مسلمانوں کی نئی مملکت وجود میں آئی۔ سندھ، پاکستان کا ایک صوبہ بنا اور کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت قرار دیا گیا۔ سنہ ۱۹۴۸ء میں کراچی کو سندھ سے الگ کرکے فیڈرل ایریا بنایا گیا۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں سندھ، بلوچستان، سرحد اور پنجاب کو ملا کر ایک صوبہ کردیا اور اسے "ون یونٹ" کا نام دیا گیا۔ ۲۸- نومبر ۱۹۶۹ء کو صدر یحییٰ نے ون یونٹ کو توڑنے کا اعلان کیا، اور یکم جولائی سنہ ۱۹۷۰ء کو سندھ بحیثیت ایک صوبہ کے از سرنو وجود میں آیا اور کراچی کو بھی پھر سے اس کے ساتھ ملایا گیا۔

سندھی رسم الخط

عرب سیاحوں کے سفر ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب دور میں سندھی زبان مختلف رسم الخطوں میں لکھی جاتی تھی۔ بھنبھور کی کھدائی سے جو ٹھیکریاں ملی ہیں، ان پر دیوناگری رسم الخط کے ایک طرز میں سندھی کے حروف لکھے ہوئے ہیں۔ عربوں کی آمد کے بعد سندھ کے مسلمان علما نے سندھی زبان کو عربی رسم الخط

میں لکھنا شروع کیا اور عربی حروف سے سندھی حروف وضع کئے۔ یہ خط پورے ملک میں رائج ہو گیا، حالانکہ مقامی طور پر قدیم رسم الخط بھی رائج رہے۔ اس کے علاوہ "خواجکو سندھی خط" اور "میمنکو سندھی خط" بھی مروج رہے۔ خواجکو سندھی خط چالیس حروف پر مشتمل ہے، جسے اسماعیلی داعی پیر صدرالدین نے مرتب کیا (۱)۔ خواجکو خط اور میمنکو خط دیوناگری رسم الخط کے نئے نمونے تھے۔

سندھی صوتیات کے لئے حروف تہجی کے تعین کے بعد سندھ میں بھی سندھی اصوات کے اظہار کے لئے املا کی مختلف صورتیں رائج رہیں۔

انگریزوں نے فارسی کے بجائے سندھی کو دفتری اور تعلیمی زبان مقرر کرنے کا فیصلہ کیا، اور سنہ ۱۸۵۱ء میں کمشنر سندھ سر بارٹل فریئر نے ایک حکم نامہ جاری کیا کہ سرکاری افسر سندھی میں امتحان پاس کریں۔ اس لئے سندھی کے لئے ایک مقررہ رسم الخط ضروری سمجھا گیا۔ جس کے لئے اسسٹنٹ کمشنر مسٹر ایلس کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بنائی گئی، تاکہ وہ سندھی رسم الخط کے متعلق مشورے پیش کرے۔ اس کمیٹی پر جو مقامی ہندو اور مسلمان اہل علم نامزد کئے گئے تھے، ان کے اسما یہ ہیں: (۱)۔ رائے بہادر نارائن جگن ناتھ (۲) خان بہادر مرزا صادق علی بیگ (۳) دیوان پربھداس انند رام رامچندانی (۴) دیوان ادھارام تھانورداس میرچندانی (۵) دیوان نندی رام میرانی (۶) میاں محمد حیدرآباد (۷) قاضی غلام علی (۸) میاں غلام حسین۔

---

(۱) "سندھی صورت خطی" از خواجہ غلام علی الانا ص ۴

بالآخر سنہ ۱۸۵۳ء میں عربی۔ سندھی رسم الخط کے جو حروف جداگانہ صورتوں میں لکھے جاتے تھے ان کے لئے ایک ھی صورت مقرر کی گئی، اور اسی یکساں رسم الخط میں درسی اور غیر درسی کتابیں چھپنی شروع ھوگئیں۔ سندھی حروف کی یکساں صورتیں اس طرح مقرر ھوئیں: ٻ، ڀ، ٿ، ٽ، ٺ، ڦ، ڳ، ڱ، ک، ڌ، ڏ، ڊ، ڍ، ڄ، ڃ، ڇ، ڙ، جھ، گھ۔ بعض اھل علم کو اس میں خامیاں نظر آئیں۔ خود ڈاکٹر ٹرمپ نے بھی، جنھوں نے جرمنی سے شاہ عبداللطیف کا رسالہ شایع کیا، اس رسم الخط سے اتفاق نہیں کیا، اور انھوں نے بعض اصوات کے لئے حسب ذیل حروف تہجی استعمال کئے :-

ڀ=بھ ، ٿ=تھ ، ٽ=ٹر، ٺ=ٹھ، ڦ=پھ، ڄ=نج، ڇ=چھ، ڌ=دھ، ڏ=ڈ، ڊ=د۔

خلیفہ گل محمد ھالائی نے سنہ ۱۲۷۲ھ میں بمبئی میں اپنا دیوان چھپوایا، اس میں بھی سندھی حروف کے لئے مختلف صورتیں استعمال کی گئی ھیں۔ مثلاً :-

جھ=جؐ ، ڏ=ڎ ، ڙ=رؐ، گھ=کؐ، لھ=لؐ، نھ=نؐ (۱)

اس کے علاوہ جو مذھبی کتابیں بمبئی میں چھپوائی جاتی تھیں، ان میں بھی قدیم رسم الخط استعمال کیا جاتا تھا (۲)۔

ابھی تھوڑا عرصہ ھوا کہ ایک اھل علم کو سنہ ۱۸۷۷ء میں محکمۂ پوسٹ کی جانب سے چھپوایا ھوا ایک رجسٹر ملا ھے جس میں دیسی زبانوں کے املا کے مختلف نمونے ھیں۔ اس میں سندھ میں مروج رسم الخطوں کے نام اس طرح درج ھیں :- عربی۔ سندھی، عربی۔ سندھی کا دوسرا نمونہ، اروڑی ، خوجکی ، شکارپوری، کراری

---

(۱) "دیوان گل اور خلیفہ گل محمد ھالائی"، مقالہ از میمن عبدالمجید سندھی، اسلامیہ کالیج میگزین ۶۴-۱۹۶۳ء ص ۱۱، ۱۲

(۲) "سندھ کی ادبی تاریخ" از محمد صدیق میمن حصہ اول ص ۱۷۰

اور روزی(۱)۔ یہ مقامی خط تھے جو بعض قبیلوں یا شہروں میں رائج رہے۔ انگریزوں کے ابتدائی دور میں حسب ذیل رسم الخط بھی رائج تھے:۔

(۱) خدادادی (خداآبادی) (۲) ساکھرو (۳) ٹھٹائی (۴) لاڑائی (۵) ونکائی (۶) راجائی (۷) خواجکو (۸) میمنکو (۹) سہوانی بابڑا (۱۰) سرائی (شمالی سندھ میں مروج) (۲)۔

سنہ ۱۸۸۸ء میں جب جان جیکب سندھ کے گورنر ہوئے تو انہوں نے سندھی رسم الخط کی اصلاح کی جانب توجہ کی۔ عربی۔سندھی رسم الخط میں جو حروف مختلف صورتوں میں تحریر کئے جاتے تھے، ان کی اصلاح کردہ صورت متعین کر کے نقشے تیار کروائے اور انہیں اسکولوں کے اندر لگوادیا۔ اس کے باوجود بعض خامیاں رہ گئیں، مثلاً "ئین" کے لئے الف ہمزہ "ء" کے نیچے عمودی خط میں دو زیر "اا"، اور "ئوں" کے لئے الف ہمزہ (ء) کے اوپر دو پیش (ءٗ) دیئے جاتے تھے۔ سنہ ۱۹۱۵ء میں اس طرف توجہ دی گئی۔ ایک کمیٹی بنی، جس میں خصوصی کام کرنے والے مرحوم میرزا قلیچ بیگ تھے۔ کمیٹی نے ان الفاظ کی فہرست تیار کی، جو مختلف صورتوں میں یا غلط طریقہ پر لکھے جاتے تھے۔ ان الفاظ کی ترمیم اور اصلاح کردہ صورتیں اخبار "تعلیم" مئی ۱۹۱۵ء میں شایع کی گئیں۔

سندھی کتابوں کی طباعت

سندھی رسم الخط کی ترمیم، اصلاح اور آخری تعین کے بعد سندھی زبان میں درسی کتابیں اور دیگر نثر و نظم کی کتابیں طبع

---

(۱) اسلامیہ کالج میگزین ۶۴-۱۹۶۳ء ص ۱۵

(۲) "سندھی صورت خطی" از خواجہ غلام علی الانا ص ۱۰، ۱۱

ہونا شروع ہو گئیں۔ سنہ ۱۸۵۳ء میں بچوں کے لئے ایک درسی کتاب "باب نامہ" چھاپی گئی، جو نندی رام میرانی نے لکھی تھی۔ اسی سال ادھارام تھانورداس کی لکھی ہوئی سندھی کی پہلی اور دوسری کتابیں چھپیں۔ تیسری اور چوتھی کتابیں بھی اسی سال میں چھاپی گئیں، جو پربھداس انند رام نے لکھی تھیں۔ اس کے بعد یہ کتابیں ہر سال چھپتی رہیں۔ سندھی کی پانچویں اور چھٹی کتابیں بھی پربھداس انند رام ھی نے لکھیں، جو سنہ ۱۸۶۶ء اور سنہ ۱۸۶۷ء میں چھپیں۔ درسی کتابوں کے علاوہ دیگر علوم و فنون پر بھی کتابیں لکھی اور چھاپی جانے لگیں۔(۱)

آرٹ اور سائنس کے سلسلے میں پہلی کتاب ڈرائینگ کے بارہ میں "چٹ جی پاڑ" (نقش و نگار کی بنیاد) کے نام سے سنہ ۱۸۵۴ء میں چھپی، جو دراصل ھندی میں "سدا سکھ لالا" نے تصنیف کی تھی، اور خانداس اور منشی نندیرام نے اس کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۵۶ء میں نظام شمسی کے متعلق محمد شاہ کی تصنیف کردہ کتاب "آکاسی نروار" چھپی۔ گرامر کے سلسلہ میں سنہ ۱۸۵۴ء میں آدھارام تھانورداس کی پہلی سندھی کتاب "ننڈھو سندھی ویا کرن" چھپی۔ اس سال سندھی کی تعلیم دینے کے لئے پہلا نارمل سندھی اسکول قائم ہوا۔ منشی ادھارام سے قبل ہریسٹ واتھن اور اسٹوک نے سندھی گرامر پر کتابیں لکھیں۔ اسٹوک نے سنہ ۱۸۴۳ء میں کتاب لکھی تھی۔ اسی سال لیچ نے بھی گرامر اور لغت پر کتابیں لکھیں۔ سنہ ۱۸۴۹ء میں جارج اسٹیک نے گرامر کے علاوہ ایک

---

(۱) ملاحظہ ہو راقم الحروف کی تیار کردہ (سندھالاجی کے لئے) سندھی کتابوں کی فہرست سنہ ۱۸۵۳ سے سنہ ۱۹۰۰ء تک۔

لغت بھی تیار کی - جغرافیہ کے سلسلہ میں پہلی کتاب "نئی دھرتی نروار" کے نام سے پہلی بار سنہ ۱۸۵۵ء میں اور دوسری بار سنہ ۱۸۶۱ء میں چھپی- یہ کتاب دنیا کے جغرافیہ کے متعلق تھی، جسے مہادیو شاستری اور منشی ادھارام نے انگریزی سے سندھی میں منتقل کیا تھا - ریاضی کی پہلی کتاب "لیکھے کی پیڑھ" (حساب کی بنیاد) نندیرام میرانی نے لکھی، جو سنہ ۱۸۵۵ء میں چھپی- تاریخ کی پہلی کتاب "ھندوستان کی تاریخ" قاضی غلام علی نے انگریزی سے سندھی میں ترجمہ کی جو سنہ ۱۸۵۴ء میں چھپی- اسی سال نندی رام میرانی نے "تاریخ معصومی" کا ترجمہ کیا، جو "تاریخ سندھ" کے نام سے چھپا - الجبرا پر سنہ ۱۸۵۶ء میں نندی رام اور وشو ناتھ کی تصنیف کردہ کتاب "جبر و مقابلہ" کے نام سے چھپی- سنہ ۱۸۶۸ء میں کوڑومل کھلنانی کی جامیٹری پر لکھی ہوئی کتاب "تحریر اقلیدس" چھپی- قانون پر سندھی میں پہلی کتاب "انڈین پینل کوڈ" سنہ ۱۸۶۳ء میں چھپی، جسے ھاسارام نے انگریزی سے ترجمہ کیا تھا - سنہ ۱۸۶۸ء میں یونانی طب پر کوڑومل کھلنانی کی تصنیف کردہ پہلی کتاب "اصول علم طبی" کے نام سے چھپی- سنہ ۱۸۷۱ء میں منطق پر سندھی میں مرزا غلام رضا بیگ کی پہلی کتاب "علم منطق" کے نام سے چھپی- اسی سال معاشیات پر سندھی میں پہلی کتاب مرزا صادق علی بیگ کی "علم معاشری" کے نام سے چھپی-

کہانیوں کے سلسلہ میں پہلی سندھی کتاب غلام حسین قریشی نے لکھی، جو "بھنبھو زمیندار کی کہانی" کے نام سے سنہ ۱۸۵۴ء میں چھپی- اس کے بعد سنہ ۱۸۵۵ء میں میراں محمد شاہ اول کی "سدھا توری کدھا توری" چھپی، یہ دو کہانیاں ھندی سے ماخوذ

ھیں۔ سنہ ۱۸۵۴ء میں منشی نندی رام نے "ایسپ کی کہانیاں" نامی کتاب کا ترجمہ کیا، جسے منشی ادھارام تھانورداس نے ازسرنو مرتب کیا اور اصلاح کے بعد سنہ ۱۸۷۱ء میں چھپوایا۔ سنہ ۱۸۸۶ء میں کہانیوں کا ایک مجموعہ "طوطی نامہ" کے نام سے چھپا، جسے منشی ادھارام نے فارسی سے لیا تھا۔ اس مجموعے کے آخر میں "وھیوں اور ولھے" کی کہانی بھی شامل کی گئی تھی، جس میں اکثر الفاظ "و" سے شروع ھوتے تھے۔ اسی سال منشی ادھارام کی تصنیف کردہ "رائے ڈیاچ کی کہانی" چھپی، جس پر آخوند عبدالرحیم عباسی نے نظرثانی کی تھی۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۶۱ء میں میراں محمد شاہ اول کی دوسری کتاب "مفیدالصبیان" چھپی۔ یہ بھی کسی ھندی کہانی سے ماخوذ تھی۔ اسی طرح ھر سال کہانیوں کی متعدد کتابیں چھپتی رھیں۔

لغات کے سلسلہ میں سنہ ۱۸۴۹ء میں کیپٹن جارج اسٹیک کی "انگریزی۔سندھی ڈکشنری" چھپی۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۵۴ء میں انھی کی تصنیف کردہ "سندھی۔انگریزی ڈکشنری" چھپی۔ ان دونوں لغتوں میں سندھی کے الفاظ دیوناگری رسم‌الخط میں تحریر کئے گئے تھے۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۶۸ء میں ل۔ وہ پرانچپی کی تصنیف کردہ انگریزی۔ سندھی ڈکشنری چھپی۔ پرانچپی ایک مرھٹہ تھے، جنھوں نے سندھ میں رہ کر سندھی زبان میں مہارت حاصل کی تھی۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں ریورنڈ جارج شرٹ کی "اکھر دھاتو" چھپی، جس میں سندھی کے الفاظ کی سنسکرت بنیاد بتائی گئی تھی۔ سنہ ۱۸۷۱ء میں آخوند عبدالرحیم وفا عباسی کی تصنیف "جواھراللغات" چھپی، جس میں خالص سندھی الفاظ کے فارسی معنی بتائے گئے تھے۔ سنہ ۱۸۷۵ء میں آخوند

فتح محمد کی تصنیف "کاشف الغموض" چھپی، جس میں سندھی الفاظ کے عربی اشتقاق اور معنی بتائے گئے تھے۔ سنہ ۱۸۷۹ء میں شرٹ، ادھارام تھانورداس اور ص۔ ن۔ مرزا کی تیار کردہ سندھی۔ انگریزی ڈکشنری چھپی۔ سنہ ۱۸۸۶ء میں جھمٹ مل نارومل کی "سندھی وُیپتی کوش" چھپی، جس میں سندھی کے الفاظ کی سنسکرتی بنیادیں بتائی گئی ہیں۔ اس کے بعد بیسویں صدی میں لغات کی متعدد کتابیں شایع ہوئیں۔

الف اشباع والے قافیہ میں سندھی کی منظوم مذہبی کتابیں قدیم سندھی رسم الخط میں سنہ ۱۸۵۴ء سے قبل بھی شایع ہوئی تھیں اور بعد میں بھی شایع ہوتی رہیں۔ ان میں اہم اور قابل ذکر کتابیں یہ ہیں:-

ابوالحسن کی سندھی، زادالفقیر، نور نامہ، رحمۃ المؤمنین، حکایات الصالحین، مطلوب المؤمنین، کنزالعبرت، الصحیفۃ الکاملہ اور روضۃ الشہداء وغیرہ۔

عیسائی مذہب سے متعلق بعض کتابیں سنہ ۱۸۵۳ء سے قبل بھی شایع ہوئی تھیں لیکن نئے رسم الخط کے تعین کے بعد سنہ ۱۸۵۳ء میں "یوحنا" کی انجیل کا ترجمہ شایع ہوا۔ اس کے بعد انجیل اور اس کے متعدد حصوں کے ترجمے شایع ہوئے۔ ہندو دھرم سے متعلق پہلی کتاب "گنگا اشنان" گدومل سنت داس کی تصنیف کردہ سنہ ۱۸۹۰ء میں چھپی۔ اس کے بعد نہایت ہی تیزی کے ساتھ کتابیں چھپنا شروع ہوگئیں۔

سندھی کی منظوم کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ سنہ ۱۸۶۶ء سے شروع ہوا، جبکہ ارنیسٹ ٹرمپ نے جرمنی سے شاہ لطیف کا رسالا شایع

کیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۷۵ء میں "دیوان گل"، سنہ ۱۸۷۶ء میں "بیان العارفین" اور سنہ ۱۸۷۸ء میں "دیوان قاسم" شایع ہوئے۔ تنقید کے فن پر سید فاضل شاہ کی سب سے پہلی تصنیف "میزان الشعراء" کے نام سے سنہ ۱۸۸۳ء میں شایع ہوئی، اور پھر سال بسال متعدد کتابیں شایع ہوتی رہیں۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں ایک سو سے زیادہ صرف کہانیوں کی کتابیں شایع ہوئیں (۱)۔ ابتدائی کتابوں کی جو تفصیل اوپر بیان کی گئی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سندھ کے اہل علم اور اہل قلم نے نثر اور نظم کی ہر صنف پر اور جدید علوم و فنون کے ہر شعبہ میں شروع ہی سے معیاری کتابیں لکھیں اور شایع کیں۔

ابتدا میں جن مصنفین نے کتابیں تصنیف کیں، ان کے اسما درج ذیل ہیں:-

(۱) منشی نندی رام سہوانی (۲) خانداس (۳) قاضی غلام حسین (۴) آدھارام تھانورداس (۵) میراں محمد شاہ اول (۶) پربھداس اننّد رام (۷) غلام علی (۸) مہادیو شاستری (۹) جیٹھانند کھلنداس (۱۰) گل محمد (۱۱) حبیب اللہ (۱۲) آخوند عبدالرحیم عباسی (۱۳) محمد حسن (۱۴) وادھومل (۱۵) کوڑومل (۱۶) پریتمداس (۱۷) قسمت رائے (۱۸) آتمچند (۱۹) محمد رمضان (۲۰) سکھ لعل (۲۱) پرمانند (۲۲) وسوا ناتھ (۲۳) کنورمل (۲۴) محمد بچل (۲۵) چرنجی لعل (۲۶) میاں محمود (۲۷) جھمٹ مل (۲۸) عزیزاللہ متعلوی

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی مرتب کردہ "سندھی کتابوں کی فہرست"، اور "سندھی نثر کی تاریخ" از منگھارام ملکانی، ص ۱۶ تا ۲۸

(۲۹) محمد بن سلیمان (۳۰) آخوند فتح محمد (۳۱) رشی ڈیارام (۳۲) آلومل (۳۳) نارائن جگن ناتھ (۳۴) آخوند لطف اللہ (۳۵) مرزا غلام رضا بیگ (۳۶) مرزا صادق علی بیگ۔

بعد میں جن اهل علم و اهل قلم حضرات نے سندھی زبان کے سنوارنے میں حصہ لیا اور اس کے ادب میں اضافہ کیا، ان میں سے حسب ذیل اسما قابل ذکر ہیں:-

شمس الدین بلبل (وفات ۱۹۱۹ء)، امام بخش خادم (وفات ۱۹۱۸ء)، شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ (وفات ۱۹۲۹ء)، پرمانند میوارام (دیہانت ۱۹۳۸ء)، حکیم فتح محمد سہوانی (وفات ۱۹۴۲ء)، ڈاکٹر ھوتچند گربخشانی (دیہانت ۱۹۴۷ء)، جیٹھمل پرسرام گلراجانی (دیہانت ۱۹۴۸ء)، مولانا دین محمد وفائی (وفات ۱۹۵۰ء)، غلام محمد شاھوانی (وفات ۱۹۵۰ء)، احمد غلام علی چھاگلا (وفات ۱۹۵۳ء)، لالچند امرڈنومل جگتیانی (دیہانت ۱۹۵۴ء)، علی خان ابڑو (وفات ۱۹۵۷ء)، علامہ عمر بن محمد داؤدپوتہ (وفات ۱۹۵۸ء)، محمد بخش بن واصف (وفات ۱۹۵۴ء)، محمد صدیق میمن (وفات ۱۹۵۸ء)، خانچند شامداس دریانی، مہلارام منگترائے واسوانی، نارائن داس میوارام بھنبھانی، مرزا نادر بیگ، خلیق مورائی، عبدالرزاق میمن، آغا غلام نبی صوفی، محمد صدیق مسافر، عثمان علی انصاری، محمد ھاشم مخلص، میران محمد شاہ، حاجی محمود خادم، عطاحسین شاہ موسوی، عبدالحسین شاہ موسوی، ضیاء الدین بلبل۔

فصل دوم

نثر نویسی کا ارتقاء

نثر کی مختلف صنفوں کے ارتقا کی تاریخ بیان کرنے سے قبل، قابل ذکر نثر نویس حضرات کی زندگی کے مختصر حالات پیش کئے جاتے ہیں:-

۱- دیوان نندی رام میرانی: اٹھارھویں صدی میں متولد ہوئے اور انگریزوں کے ابتدائی دور میں انتقال کیا۔ عربی اور فارسی زبانوں میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ سرکاری اشتہار دیکھکر "تاریخ معصومی" کا سندھی میں ترجمہ کیا، جس پر انہیں دو سو روپیہ انعام ملا۔ اس کے بعد محکمۂ تعلیم کے ترجمان کے عہدہ پر مقرر کردیئے گئے۔ سندھی رسم الخط متعین کرنے والی کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔ تاریخ معصومی کے ترجمے کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف کیں:-

(۱) باب نامہ۔ اس میں بچوں کو سندھی حروف تہجی کا املا سکھایا گیا ہے۔

(۲) سیکھائتو نروار۔ اس میں تعلیم کے اصول اور ہدایات بیان کی گئی ہیں۔

(۳) لیکھے جو کتاب دو حصے (حساب و کتاب)۔

(۴) جبر و مقابلہ (الجبرا)۔

(۵) دھرتی نروار دو حصے۔

(۶) سنساری نروار۔
(۷) چٹ جی پاڑ (نقش و نگار کی بنیاد)
(۸) پیمائشی کتاب
(۹) ایسپ کی کہانیاں (انگریزی سے ترجمہ)۔

۲۔ منشی ادھارام تھانورداس میرچندانی : سنہ ۱۸۳۳ء میں متولد ہوئے اور سنہ ۱۸۸۳ء میں انتقال کیا۔ سندھیوں میں سے انگریزی سیکھنے والے یہ پہلے شخص تھے۔ شروع میں کمشنر کے دفتر میں ملازم تھے۔ بعد میں سندھی کے ترجمان مقرر ہوئے۔ سندھی رسم الخط والی کمیٹی کے ممبر تھے۔ سندھی کی درسی کتابیں لکھیں اور قصے کہانیاں بھی لکھیں، مثلاً رائے ڈیاچ، مہر منیر، "وھیوں اور ولھے کی کہانی"، کام سین اور کام روپ، "راسیلاس" ناول کا انگریزی سے سندھی میں ترجمہ، جو ڈاکٹر جانسن کی تصنیف ہے۔ اس ترجمہ میں دیوان نول رائے نے بھی ان کے ساتھ مل کر کام کیا۔

۳۔ سید میراں محمد شاہ اول : ٹکھڑ کے سادات خاندان میں سنہ ۱۸۲۹ء میں متولد ہوئے اور سنہ ۱۸۹۲ء میں رحلت فرمائی۔ عربی اور فارسی زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ ابتدا میں کمشنر کے میرمنشی مقرر ہوئے، وہاں سے ترقی کر کے ریزیڈنٹ مجسٹریٹ ہوئے۔ آخر ملازمت ترک کر کے وکالت شروع کی۔ خواجہ عبدالرحمان سرھندی کے مشورہ پر وکالت سے بھی دست بردار ہو کر حکمت کرنے لگے۔ ان کی تصنیفات میں سے "سدھا توری اور کدھا توری" کی کہانی، مفید الصبیان اور آکاشی نروار قابل ذکر ہیں۔

۴۔ مرزا غلام رضا بیگ : مرزا قلیچ بیگ کے بڑے بھائی تھے۔ شروع میں گورنمنٹ ھائی اسکول حیدرآباد میں فارسی زبان کے معلم

تھے - بعد میں ڈپٹی ایڈوکیشنل انسپکٹر ہوئے اور سنہ ۱۸۹۵ء میں انتقال کیا - سنہ ۱۸۷۱ء میں سندھی میں منطق پر ایک کتاب "مفتاح القلوب" لکھی، جس کی عبارت سلیس اور دلکش ہے -

۵- مولوی محمد عثمان : کھورواہ ضلع حیدرآباد کے باشندہ تھے- والد ماجد کا نام حافظ محمد نورنگ زادہ تھا - سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی کے اہم رکن اور معلم تھے - سندھ کے مسلمانوں کو انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کی جانب راغب کرنے کی کوشش کی - سنہ ۱۹۱۳ء میں سندھ مدرسہ کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور سنہ ۱۹۱۸ء میں انتقال کیا - سندھی اور فارسی میں متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے قرآن مجید کی تفسیر "تنویر الایمان" ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے - پچیس پاروں کی تفسیر مکمل کی تھی کہ داعی اجل کے پیغام کو لبیک کہا - باقی پانچ پاروں کی تفسیر ان کے فرزند مولوی محمد نورنگ زادہ نے لکھکر مکمل کردی - شعر بھی کہتے تھے - منظوم خطبے لکھے، اور ان کے علاوہ حسب ذیل تصنیفات یادگار چھوڑیں :- الاکسیر الاحمر فی اسرار الجفر، حالات غوث اعظم، بینات القرآن، تحفۃ الاسلام (پانچ جلدیں)-

۶- دیوان کوڑومل: سنہ ۱۸۴۴ء میں قصبۂ بھریا (ضلع نوابشاہ) میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۹۱۶ء میں انتقال کیا - سندھی اور فارسی زبانوں کی تعلیم حاصل کرکے کمشنر کے دفتر میں کلرک ہوئے - اس کے بعد ماسٹر، اور پھر ہیڈ ماسٹر ہوئے اور آخر میں ترجمان مقرر کر دیئے گئے - ان کا شمار سندھی ادب کے ابتدائی معماروں میں ہوتا ہے - ادبی ذوق کے ساتھ ساتھ معاشرتی اصلاح سے بھی دلچسپی رکھتے تھے - "سامی کے سلوک" پہلی بار انھی نے مرتب کئے -

اس کے علاوہ ڈرامے بھی لکھے، جن میں سے بعض ترجمے ھیں اور بعض ماخوذ۔ ان میں سے "رتناولی" قابل ذکر ھے جو سنسکرت کے ایک ڈرامہ کا ترجمہ ھے۔

۷- شمس‌الدین بلبل: میہڑ ضلع دادو میں سنہ ۱۸۵۷ء میں متولد ہوئے اور سنہ ۱۹۱۹ء میں انتقال کیا۔ بلند پایہ ادیب اور باکمال شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے صحافی بھی تھے۔ "معاون" کراچی اور "الحق" سکھر کے ایڈیٹر رہے۔

نثر خواہ نظم میں انداز بیان اور اسلوب نگارش میں انفرادیت رکھتے تھے۔ طنز و مزاح میں ندرت پیدا کرکے سندھی ادب میں ایک نیا موڑ پیدا کیا۔ نثر میں ان کی حسب ذیل تصانیف قابل ذکر ھیں:-

(۱) قلندری میلہ، (۲) تیرہ جال مکر کی مار، (۳) جھٹ سوال پٹ جواب، (۴) طریق‌الدولہ (دو حصے)، (۵) بخت بازی، (۶) عقل اور تہذیب، (۷) حکومت اور سندھ کے مسلمانوں کی تعلیم، (۸) انگریز اور مسلمان، (۹) مسلمان اور تعلیم، (۱۰) قرض، مرض اور اس کے علاج، (۱۱) گلزار لطائف (حصۂ اول منظوم)، (۱۲) نیچرل کریما، (۱۳) دیوان بلبل، اور (۱۴) کلام بلبل۔

۸- آخوند لطف‌اللہ: آخوند صاحب سنہ ۱۸۴۲ء میں حیدرآباد میں تولد ہوئے۔ حصول تعلیم کے بعد سندھی کے ماسٹر ہوگئے اور آخر میں ٹنڈو ولی محمد اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں انتقال کیا۔ "گل خنداں" کے نام سے "فسانۂ عجائب" کا آزاد ترجمہ کیا۔ عبارت مقفیٰ اور مسجع ھے اور انداز بیان نہایت ھی دلکش اور رنگین۔

۹- پرمانند میوارام: سنہ ۱۸۶۵ء میں حیدرآباد کے ایک ھندو عامل خاندان میں تولد ہوئے۔ جوانی میں عیسائی مذھب اختیار کرلیا تھا، جس پر تا زندگی قائم رھے۔ عیسائیت اختیار کرنے کے بعد "ایک حیدرآبادی" کے نام سے "قرآن کی بنیاد" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی، جس سے مسلمانوں میں سخت اشتعال پیدا ھوا۔ اس کے جواب میں حکیم فتح محمد سہوانی نے "فتح البآری" کے عنوان سے ایک کتاب لکھ کر اس کا مدلل اور معقول جواب دیا۔

سلیس، دلکش اور پر لطف سندھی لکھتے اور نثر نویسی میں ایک منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ اعلیٰ پایہ کے مضمون نگار تھے۔ ان کے مضامین اخبار "جوت" میں شایع ھوئے، جس کے ایڈیٹر وہ خود تھے۔ یہ اخبار سنہ ۱۸۹۶ء میں جاری ھوا۔ ان کے مضامین سندھی زبان کی ارتقائی تاریخ میں بڑی اھمیت کے حامل ھیں۔ بعد میں یہ مضامین کتابی صورت میں "گل پھل" کے نام سے دو جلدوں میں شایع ھوئے۔ گل پھل میں بعض مضامین دیگر اھل قلم کے بھی شامل ھیں، جو "جوت" میں شایع ھوئے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے سندھی۔ انگریزی اور انگریزی۔ سندھی لغات بھی لکھ کر شایع کروائیں۔ ان لغتوں کی تالیف اور ترتیب میں انہوں نے اپنی زباندانی اور علمی اور تحقیقی قابلیت کا پورا پورا ثبوت فراھم کیا ھے۔

۱۰- آخوند حاجی فقیر محمد عاجز: سنہ ۱۸۴۶ء میں حیدرآباد میں متولد ھوئے اور سنہ ۱۹۱۸ء میں انتقال کیا۔ زندگی بھر درس و تدریس میں مشغول رھے۔ شاعر بھی تھے اور انشا پرداز بھی۔ نظم میں ایک دیوان اور ایک مثنوی ان کی یادگار ھیں اور نثر میں "داستان گلشن بہار"، جسے ایک شاھکار کی حیثیت حاصل ھے۔

۱۱- **عدایت‌الله مشتاق:** سنہ ۱۸۵۸ء میں بلوچستان میں متولد ہوئے۔ بعد میں سندھ میں آئے اور مٹیاری میں سکونت پذیر ہو گئے۔ آخری ایام ھالا میں بسر کئے۔ عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ سندھی میں خطبے، اور انشا پر "ھدایت الانشا" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، جو سندھی انشاپردازی میں ایک بے مثال کتاب ھے۔

۱۲- **شمس‌العلما مرزا قلیچ بیگ:** سندھی زبان اور ادب کے عظیم محسن اور نظم و نثر کی لاتعداد کتابوں کے مصنف جناب مرزا قلیچ بیگ ولد مرزا فریدون بیگ حیدرآباد کے قریب ٹنڈو ٹھوڑھو میں سنہ ۱۸۵۳ء میں متولد ھوئے۔ بی۔ اے۔ تک تعلیم حاصل کی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ سے سبکدوش ھوئے اور سنہ ۱۹۲۹ء میں انتقال کیا۔

ڈرامہ نویسی میں انہیں اولیت کا شرف حاصل ھے۔ سندھی زبان میں ان کا پہلا ڈرامہ "لیلیٰ مجنوں" ایک مکمل ڈرامہ ھے، جو انہوں نے سنہ ۱۸۸۰ء میں لکھا۔ اس کے بعد متعدد ڈرامے لکھے اور متعدد ڈراموں کا سندھی میں ترجمہ کیا۔ متعدد ناولیں بھی لکھیں اور دیگر زبانوں سے بھی سندھی میں منتقل کیں۔ ان کی طبع زاد ناول "زینت" سندھی ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ھے۔ مرزا صاحب نے بیشمار افسانے اور مضامین بھی لکھے۔ اس کے علاوہ تاریخ، فلسفہ، نفسیات، طبیعیات، حیوانات اور زراعت وغیرہ پر بھی متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ سندھی کے معیاری شعرا کا کلام مرتب کیا اور ان کے سوانح حیات لکھے۔ مثلاً شاہ لطیف کا رسالہ، شاہ کریم کا کلام، سید ثابت علی شاہ کے مرثیے، حفیظ تیونہ کا موسل رانو، علم لغت میں ان کی تصانیف "لغات لطیفی" اور لغات قدیمی" بڑی اھمیت کی حامل ھیں۔ نثر کے

علاوہ نظم میں بھی متعدد تصنیفات کے صاحب ہیں اور ہر صنف پر طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً غزل، نظم، رباعی اور کافی وغیرہ۔

۱۴- امام بخش خادم: حاجی امام بخش خادم سنہ ۱۸۵۸ء کے قریب شکارپور کے بدوی خاندان میں متولد ہوئے۔ والد کا نام محمد بچل تھا۔ فائینل کا امتحان پاس کرنے کے بعد ماسٹر ہوئے اور ہیڈ ماسٹر ہو کر ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں انتقال کیا۔ سندھ کے مشہور شاعر اور ادیب لطف اللہ بدوی ان کے فرزند تھے۔ خادم شاعر بھی تھے اور نثر نویس بھی۔ مشہور کہانیوں "چہار درویش"، "حاطم طائی" اور "الف لیلہ" واللیل" کو اردو سے سندھی میں منتقل کیا اور ان کو چھپوایا۔

۱۵- حکیم فتح محمد سہوانی: حکیم فتح محمد سہون کے عباسی خاندان میں سنہ ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۰ء) میں تولد ہوئے۔ والد کا نام حکیم غلام محی الدین تھا۔ سنہ ۱۳۲۱ھ میں فارسی اور عربی کی تعلیم سے فارغ ہوئے اور سہون میں طبابت شروع کی۔ کچھ عرصہ کے بعد سندھ مدرسہ کراچی میں فارسی اور عربی کے معلم ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں کراچی سے حیدرآباد چلے گئے اور وہیں اپنے بھائی حکیم عبدالقیوم کے ساتھ مل کر طبابت کرنے لگے۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر کراچی واپس گئے اور وہیں مطب قائم کیا۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں انتقال کیا۔ حکیم صاحب نے مختلف قومی، سیاسی، مذہبی اور ادبی تحریکوں میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ تحریک خلافت میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ سندھی زبان میں متعدد کتابیں لکھیں، جن میں سے "احوال لعل شہباز قلندر"، "حیات النبی"، "آفتاب ادب"، "کمال و زوال"، "میروں کی صاحبی" اور "ابوالفضل اور فیضی"

قابل ذکر ہیں۔ بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ نظم میں خاص طور پر کمال حاصل تھا۔

۱۶۔ ڈاکٹر ہوتچند مولچند گربخشانی: سندھ کے بلند پایہ نثرنویس اور شاہ لطیف کے رسالہ کے عظیم شارح اور مرتب، ڈاکٹر ہوتچند مولچند گربخشانی سنہ ۱۸۸۴ء میں حیدرآباد میں تولد ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں ایم۔ اے۔ کرنے کے بعد ولسن کالج بمبئی میں فارسی کے پروفیسر ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں ڈی۔ جے۔ سندھ کالج کراچی میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوگئے اور ترقی کرکے پرنسپل کے عہدہ تک پہنچے۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں لندن گئے اور لندن یونیورسٹی سے "انگریزی شاعری میں تصوف" کے عنوان پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۱۔ فروری سنہ ۱۹۴۷ء کو انتقال کیا۔ اس وقت ڈی۔ جے۔ سندھ کالج کے پرنسپل تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے شاہ لطیف کا رسالہ محققانہ انداز میں مرتب کرکے غیرفانی شہرت اور اہمیت حاصل کی۔ آن کی طرح آج تک اس رسالہ کو کوئی بھی مرتب نہیں کر سکا۔ رسالہ کی پہلی جلد سنہ ۱۹۳۰ء میں، دوسری سنہ ۱۹۳۲ء میں اور تیسری سنہ ۱۹۳۴ء میں شایع ہوئی، لیکن افسوس کہ چوتھی جلد اشاعت پذیر نہیں ہو سکی۔ رسالہ کا متن بڑی تحقیق و تدقیق اور غور و فکر کے بعد پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں الفاظ کے اشتقاق، معنی اور شرح بھی درج کی گئی ہے۔ شروع میں شاہ لطیف کے سوانح حیات اور ان کے شاعرانہ محاسن پر ایک جامع مقدمہ سپرد قلم کیا گیا ہے، جو بعد میں اپنی علمی اور ادبی اہمیت کے پیش نظر "مقدمۂ لطیفی" کے عنوان سے علیحدہ کتابی صورت میں شایع ہوا۔ ہر سُر کی ابتدا میں

وہ کہانی بھی پیش کی گئی ہے، جس پر اس سُر کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ بعد میں وہ رومانی کہانیاں "روح رہان" (رہان — آنسیت) کے نام سے کتابی صررت میں بھی شایع کی گئیں۔

رسالہ کے علاوہ بزرگان لنواری کا تذکرہ "لنواری کے لعل" کے نام سے لکھا اور تاریخی ناول "نورجہاں" بھی تالیف کی۔ اس ناول میں ان کا اسلوب بیان بڑا جاذب اور عالمانہ ہے اور ساتھہ ہی ساتھہ ناول کی فنی خوبیوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔

جیٹھمل پرسرام گلراجانی: جیٹھمل پرسرام حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۹۴۸ء میں بمبئی میں انتقال کیا۔ ان پر تصوف اور تھیاسافی کا گہرا اثر تھا۔ سندھی ادب کی ترقی اور اصلاح کے لئے بڑی کوشش کی۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں لالچند امرڈنومل کے ساتھہ مل کر "سندھی ساھت سوسائٹی" قائم کی اور اس کی طرف سے متعدد کتابیں شایع کیں۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں ایک ماھنامہ "روح رہان" جاری کیا، جس نے ۱۹۴۴ء تک سندھی ادب کی خدمت کی۔

شاہ کے رسالہ پر تنقید لکھہ کر ایک کتابچہ کی صورت میں شایع کی، جس میں بتایا ہے کہ ڈاکٹر گربخشانی نے رسالہ کو جامعیت کے ساتھہ مرتب کرنے کے بجائے شاہ کے متعدد ابیات کو خارج کردیا ہے۔ اس کے علاوہ تصوف، مذھب اور دیگر موضوعات پر بتیس کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے حسب ذیل قابل ذکر ھیں:

(۱) پیغمبر اسلام (۲) فلاسافی کیا ہے (۳) سچل سرمست (۴) شاہ لطیف کی کہانیاں (دو حصے) (۵) شاہ کی کہانیوں کا مفہوم (۶) طوفان (ترجمہ) (۷) ھیملٹ (ترجمہ) (۸) فاؤسٹ (ترجمہ) (۹) مونا وانا (ترجمہ) (۱۰) سوشلزم وغیرہ۔

۱۸- **مولانا دین محمد وفائی:** مولانا دین محمد ولد خلیفہ گل محمد سنہ ۱۸۹۳ء میں قصبۂ نبی آباد تحصیل گڑھی یاسین (ضلع سکھر) میں متولد ہوئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد کچھ عرصہ تک سندھ مدرسہ کراچی میں معلم رہے۔ بعد میں صحافتی زندگی اختیار کرلی۔ سندھ کے سیاسی مسائل پر اور مسلمانان سندھ کی معاشرتی اصلاح کے سلسلہ میں دل کھول کر لکھا۔ شروع میں "صحیفۂ قادریہ" اور ماہنامہ "الکاشف" میں کام کیا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں روزنامہ "الوحید" جاری ہوا تو اس کے سب ایڈیٹر ہوئے۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں کچھ عرصہ کے لئے "الحزب" (سکھر) کے ایڈیٹر بھی رہے۔ لیکن یہ اخبار زیادہ عرصہ تک جاری نہیں رہ سکا، اس لئے دوبارہ الوحید میں چلے گئے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں ماہنامہ "توحید" جاری کیا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں جب سندھ، بمبئی سے علیحدہ ہوا، تو الوحید کا ایک ضخیم خصوصی نمبر شایع کیا جو سندھ کی تاریخ کے سلسلہ میں اپنے اہم ترین مضامین کے باعث ایک مستند تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد ادبی اور تاریخی کتابیں تصنیف کیں، مثلاً "لطف اللطیف"، "شاہ لطیف کے رسالہ کا مطالعہ"، "تذکرۂ مشاہیر سندھ" (غیر مطبوعہ)، "الہام الباری ترجمۂ صحیح بخاری"، "توحید الاسلام" (ترجمۂ تقویۃ الایمان) اور "تاریخ محمد مصطفیٰ" وغیرہ۔

۱۹- **غلام محمد شاہوانی:** سنہ ۱۹۱۲ء میں تولد ہوئے اور سنہ ۱۹۵۰ء میں انتقال کیا۔ ان کا شمار نور محمد ہائی اسکول اور گورنمنٹ ہائی اسکول حیدرآباد کے کامیاب ہیڈ ماسٹروں میں ہوتا تھا۔ سندھی کے اچھے نثر نویس اور نقاد تھے۔ یہ سندھی کے پہلے ادیب تھے، جنھوں نے مغربی تنقید کے اصولوں پر سندھی زبان میں تنقیدی

اصول کے متعلق ایک مفید کتاب دو جلدوں میں تصنیف کی۔ ان کا دوسرا شاندار کارنامہ یہ ہے کہ شاہ لطیف کا رسالہ بڑی محنت اور کاوش سے مرتب کیا۔ اس کے علاوہ متعدد کتابیں بھی مختلف موضوعات پر تصنیف کیں، مثلاً "علمی خزانہ" (دو حصے)، "ادبی خزانہ" (دو حصے)، "گلشن بہار" اور "فتوح الغیب" وغیرہ۔

۲۰- احمد غلام علی چاگلا: سنہ ۱۹۰۲ء میں کراچی میں متولد ہوئے۔ والد کا نام غلام علی تھا۔ موسیقی کے بڑے ماہر تھے۔ پاکستان کے قومی ترانہ کی موسیقی انہوں نے مرتب کی تھی۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں انتقال کیا۔ سندھی کے اچھے نثر نویس تھے۔ ڈرامہ کے ساتھ خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ متعدد ڈرامے لکھے اور ترجمہ کئے۔ ان کے ڈراموں میں سے "بھوت" (ترجمہ)، "خونی"، "جو تقدیر"، "دیش کا دشمن" اور "گڑیا کا گھر" قابل ذکر ہیں۔

۲۱- کاکو بھیرومل: سندھ کے بڑے محقق اور ادیب کاکو بھیرومل مہرچند آڈوانی سنہ ۱۸۷۶ء کے قریب حیدرآباد میں تولد ہوئے۔ شروع میں کچھ عرصہ تک محکمۂ اکسائز میں ملازمت کی۔ پھر سنہ ۱۹۲۴ء میں ڈی۔ جے۔ سندھ کالج میں سندھی کے لکچرار ہوئے۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں بمبئی میں انتقال کیا۔ کاکو بھیرومل نے سندھی ادب کی جو خدمت کی ہے، وہ سندھی ادب کے ساتھ دلچسپی رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ سندھی ادب کے مخلص خادم اور شیدائی تھے۔ سندھی زبان کی اصل و نسل اور بیخ و بنیاد کی بڑی تحقیق و جستجو کی اور بعد میں "سندھی زبان کی تاریخ" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ "لطیفی سیر" نامی کتاب لکھ کر ان مقامات کا تعارف کرایا، جن کا ذکر شاہ لطیف کے رسالہ میں ہے۔ بڑی تحقیق،

مطالعہ اور عرق ریزی کے بعد آریہ دور کی تاریخ، ثقافت اور رہن سہن پر "قدیم سندھ" کے نام سے ایک بے مثال کتاب تصنیف کی۔

سندھی لغت کے سلسلے میں ان کی ایک چھوٹی سی کتاب "غریب اللغات" اور "ضرب الامثال کی بنیاد" کو سندھی ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ سندھی زبان کی گرامر بھی لکھی۔ اس کے علاوہ بھی متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ مثلاً:

"رسم و رواج کی بنیاد"، "سندھ کے ہندوؤں کی تاریخ"، "سوڈھن جی صاحبی" (سوڈھوں کی حکومت)، "گلزار نثر"، "بہار نثر"، "جوھر نثر"، "منتخب کلام"، نوبہار"، "آزادی کی شائق" (ڈرامہ)، "پنگتی مقدمہ" (ڈرامہ)، "حرص کا شکار (ڈرامہ)، "پریم مہاتما" (ناول)، "وسریل نعمت" (بھولی ہوئی نعمت — ناول تین حصے) وغیرہ۔

کاکو بھیرومل کی تحریریں نہایت ھی پیاری اور مٹھاس سے بھری ہوئی ھیں۔ خالص سندھی کے الفاظ استعمال کئے ھیں، جو بڑے دلکش اور لطیف ھیں۔

۲۲- لعل چند امرڈنومل جگتیانی: لعل چند نے سندھی زبان اور ادب کی جو خدمت کی ھے، وہ سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ھے۔ انہیں سندھ کے ساتھ جو بے پناہ محبت تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ھے کہ بمبئی میں نزع کے عالم میں وصیت کر گئے کہ ان کے جسد کی راکھ سندھ لے جا کر دریائے سندھ کے سپرد کی جائے۔ ان کا انتقال سنہ ۱۹۵۴ء میں ہوا اور ان کی خاکستر سندھ میں لا کر دریائے سندھ میں بہائی گئی۔ ان پر تصوف کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ وہ طبعاً بھی اور عقیدتاً بھی صلح کل تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ انہوں نے حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ

وسلم کے متعلق ایک کتاب لکھی، جس پر ان کے احباب از راہ مذاق انہیں لعل چند کے بجائے لعل محمد کہکر پکارتے تھے۔

انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک ماسٹر کی حیثیت سے کیا، اور ساتھ ھی ساتھ سیاسی اور سماجی کاموں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ سندھی زبان کی بڑی خدمت کی اور ادب کے ہر شعبہ پر شاھکار تصنیفات یادگار چھوڑیں۔ ان کی طبعزاد ناولوں میں سے "چوتھ کا چاند"، "سچائی پر سے قربان" اور "کشنی کے کشٹ" قابل ذکر ھیں۔ مترجم ناولوں اور ڈراموں میں سے "سون ورنیوں دلیوں" (سونے جیسے دل)، "سیٹ کی ویٹ" (سمدھی یا دشمن)، "نقد رقم" اور "عمر مارئی" بڑی اھمیت کے حامل ھیں۔

مضمون نویسی میں ان کی کتاب "گلن مٹ" (مٹھی بھر پھول) اور "سدا گلاب" قابل ذکر ھیں۔ شاعری کے موضوع پر "شاھانو شاہ"، "سچل سونہارو" اور "بیرنگی باغ جو گل سندھی" تشریحی تنقید کے بہترین نمونے ھیں۔

خلیق مورائی: مولوی عبدالخالق خلیق مورائی، مورو ضلع نوابشاہ میں سنہ ۱۸۵۳ء میں متولد ھوئے۔ میمن قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ آریہ سماج کے خلاف بڑی سرگرمی اور جوش و خروش سے قلمی جہاد کیا۔ اس سلسلے میں جو کتابیں تصنیف کیں، ان میں سے "شدھی کا سانگ"، "ستی کی ستیا" اور "ویدوں کی حقیقت" قابل ذکر ھیں۔ اسلامی تاریخ پر بھی متعدد کتابیں لکھیں، جن میں سے "فاتح سندھ"، "آخری رسول"، "خلافت عثمانیہ" اور "تاریخ تعمیر کعبہ" بڑی اھمیت رکھتی ھیں۔ عربوں کے سندھ فتح کرنے کے سلسلہ میں "سندری" کے نام سے ایک ناول لکھی، جو فن خواہ اسلوب کے لحاظ سے سندھی

ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسلامی تعلیمات کے موضوع پر بھی چند کتابیں تصنیف کیں۔ مثلاً "اسلام اور علم" اور "اسلام اور تصوف" وغیرہ۔

۲۴۔ عبدالرزاق میمن : سنہ ۱۸۹۸ء میں خیرپور میرس میں متولد ہوئے۔ محکمۂ تعلیم کے سربراہ تھے۔ سندھی میں چند کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے ان کی ناول "جہاں آرا" کو غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

۲۵۔ محمد صدیق میمن : سنہ ۱۸۹۰ء میں متولد ہوئے اور سنہ ۱۹۵۸ء میں انتقال کیا۔ محکمۂ تعلیم کے ساتھ وابستہ رہے۔ ماہر تعلیم ہونے کے علاوہ بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ "سندھ مسلم ادبی سوسائٹی" قائم کی، جس نے متعدد معیاری کتابیں شایع کیں۔ خود بھی چند کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے "سندھی ادبی تاریخ" (دو جلد) کو ادبی تاریخ کی پہلی اور بنیادی تصنیف سمجھا جاتا ہے۔

۲۶۔ محمد صدیق مسافر : ولادت سنہ ۱۸۷۹ء میں ہوئی اور وفات سنہ ۱۹۵۸ء میں۔ سندھی پرائمری ماسٹر سے ترقی کر کے ٹریننگ کالج حیدرآباد میں استاد ہوئے۔ محمد صدیق میمن کے دست راست تھے۔ بلند پایہ ادیب اور اچھے شاعر تھے۔ نظم اور نثر میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ان کا مرتب کیا ہوا "دیوان فاضل" ترتیب اور مقدمہ کے اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

۲۷۔ صاحب سنگھ چندا سنگھ شاہانی : سنہ ۱۸۶۸ء میں تولد ہوئے۔ یہ پہلے سندھی تھے، جنھوں نے بمبئی یونیورسٹی سے اعزازی ڈگری حاصل کی۔ ولسن کالج بمبئی میں فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ بعد میں ڈی۔ جے۔ سندھ کالج کراچی میں اسسٹنٹ پروفیسر اور

پھر انگریزی کے پروفیسر ہوئے۔ اسی کالج میں سنہ ۱۹۱۷ء سے سنہ ۱۹۲۷ء تک پرنسپل رہے۔ اچھے مضمون نویس اور ناول نگار تھے۔ مضامین خواہ ناولوں میں تھر کی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ ان کی حسب ذیل ناولیں قابل ذکر ہیں:۔

بلو کھوکھر، ستاروں کا ابھیاس اور سیل پری کی سوڈھی۔

۲۸۔ مرزا نادربیگ: شمس العلما مرزا قلیچ بیگ کے فرزند ارجمند تھے۔ ابتدائی دور میں اچھے افسانہ نگار تھے۔ ان کے افسانوں پر سدرشن کا اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں ہندو معاشرہ کی جھلک ہے۔ ان کے افسانے ماہنامہ "سندھو" میں شایع ہوتے تھے۔ "اچھوت"، "مس رستم جی"، "ماں کا قہر"، "موھنی"، "عینک کی آواز" اور "بھاوج" اچھے افسانے ہیں۔

۲۹۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ: شمس العلماء علامہ ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ ضلع دادو کے قصبہ ٹلٹی میں سنہ ۱۸۹۶ء میں تولد ہوئے۔ غریب گھرانے کے فرد ہونے کے باوجود اپنی محنت اور کوشش سے پڑھتے رہے۔ حصول تعلیم کے دوران مزدوری اور ملازمت کرکے اپنی ضرورتیں پوری کیں اور اپنے والد کی خدمت بھی کرتے رہے۔ بمبئی سے ایم۔اے۔ کرنے کے بعد کیمبرج یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی۔ ہمیشہ محکمۂ تعلیم کے ساتھ وابستہ رہے۔ چرچ مشن ھائی اسکول میں استاد، سندھ مدرسہ کے پرنسپل، ڈی۔جے۔ سندھ کالج کے فیلو، اسماعیلی کالج اندھیری (بمبئی) میں عربی کے پروفیسر اور سندھ کے ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن رہے۔ ملازمت کے آخری ایام میں مغربی پاکستان پبلک سروس کمیشن کے ممبر بھی رہے۔ سندھی ادبی بورڈ کے بانیوں میں سے تھے۔ سنہ ۱۹۵۸ء میں انتقال کیا۔

عربی اور فارسی کے بڑے عالم اور سندھی ادب کے محقق اور نقاد تھے۔ طالب العلمی کے زمانہ میں اپنے استاد ڈاکٹر گربخشانی کی شاہ لطیف کے رسالہ کو مرتب کرنے میں بڑی مدد کی۔ ان کے دیگر تحقیقی شاہکار حسب ذیل ہیں:۔

"شاہ کریم کا کلام"، "ابیات سندھی"، "کلام گرھوڑی"، "چچ نامہ" (فارسی)، "تاریخ معصومی" (فارسی) (ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں کتابوں کی تصحیح کرکے ان کے صحیح نسخے چھپوائے)، "میری آتم کہانی"، "گل خنداں" (ترتیب)، "مقدمۂ ابن خلدون" کا انگریزی میں ترجمہ (غیر مطبوعہ)، "سندھی شعر"، "منہاج العاشقین" (ترجمہ).

آخری ایام میں شاہ لطیف کا رسالہ مرتب کر رہے تھے۔ متن کی تصحیح اور ترتیب میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا، لیکن زندگی نے وفا نہیں کی۔ اب باقیماندہ کام مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی مکمل کر رہے ہیں۔

۳۰۔ نارائنداس میوارام بھنبھانی۔ قیام پاکستان سے قبل ڈی۔ جے۔ سندھ کالج میں انگریزی کے لکچرار تھے، لیکن سندھی علم و ادب کے ساتھ بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ ناول نویس تھے۔ طبع زاد ناولیں بھی لکھیں اور اچھی ناولوں کے ترجمے بھی کئے۔ قلم ھاتھ میں لیتے وقت ہمیشہ سندھ کے ماحول اور سندھی کی عوامی زندگی کو پیش نظر رکھتے تھے۔ ان کی ناول "غریبوں کا ورثہ" ایک شاھکار ہے، جس میں اھل سندھ کی عام زندگی کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ان کی دوسری ناولیں "مالن" اور "ودھوا" بھی بہترین ناولوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

۳۱۔ میلارام منگترائے واسوانی: حیدرآباد کے ھندو عامل تھے۔ تقسیم بنگال کے بعد سندھی ادب کے افق پر نمودار ہوئے۔ ان کی

ادبی خدمات تحریک ھوم رول کے بعد شروع ھوئیں۔ "سندر ساھتیہ" کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی، جس کی طرف سے بارہ سال کے عرصہ میں بیشمار کتابیں شایع ھوئیں، اور سندھی ادب میں قابل قدر اضافہ ھوا۔ ان کی خصوصیت یہ ھے کہ انہوں نے سندھی افسانہ کے فنی اصول متعین کئے اور سندھی افسانہ کو مقبول عام بنایا۔ ان کی لاتعداد تصنیفات میں سے حسب ذیل قابل ذکر ھیں:-

"پارسی"، "پدمنی"، "سماج ایک بلوہ"، "سشیلا"، "چوڈس چاندنی" (چودھویں کی چاندنی)، "گلزار چمن"، "گلا پھوھارو" (فوارہ)، "پنگتی کہانیاں"، "پھلواری" اور "گلابی مکھڑیاں"۔

سندھی زبان کی ناولوں میں چار ناولیں شاھکار کی حیثیت رکھتی ھیں: مرزا قلیچ بیگ کی "زینت"، ڈاکٹر گربخشانی کی "نورجہاں"، بھنبھانی کی "غریبوں کا ورثہ" اور واسوانی کی "سشیلا"۔

۳۲- خانچند وریانی: آخری دور کے معماروں میں سے تھے۔ سندھی ڈرامہ کے سلسلہ میں شاندار کام کیا۔ طبعزاد ڈرامے بھی لکھے اور اچھے ڈراموں کے ترجمے بھی کئے۔ اپنے ڈراموں میں سندھ کی تہذیب اور رھن سہن کی ترجمانی کی ھے اور سماجی عدم مساوات کا ذکر کرتے ھوئے زمیندارانہ ذھنیت اور ان کے مظالم کی مذمت کی ھے۔ ان کے طبعزاد ڈراموں میں سے "گلاب کا پھول"، "موتیئے کی مکھڑی"، "زمینداری ظلم"، "زمانے کی لہر"، "بھوک کا شکار"، "مایا کا غرور"، "زندہ پر زندہ یا دکھی دیوی" اور "پدمنی" قابل ذکر ھیں۔ مترجم ڈراموں میں سے "دیش پر سے قربان"، "ملک کے مدبر"، "انسان یا شیطان" اور "غلط فہمی" قابل تعریف ھیں۔

۳۳- عثمان علی انصاری: شکارپور کے انصاری خاندان میں سے تھے۔ محکمۂ تعلیم کے ساتھ وابستہ رھے اور ڈاکٹر دائودپوتہ کے

بعد ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن اِن سندھ کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ سنہ ۱۹۶۲ء میں انتقال کیا۔ اچھے نثر نویس تھے۔ افسانے بھی لکھے ھیں اور مضامین بھی۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "پنج گنج" کے نام سے سنہ ۱۹۳۷ء میں شایع ھوا، جس میں پانچ افسانے ھیں اور ان میں سے "ململ کا پیرھن" بہترین افسانہ ھے۔

۳۴۔ اللہ بچایو سموں : سنہ ۱۹۱۲ء میں ضلع کراچی کے قصبۂ ملیر میں تولد ھوئے۔ اچھے مضمون نگار تھے۔ سندھ کے پہاڑی علاقہ "کوھستان" کی عوامی زندگی اور عوامی ادب سے متعلق "سیر کوھستان" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، جو وسیع معلومات اور اسلوب بیان کے لحاظ سے ایک شاھکار تصنیف ھے۔ لاڑ (جنوبی سندھ) کے متعلق بھی "سیر لاڑ" کے نام سے ایک کتاب لکھی، لیکن جو مقبولیت اور اھمیت "سیر کوھستان" نے حاصل کی، وہ "سیر لاڑ" کو حاصل نہیں ھو سکی۔

۳۵۔ عطاحسین شاہ موسوی : روھڑی کے موسوی سادات میں سے تھے۔ بڑے ماھر تعلیم اور ادیب تھے۔ محکمۂ تعلیم سے وابستہ رھے اور انسپیکٹر آف اسکولس کے عہدہ سے سبکدوش ھوئے۔ سندھی زبان کے بلند پایہ مضمون نگاروں میں سے تھے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "کچ کوڈیوں" (کچی کوڑیاں) متعدد بار شایع ھو چکا ھے۔ سنہ ۱۹۶۶ء میں انتقال کیا (۱)۔

۳۶۔ عبدالحسین شاہ موسوی : سید عطاحسین شاہ موسوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ وہ بھی اسی عہدہ سے سبکدوش ھوئے۔ لوک ادب پر دو کتابیں "سگندھ" اور "سرھاں" (خوشبو) تصنیف کیں۔ اس کے علاوہ "دیوان بیدل" اور "دیوان بیکس" بھی مرتب کئے۔ سنہ ۱۹۶۷ء میں انتقال کیا۔

---

(۱) سال وفات "حریفاں بادھا خوردند و رفتند" ھے (مترجم)۔

فصل سوم

افسانہ، ناول اور ڈرامہ

انگریزوں کے آنے کے بعد سندھی دانوں نے جدید تعلیم حاصل کی اور انگریزی ادب کے ذریعہ ادب کی جدید صنفوں سے آگاہ ہوئے، مثلاً ناول، ڈرامہ، افسانہ، مضمون اور تنقید وغیرہ۔ شروع میں ابتدائی قسم کی چیزیں لکھی گئیں اور انگریزی سے ترجمے کئے گئے، لیکن آگے چل کر ہر صنف پر شہپارے شایع ہونے لگے۔ ان صنفوں نے سندھی ادب میں ترقی کی جو منزلیں طے کی ہیں، انہیں تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ذیل میں ان ادوار کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ابتدائی دور میں سندھی ادیبوں نے معاشرتی اصلاح کا مقصد سامنے رکھ کر لکھنا شروع کیا۔ اس سلسلے میں پہلے ہندی کے قصے کہانیاں اور انگریزی کی ناولوں، ڈراموں اور افسانوں کے ترجمے کئے، ترجمہ کرتے وقت انہوں نے ہندی اور انگریزی افسانوں، ناولوں اور ڈراموں کے پلاٹوں کو سندھی ماحول کے مطابق سنوار کر پیش کیا، اور ترجمہ کے ساتھ ساتھ طبعزاد افسانے، ناولیں اور ڈرامے بھی لکھے۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد عوام میں نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوئے۔ اس بیداری نے عوام میں سیاسی شعور پیدا کیا اور انہیں جمہوریت اور سیاسی آزادی کی اہمیت ذہن نشیں کرائی، جس کی بنا پر سندھ اور ہند میں سنہ ۱۹۲۳ء کے قریب آزادی

کی تحریک زور پکڑ گئی۔ سندھی اہل قلم بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے اور معاشرہ کی اصلاح کے ساتھ ساتھ سیاسی مقصد کو بھی سامنے رکھ کر لکھنا شروع کیا۔ اس دور میں جو ناولیں، ڈرامے، افسانے اور مضامین سپرد قلم کئے گئے، ان میں حب الوطنی کا جذبہ، خالص ملکی ماحول، ملکی روایات اور تحریک آزادی کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ فنی اعتبار سے اس دور کی تحریروں میں بڑی پختگی پیدا ہوئی۔ تاریخی ناولیں اور ڈرامے بھی اسی رجحان کا نتیجہ ہیں۔ ملکی ناول نگاروں نے تاریخی کارنامے ناولوں کی صورت میں پیش کر کے پڑھنے والوں میں قومی جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس دور کے لکھنے والوں میں سے مرزا قلیچ بیگ، خلیق مورائی، لعل چند امرڈنو مل، جیٹھمل پرسرام، کاکو بھیرو مل، نرملداس، پرمانند تیجو مل، محمد صدیق مسافر، لیلارام ولایت رائے اور جھمٹ مل بھاونانی کے اسما قابل ذکر ہیں۔

دوسری جنگ عظیم نے ادب میں ایک نیا موڑ پیدا کیا، سندھی ادیب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ ادب میں ترقی پسند تحریک نے اسی دور میں ترقی کی۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں "ترقی پسند مصنفین" کے نام سے ایک جماعت قائم ہوئی، جس کے سیکریٹری گوبند مالی تھے، اور نارائن شیام، شیخ عبدالرزاق راز، لچھمن راجپال، رام پنجوانی (جونیئر)، ارجن شاد، سگن آھوجا، شیخ عبدالستار، شیخ ایاز، سنتولعل، سوبھو گیانچندانی اور گوبند مالی اسی دور کی پیداوار ہیں۔ ہندو ادیبوں نے افسانہ پر زیادہ زور دیا۔ بعض مسلمان ادیبوں مثلاً شیخ ایاز، شیخ عبدالرزاق اور شیخ عبدالستار نے ترقی پسندانہ نوعیت کے چند افسانے لکھے۔ افسانوں میں معاشرہ پر طنز، مروجہ اقدار سے

بغاوت، کسان اور مزدور سے اظہار ہمدردی اور زمینداروں کے ظالمانہ کردار کو نمایاں کر کے پیش کیا جاتا۔

اس زمانے میں تحریک آزادی زوروں پر تھی۔ اس لئے اس دور کے متعدد افسانوں میں آزادی کی تحریک کا عکس واضح طور پر جھلکتا نظر آتا ہے۔ مثلاً آتم کے افسانے "شکست" (۱۹۴۴ء)، "آخر کب تک" (۱۹۴۵ء) اور "ترقی کی راہ پر"، حشو کیول رامانی کا "پدم" (۱۹۴۵)، لچھمن راجپال کا "قومی سپاہی" (۱۹۴۷ء)، کیرت بابانی کا "آزادی کی پکار"، ایسر کلیانی کا "عجیب بگ" (۱۹۴۷ء)، رام لعل کا "سرحد" اور "دیوانی" (۱۹۴۷ء)، شیخ ایاز کا "سفید وحشی" لچھمن آھوجا کا "پاگل" (۱۹۴۷ء) اور آنند کا "پھڑک"۔

اس دور میں ادب میں فحاشی اور عریانی کی بھی ابتدائی ہوئی۔ افسانوں میں خصوصیت کے ساتھ فحاشی کا مظاھرہ کیا گیا۔ اس قسم کا پہلا افسانہ شیخ عبدالستار نے لکھا۔ غرضیکہ اس دور میں جہاں سیاسی، معاشرتی اور معاشی مسائل کو سامنے رکھ کر لکھا گیا، وھاں جنسیات کو بھی ایک سماجی مسئلہ کی طرح ادب کا موضوع بنایا گیا۔ نتیجتاً یہ رجحان روز افزوں ترقی کرنے لگا۔ افسانہ نے اس دور میں خوب ترقی کی اور افسانہ نگاروں نے افسانہ کے فنی تقاضوں کو پورا کرنے کی بھی بھرپور کوشش کی۔

مذکورہ بالا تینوں ادوار میں ادب کی مختلف صنفوں نے جو ترقی کی، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

افسانہ:

افسانہ کی ابتدائی صورت کہانی ہے۔ سندھی زبان میں پہلی کہانی غلام حسین قریشی نے "بھنبھے زمیندار کی کہانی" کے نام

سے لکھی، جو سنہ ۱۸۵۴ء میں کتابی صورت میں چھپی۔ اس کہانی میں حکومت وقت کی منشا کے مطابق اصلاحی پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس قسم کی دوسری کہانیاں ہیں سید میراں محمد شاہ اول کی "سدھا توری اور کدھا توری کی کہانی" (۱۸۵۵ء) اور "مفید الصبیان" (۱۸۶۱ء)۔ ان کہانیوں میں مافوق الفطرت کردار اور غیر فطری واقعات نہیں ہیں، بلکہ زندگی کے حقیقی واقعات اور کردار پیش کئے گئے ہیں، اور انہیں مقامی رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے باوجود ان کو مختصر افسانہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس قسم کی کہانیوں کے دیگر مجموعے بھی ہیں، مثلاً دیوان کیول رام سلامت رائے کی "سو کھڑی" (تحفہ) (۱۸۶۴ء)، اور "گل" (۱۸۷۱ء)، مرزا قلیچ بیگ کی "دلپسند قصے" (۱۸۹۰ء)، "شیطان کی نانی"، "کادمبری"، "دل کا آرام" اور "عجیب دوا"، "دل بہلانے والی کہانیاں"، "ہندوستان کی دیسی کہانیاں" اور "گلابی جوڑا" وغیرہ۔

سنہ ۱۸۹۰ء میں سادھو هیرانند نے "سرسوتی" کے نام سے ایک مخزن جاری کیا، جس میں سادھو هیرانند، بولچند کوڈومل اور دیگر اہل قلم کے مضامین اور کہانیاں شایع ہونے لگیں۔ اسی سال گرداس مل کرپالانی کی کہانیوں کی کتاب "بیتال پچیس" شایع ہوئی، جو ایک هندی کتاب سے ترجمہ کی گئی تھی۔ ان کہانیوں کا مقصد بھی تربیت اور تفریح تھا۔ اس قسم کی ایک اور کتاب "سبھا جو سینگار" سنہ ۱۸۹۴ء میں شایع ہوئی، جو هاسارام سوبھراج ڈاسوانی کی لکھی ہوئی تھی۔ سنہ ۱۸۹۵ء میں بھی ایسی ہی کہانیوں کی ایک کتاب "عجیب نکتے" کے نام سے شایع ہوئی جو روچیرام گجومل نے لکھی تھی۔ اس کے بعد کہانیوں کی کئی کتابیں شایع ہوئیں۔

اوپر جن کہانیوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کو افسانہ نہیں

کہا جا سکتا۔ افسانہ کی فنی تکنیک کے مطابق سندھی میں کہانیاں سنہ ۱۹۱۴ء کے بعد لکھی جانے لگیں، جبکہ لعل چند امرڈنو مل کی قائم کردہ "سندھی ساہتیہ سوسائٹی" کی طرف سے کتابی سلسلہ جاری کیا گیا۔ اس کتابی سلسلہ میں جو کہانیاں شایع ہوئیں، ان میں سماجی مسائل پر روشنی ڈالی گئی تھی اور معاشرتی برائیوں کی مذمت کی گئی تھی۔ اس قسم کی پہلی کہانی سنہ ۱۹۱۴ء میں لعل چند امرڈنو مل نے "حر مکھی جا" کے عنوان سے لکھی۔ کوڑو مل نے بنگالی افسانہ نگار بنکم چندر چیٹرجی کی سماجی کہانیوں "دو منڈلیاں" (۱۹۱۱ء) اور "اندرا اور رادھا رانی" کا ترجمہ کیا۔ پرمانند میوارام نے اس زمانے میں پہلی بار "لچھن ودھیک کین لدھو" کے عنوان سے طبعزاد کہانی لکھی، جس میں جہیز کے برے نتائج بیان کئے گئے تھے۔ اسی طرح سنہ ۱۹۲۴ء میں دوسری کہانی "ھیرے کی منڈی" (انگوٹھی) لکھی، جو خطوط کی صورت میں تھی۔ لعل چند امرڈنومل نے بھی معاشی اور معاشرتی زندگی کے متعلق کہانیاں لکھیں، جن میں سے ان کی طویل کہانی تھی "کشنی کا کشٹ" (۱۹۱۷ء) اور مختصر کہانی تھی "دکھوں کی ماری زندگی" (۱۹۲۵ء)۔ یہ دونوں کہانیاں بہت اچھی اور اس وقت کے لحاظ سے معیاری ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی دیگر کہانیاں بھی شایع ہوئیں۔

بھیرومل نے بھی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کی پہلی اخلاقی کہانی "پریم کا مہاتم" سنہ ۱۹۱۴ء میں شایع ہوئی۔ نرملداس فتح چند نے ہندو مسلم اتحاد کے خیال سے "سروجنی" کے نام سے ایک کہانی لکھی محمد صدیق مسافر نے تاریخی کہانیاں "زیب النسا" (۱۹۱۴ء) اور "چاند بیبی" (۱۹۲۰ء) لکھیں۔

سندھی زبان کے مشہور اہل قلم جیٹھمل پرسرام نے بھی کہانیاں لکھی ھیں۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں ان کی کہانیوں کا مجموعہ "چمڑا پوشی کی کہانیاں" کے نام سے شایع ھوا۔ ان کہانیوں میں سندھ کے سرمایہ داروں اور زمینداروں کے مظالم کا ذکر ھے۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں کماری دیاونتی ھولارام کی کہانی "قرضدار" اخبار "نوجیون" میں شایع ھوئی۔ یہ پہلی کہانی تھی جو ایک سندھی عورت نے لکھی تھی۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں ٹھلرام پنوانی کی کہانیوں کا مجموعہ "واندکائی جی وندر" (فرصت کی تفریح) کے نام سے شایع ھوا۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں لطف‌اللہ بدوی کی کہانیوں کا مجموعہ "دستۂ گل" شایع ھوا۔ اس کے بعد کئی دیگر اہل قلم حضرات کی طبعزاد خواہ مترجم کہانیاں شایع ھوئیں۔

افسانہ کا ابتدائی دور سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۹۲۵ء تک متعین کیا جا سکتا ھے، جس میں افسانہ نگاروں نے معاشی اور معاشرتی مسائل کی طرف توجہ منعطف کی اور معاشرہ کی اصلاح کے لیے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا، جو اخلاقی اقدار پر مبنی تھا۔ سنہ ۱۹۲۵ء سے سنہ ۱۹۴۰ء تک افسانہ کا دوسرا دور شروع ھوا، جس کی ابتدا میں متعدد ھندوستانی اور مغربی افسانوں کے ترجمے کئے گئے۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں ماھنامہ "سندھو" جاری ھوا، جو بولچند راجپال کی کوشش سے تقسیم سے قبل شکارپور، میاں جو گوٹھ، اور جیکب آباد سے شایع ھوتا رھا۔ آج کل احمدآباد سے سہ ماھی کی صورت میں شایع ھو رھا ھے۔ اس رسالہ نے جدید ادب کی، اور خاص طور پر مختصر افسانہ کی ترقی میں اھم کردار ادا کیا۔ اس رسالہ میں مرزا نادر بیگ، آسانند مامتورا، تاراچند پھٹیل (مجروح)، لطف‌اللہ بدوی،

گوبند مالہی اور دیگر افسانہ نگاروں کے معیاری افسانے شایع ہوئے۔ مرزا نادر بیگ نے زیادہ تر پارسی اور ہندو معاشرہ کی عکاسی کی اور طنز و مزاح کے پیرایہ میں معاشرہ کی کوتاھیاں بیان کی ھیں۔

آسانند مامتورا کی کہانیوں میں سندھ کا ھندو معاشرہ حقیقت پسندانہ نوع میں بیان کیا گیا ھے۔ امرلعل ھنگورانی اس دور کے بہترین افسانہ نگار تھے، جن کی کہانیاں ان کے اپنے رسالہ "پھلواری" میں شایع ہوتی تھیں۔ حقیقت نگاری کے اعتبار سے ان کی کہانی "ادو عبدالرحمان" بہترین کہانی سمجھی جاتی ھے، اور اس کا متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ھے۔ عثمان علی انصاری بھی اس دور کے بہترین افسانہ نگار تھے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "پنج گنج" سنہ ۱۹۳۷ء میں شایع ھوا، جس میں مسلم معاشرہ کی عکاسی حقیقت پسندانہ انداز میں کی گئی ھے۔ شیخ عبداللہ عبد مرحوم نے سندھی پرائمری استاد کی زندگی پر اچھے اور معیاری افسانے لکھے۔

افسانہ کا تیسرا دور سنہ ۱۹۴۰ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک ھے۔ اس دور میں ادب کی دوسری تمام اصناف سے زیادہ افسانے لکھے گئے، اور افسانہ کے جدید تقاضوں اور رجحانات کو ملحوظ رکھا گیا۔ اس دور کے افسانہ میں ترقی پسندی کا اثر نمایاں ھے اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اظہار نفرت کیا گیا ھے۔ اس دور میں افسانوں کا پہلا مجموعہ "سرد آھیں" کے نام سے سنہ ۱۹۴۲ء میں "نئی دنیا کتاب گھر شکارپور" کی طرف سے شایع ھوا، جس میں تمام افسانے گوبند پنجابی کے لکھے ھوئے ھیں، اور ان میں سرمایہ داری کے خلاف بغاوت کا اظہار ھے۔ تمام افسانوں میں مقصدیت پر اس قدر زور دیا گیا ھے کہ فن متاثر ھوتا ھوا نظر آتا ھے۔ اس کے بعد اسی ادارہ کی طرف سے سنہ ۱۹۴۴ء میں "ریگستانی پھول" کے نام سے افسانوں کا ایک اور

مجموعہ شایع ھوا، جس میں مختلف نوجوان افسانہ نگاروں کے افسانے درج تھے۔ اس مجموعہ میں عبدالستار شیخ کا افسانہ "رحیما" بے جوڑ شادی کے متعلق ھے۔ مقصد اچھا تھا، لیکن فحش اور عریاں مناظر دکھائے گئے تھے، اور جس سے سندھی افسانوں میں فحاشی اور عریانی کی ابتدا ھوئی۔ اس کے بعد کئی اچھے افسانے مختلف رسالوں اور مخزنوں میں شایع ھوئے۔ افسانوں کے مختلف مجموعے بھی شایع ھوئے۔

ناول

سندھی ادب میں ناول کی ابتدا ترجمہ سے ھوئی۔ سب سے اول سنہ ۱۸۷۰ء میں مشہور انگریز ادیب ڈاکٹر جانسن کی ناول "راسیلاس" کا ترجمہ سادھو نولرائے اور منشی ادھارام تھانور داس نے مل کر کیا۔ اس ناول میں انسانی زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ھے۔ سنہ ۱۸۹۱ء میں سادھو هیرانند نے سر والٹر اسکاٹ کی تاریخی ناول "طلسم" کا ترجمہ شروع کیا تھا، جو نامکمل رہ گیا۔ پھر سنہ ۱۹۲۷ء میں کاکو بھیرو مل نے اسے مکمل کر کے شایع کیا۔ یہ ناول صلیبی لڑائیوں کے متعلق ھے، جو یورپ کے تمام بادشاھوں نے مل کر غازی صلاح الدین کے خلاف لڑی تھیں۔

اس سے پیشتر متعدد قصے کہانیاں شایع ھو چکی تھیں۔ مثلاً ادھارام تھانور داس کی لکھی ھوئی "دودو چنیسر کی کہانی" (سنہ ۱۸۷۱ء) اور "رائے ڈیاچ کا قصہ" (سنہ ۱۸۶۱ء)۔ اس کے بعد بھی کہانیاں اور داستانیں شایع ھوتی رھیں، جن میں زیادہ تر شکارپور کے پوکرداس اور سکھر کے ماسٹر ھری سنگھہ کتب فروشوں نے چھپوا کر شایع کیں۔ جن اھل قلم نے اس قسم کے قصے کہانیاں لکھیں، ان میں سے حسب ذیل نام قابل ذکر ھیں:-

احمد خان جلبانی، حاجی امام بخش خادم، آخوند لطف اللہ، محمد صدیق مسافر اور میر عبدالحسین سانگی وغیرہ۔

قصے کہانیوں کے علاوہ جاسوسی ناولوں کے بھی بہت سے ترجمے شایع ہوئے۔ سنہ ۱۹۱۰ء کے قریب مکھی سیرومل ساگرانی کی بڑی طویل ناول "ھردلعزیز" عرف "چندر کانتا سنتتی" ۲۸ حصوں میں شایع ہوئی۔ اسی اھل قلم نے ۲۴ حصوں میں "بھوتناتھ کی جیونی" شایع کی۔ اس کے علاوہ "اسٹار آف منگریلا" کا ترجمہ "ستارۂ منگریلا" کے نام سے شایع ہوا، اور بھی متعدد ناولوں کے ترجمے شایع ہوئے۔ صحیح معنوں میں طبعزاد ناولیں سب سے اول شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ نے لکھیں۔ ان کی پہلی طبعزاد ناول "دلارام" سنہ ۱۸۸۸ء میں شایع ہوئی۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۹۰ء میں ان کی شاھکار سماجی اور اصلاحی ناول "زینت" شایع ہوئی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں "سناتن دھرم سبھا" کی طرف سے ماھنامہ "سناتن دھرم پرچارک پتر" جاری ہوا۔ جس میں بعض ناولیں بالاقساط شایع ہوئیں۔ یہ ناولیں اگرچہ سماجی اصلاح کے دعوے کے ساتھ شایع کی گئیں، لیکن ان میں عریاں مناظر بھی دکھائے گئے تھے۔ یہ ناولیں ھندی اور گجراتی ناولوں سے ترجمہ کی گئی تھیں۔

طبعزاد ناولوں کے سلسلہ میں مرزا قلیچ بیگ کے بعد لعل چند امرڈنومل کا نام آتا ھے۔ ان کی ناول "چوتھ کا چاند" یا "بھرم کی بھلائی" سنہ ۱۹۰۶ء میں ماھنامہ "سرسوتی" میں شایع ہوئی۔ ان کے بعد کاکو بھیرومل کی طبعزاد ناولیں شایع ہوئیں، "آنند سندریکا" سنہ ۱۹۱۰ء کے قریب اور "موھنی بائی" سنہ ۱۹۱۷ء میں۔ ان دونوں ناولوں میں ھندو معاشرہ کی خامیاں بیان کی گئی ھیں۔ سنہ ۱۹۱۵ء

میں کاکو بھیرو مل کی ایک اور ناول "وریل اور رحمت" شایع ہوئی، جس میں مسلم معاشرہ کی عکاسی کی گئی تھی۔ اس دور کی اہم ترین ناول ڈاکٹر گربخشانی کی تاریخی ناول "نورجہاں" تھی، جو سنہ ۱۹۱۵ء میں شایع ہوئی۔ اس ناول میں فنی تقاضوں کو پورے طور پر ملحوظ رکھا گیا تھا اور زبان بھی سلیس اور دلکش استعمال کی گئی تھی۔ ایک اور بہترین ناول خلیق مورائی کی "سندری" تھی، جو سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں شایع ہوئی۔ اس کے علاوہ ان کی اور ناولیں "ستی کی ستیا" اور "چھتر پتی" یکے بعد دیگرے شایع ہوئیں۔

مرزا قلیچ بیگ نے متعدد انگریزی ناولوں کے ترجمے کئے۔ ان کے علاوہ دیگر اہل قلم نے بھی انگریزی اور دیگر زبانوں سے متعدد ناولوں کا ترجمہ کیا۔ پروفیسر موٹومل گدوانی نے دو مشہور ناولوں کا خلاصہ لکھا، جو جیٹھمل پرسرام کی قائم کردہ "نئی سندھی لائبریری" کی طرف سے شایع ہوا۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں مشہور فرانسیسی ادیب وکٹر ہیوگو کی شہرۂ آفاق ناول Les Miserable کی تلخیص "دکھی انسان" کے نام سے، اور انگریزی ناول نگار لارڈ لٹن (سابق وائسرائے ہند) کی ناول "رینوبی" کی تلخیص شایع ہوئیں۔ جیٹھمل پرسرام نے شیکسپیئر کے دو ڈراموں کو ناول کی صورت دیکر شایع کیا۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں کاکو بھیرو مل کی ترجمہ کردہ ناول "گولن جا گوندر" (غلاموں کے دکھ درد) شایع ہوئی، جو غلاموں کی آزادی کے مسئلہ سے متعلق ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں صاحب سنگھ شاہانی کی شاہکار ناول "بلو کھوکھر" شایع ہوئی، جو تھامس ہارڈی کی انگریزی ناول "دی میئر آف کاسٹر برج" سے ماخوذ ہے۔ اس ناول کا فقط پلاٹ انگریزی سے لیا گیا ہے، باقی تمامتر سندھ کی دیہاتی زندگی کی عکاسی

کی گئی ھے۔ اسی مترجم نے اسی مصنف کی ایک اور ناول کا ترجمہ "نارن جو ابھیاس" کے نام سے شایع کیا، جس کے ذریعہ ھندو معاشرہ کو پیش کیا گیا ھے۔

بنگال کی بیداری سے متاثر ھوکر دیوان کوڑو مل چندن مل نے بنگالی ناول نگار بنکم چندر چٹرجی کی دو ناولوں "چندر مکھی" اور "روھنی" کے ترجمے کئے۔ دیو دت کندارام نے "آنند مٹھ" کا ترجمہ کیا، جس میں انگریزوں کے خلاف بغاوت دکھائی گئی ھے۔ ان کے علاوہ بنگالی کی دیگر ناولوں کے ترجمے بھی کئے گئے۔ دوارکا پرشاد شرما نے ھندی کی تاریخی ناولوں کے ترجمے کئے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں محمد صدیق میمن کی ناول "زندگی کا پھلا دور" شایع ھوئی، جو ایک اردو ناول سے لی گئی تھی۔ اسی طرح ھندی، گجراتی، بنگالی اور اردو کی ناولوں کے بیشمار ترجمے شایع ھوئے۔

مسلمان اھل قلم نے اردو کی تاریخی ناولوں کے ترجمے کئے۔ مثلاً "حور دمشق"، خنجر ھلال"، "منصور موھنا" وغیرہ۔ محمد عثمان ڈیپلائی نے تاریخی ناولوں کا سلسلہ شروع کیا، جن میں سے اکثر اردو ناولوں سے ماخوذ تھیں۔ اندازہ یہ ھے کہ ان کی سو سے اوپر ناولیں شایع ھوئیں۔

طبعزاد ناولوں کے سلسلہ میں سنہ ۱۹۳۱ء میں عبدالرزاق میمن کی ناول "جھاں آرا" شایع ھوئی، جس میں عورت کی وفاداری دکھائی گئی ھے۔ سنہ ۱۹۳۴ء میں ان کی دوسری ناول "دادا شیام" شایع ھوئی جس میں جنسی بے راہ روی دکھائی گئی ھے۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں روچیرام سڈانی کی ناول "آزاد خیال عورتیں" شایع ھوئی، جس میں جھیز اور بیوہ کی دوسری شادی کے مسائل پر اظھار خیال کیا گیا

ھے۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں "آشا ساھتیہ منڈل" کی جانب سے آسانند مامتورا کی ناول "شاعر" شایع ھوئی، جو پہلی نفسیاتی ناول تھی۔

سنہ ۱۹۴۴ء میں نرملداس فتح چند کی تاریخی ناول "دلو رائے کی نگری" شایع ھوئی، جس میں دلو رائے کے مظالم بیان کئے گئے تھے۔ پروفیسر رام پنجوانی نے بھی طبعزاد ناولیں لکھیں۔ نارائنداس بھنبھانی نے بھی دو چار اچھی طبعزاد ناولیں لکھیں۔ مثلاً "مالن" (۱۹۴۲ء)، "ودھوا" (۱۹۴۳ء) اور "غریبوں کا ورثہ" (۱۹۴۶ء)۔ اس ناول میں دیہاتی زندگی کی عکاسی کی گئی ھے۔ بھنبھانی کی ناولیں جدید فنی تقاضوں اور حقیقت نگاری کے اعتبار سے بہترین ناولیں ھیں۔

ڈرامہ

سندھی زبان میں سب سے پہلے ڈرامہ لکھنے کا شرف مرزا قلیچ بیگ کو حاصل ھے، جنھوں نے سنہ ۱۸۸۰ء میں "لیلیٰ مجنوں" لکھا، اور دوسرا ڈرامہ "خورشید" کے عنوان سے بھی انھی نے لکھا، جو سنہ ۱۸۸۷ء میں شایع ھوا۔ تیسرا ڈرامہ "رتناولی" دیوان کوڑومل چندن مل نے سنہ ۱۸۸۸ء میں لکھا۔ اس کے بعد مرزا قلیچ بیگ کے ڈرامے "بکاؤلی" (۱۸۹۴ء)، "نورجہاں اور جہاں گیر" (۱۸۹۶ء)، اور "نادرشاہ" (۱۸۹۷ء) میں شایع ھوئے۔ ان کے علاوہ چھوٹے ناٹک (ایک ایکٹ کے ڈرامے) "سندھ سدھار" (۱۸۸۴ء)، اور "سرسوتی" (۱۸۹۰ء) میں شایع ھوئے۔ سنہ۱۸۹۴ء میں "دیارام جیٹھمل سندھ کالج امیچوئر ڈرامیٹک سوسائٹی" قائم ھوئی، جو مسلسل بیس برس تک ڈرامے اسٹیج کرتی رھی۔ اس سوسائٹی نے ڈرامہ کو بہت مقبول بنایا۔ سوسائٹی کی طرف سے ڈرامے کے آخر میں مختصر فیچر بھی دکھائے جاتے تھے، جن میں مزاح کے پردہ میں طنز ھوتا تھا۔ یہ فیچر

زیادہ تر مرزا قلیچ بیگ کے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ مثلاً "لوبھی اور ٹھوگی"، "انکوائری افسر"، "نیم طبیب خطرۂ جان، نیم ملا خطرۂ ایمان"، "شیخ چلی"، "اگڑ مسخرہ"، "حرکت سے برکت" اور "پرہیز کی ٹولی" وغیرہ۔ اس سوسائٹی نے مرزا قلیچ بیگ کے علاوہ جیٹھانند، لیلارام وطن مل اور دیگر اہل قلم کے ڈرامے بھی اسٹیج کئے۔

سنہ ۱۸۹۴ء میں جیٹھانند کھلنداس نے قدیم سنسکرت ڈرامہ "نل دمینتی" کا ترجمہ کیا۔ سنہ ۱۸۹۵ء میں لیلارام وطن مل نے "ہرشچندر" لکھا، جو "مہا بھارت" سے ماخوذ تھا۔ سنہ ۱۸۹۸ء میں دوسرا دھرمی ڈرامہ "رامائن" لکھا۔ اس کے بعد اور بھی متعدد دھرمی ڈرامے لکھے گئے۔

اس زمانہ میں سماجی مسائل پر لیلارام کے دو ڈرامے شایع ہوئے ایک "سہن تارکا" سنہ ۱۸۹۶ء میں اور دوسرا "سورجن رادھا" سنہ ۱۸۹۷ء میں۔ اس کے علاوہ انہوں نے طنز و مزاح کے رنگ میں چھوٹے ناٹک بھی لکھے مثلاً "شاہ عادل خان" اور "لو بھی لا کھینا"۔

مرزا قلیچ بیگ نے شیکسپیئر کے متعدد ڈراموں کے ترجمے کئے، جن میں اکثر کا ماحول اور کرداروں کے نام بدل کر ملکی رکھدیئے۔ ان کے علاوہ بھی مرزا صاحب نے متعدد ڈراموں کے ترجمے کئے۔ مثلاً "فیروز دل افروز"، "نیکی اور بدی"، "جمشید حمیدہ" اور "شریمتی منجری" وغیرہ۔ ھندو اہل قلم نے بھی غیر زبانوں کے ڈرامے سندھی میں منتقل کئے۔

سنہ ۱۸۹۷ء میں ایک اور ڈرامیٹک سوسائٹی "دھرم آپکا امیچوئر ڈرامیٹک سوسائٹی" کے نام سے شکارپور میں قائم ہوئی، جس کے روح رواں اور ناٹک لکھنے والے دیوان ٹھاکرداس ناگرانی تھے۔ اس

سوسائٹی نے آغا حشر کے اردو ڈرامے بھی اسٹیج کئے۔ تیسری سوسائٹی سنہ ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد میں "حیدرآباد پلیڈرس کلب" کے نام سے قائم کی گئی جس نے سب سے اول مرزا قلیچ بیگ کا ڈرامہ "خورشید" اسٹیج کیا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۰۷ء میں چوتھی سوسائٹی لاڑکانہ میں "چانڈکا امیچوئر ڈرامیٹک سوسائٹی" کے نام سے قائم ہوئی جس نے زیادہ تر سندھی کے مشہور جدید شاعر کشن چند بیوس کے ڈرامے اسٹیج کئے، جو عموماً آغا حشر اور دیگر اہل قلم کے ڈراموں کے ترجمے تھے۔ اس سوسائٹی نے سب سے پہلے کشن چند بیوس کا ڈرامہ اسٹیج کیا جو آغا حشر کے ایک اردو ڈرامہ کا ترجمہ تھا۔ اس کے بعد اور بھی کئی ناٹک منڈلیاں برپا ہوئیں۔ مثلاً سنہ ۱۹۱۲ء کے قریب "حیدرآباد امیچوئر ڈرامیٹک سوسائٹی" قائم ہوئی، جس کے خاص ڈرامہ نگار نانک رام دھرم داس تھے۔ ان کا پہلا ڈرامہ "فریبی فتنہ" سنہ ۱۹۱۴ء میں اسٹیج کیا گیا، جو ایک اردو ڈرامہ کا ترجمہ تھا۔ اسی طرح متعدد اردو، ھندی اور گجراتی ڈراموں کے ترجمے ہوئے، اور مذکورہ منڈلیوں کی طرف سے اسٹیج کئے گئے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں حیدرآباد سوسائٹی نے خانچند دریانی کا طبعزاد معاشرتی ڈرامہ "زندہ پر زندہ"(۱) اسٹیج کیا۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں ان کا دوسرا معاشرتی ڈرامہ "زمینداری ظلم" اسٹیج کیا گیا۔ اسی سوسائٹی نے دریانی کے اور بھی متعدد ڈرامے اسٹیج کئے، جن میں سے آخری ڈرامہ تھا "انسان یاشیطان" (۱۹۳۱ء)۔ یہ ڈرامہ "میری کاریلی" کے ناول Sorrows of Satan سے ماخوذ تھا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں دریانی نے "گلاب کا پھول" کے

---

(۱) یہ ایک اصطلاح ھے جس کا مطلب ھے پہلی بیوی کے جیتے جی دوسری شادی کرنا۔

عنوان سے ایک ڈرامہ لکھا، جس میں جہیز کے مسئلہ پر اظہار خیال کیا گیا تھا۔ اس ڈرامہ سے واقعہ نگاری کی ابتدا کی گئی اور اس کے بعض ایکٹ الگ الگ بھی اسٹیج کئے گئے۔ موٹومل گدوانی اور لعل چند امرڈنو مل نے بھی چند چھوٹے چھوٹے ناٹک لکھے۔ بھیرومل مہرچند آڈوانی نے طنز و مزاح کے رنگ میں چند فیچر لکھے۔ جیٹھمل پرسرام نے شیکسپیئر کے ڈرامہ ہیملٹ کا حرف بحرف لیکن بہت ہی خوبصورت اور نقل مطابق اصل ترجمہ کیا جو سنہ ۱۹۲۳ء میں "نئی سندھ لائبریری" کی جانب سے شایع ہوا۔ انہوں نے نامور جرمن ادیب و شاعر اور مفکر گوئٹے کے مشہور ڈرامہ "فاؤسٹ" کا ترجمہ بھی کیا۔ خانچند دریانی نے بھی متعدد ڈراموں کے ترجمے کئے۔ دریانی نے متعدد طبعزاد ڈرامے بھی لکھے، جن میں بعض کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ سنہ ۱۹۲۸ء میں "رتنا" کے نام سے ایک ڈرامہ لکھا، جس میں قدیم اور جدید ثقافتوں کا تصادم دکھایا گیا ہے۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں "زمانہ کی لہر" کے عنوان سے ایک اور ڈرامہ لکھا، جس کا مرکزی خیال بھی وہی تھا، جو رتنا کا تھا۔ حاصل کلام یہ کہ دریانی صاحب ایک کامیاب ڈرامہ نویس تھے۔

منگھارام ملکانی نے بھی متعدد ڈرامے اور چھوٹے چھوٹے ناٹک لکھے۔ ان کا ڈرامہ "قسمت" ایک انگریزی ڈرامہ کا ترجمہ تھا۔ ان کی ایک ناول "ایکتا کا آلاپ" (۱۹۳۰ء) عبرانی ڈرامہ نگار زنگول کے Melting pot کا ترجمہ تھی۔ جھمٹ مل بھاونانی نے بھی چند ناٹک لکھے مثلاً "مکر" اور "موذی"۔ لیکھراج عزیز نے بھی دو چار ڈرامے لکھے، مثلاً راجپوت تاریخ سے متعلق "کمار اجیت سنگھ" (۱۹۳۱ء)، "مسٹر مجنوں" (۱۹۳۳ء) اور "غریباں مار"۔ عثمان علی انصاری نے

چند ڈرامے ترجمہ کئے مثلاً "جرم بے وفا" اور "گمراہ دوست" (۱۹۳۹ء) وغیرہ۔ محمد اسماعیل عرسانی نے "بدنصیب تھری" کے عنوان سے ایک شاہکار ڈرامہ لکھا، جس میں تھرپارکر کے باشندوں کے رہن سہن کی حقیقت پسندانہ انداز میں عکاسی کی گئی ہے۔ محمد عثمان ڈیپلائی نے بھی چند ڈرامے اور چھوٹے ناٹک لکھے اور ترجمہ بھی کئے۔ محمد حنیف صدیقی نے بھی ایک چھوٹا سا تاریخی ناٹک "سٹبریکا کا ھتھیار ڈالنا" لکھا، جس میں سندھ پر سکندر کے حملہ کا ذکر تھا۔

مکمل ڈراموں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے ناٹکوں کے مجموعے بھی شایع ہوتے رہے۔ پہلا مجموعہ "کوڑومل ساھت منڈل" کی طرف سے سنہ ۱۹۳۳ء میں شایع ہوا۔ دوسرا مجموعہ سنہ ۱۹۳۵ء میں "رتن ساھت منڈل" کی طرف سے "اتہاس کے پردے" کے نام سے شایع ہوا۔ دیگر مجموعے جو اشاعت پذیر ہو کر منظر عام پر آئے، وہ یہ تھے: "اِنڈلٹھہ" (قوس قزح) (۱۹۳۹ء)، "رنگ برنگی کھیل" (۱۹۴۰ء)، اور بھیرومل مہرچند کا "آزادی کے شائق" (۱۹۳۸ء)۔

بعض ڈرامہ نگاروں نے سندھ کی لوک کہانیوں پر بھی ڈرامے لکھے مثلاً سنہ ۱۹۲۲ء میں "سندھی ساھت سوسائٹی" کی جانب سے خانچند دریانی کا "مومل میندھرو" اور سنہ ۱۹۲۵ء میں لعل چند امرڈنومل کا "عمر مارئی" شایع ہوئے۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں ڈاکٹر لیلارام پھیروانی نے "لیلا چنیسر" کی رومانی داستان "ایک رات" کے عنوان سے ڈرامہ کی صورت میں لکھی۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں رام پنجوانی نے "مومل رانو" لکھا۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں نانک رام دھرم داس نے "سوھنی مہینوال" لکھا، اور ان کے علاوہ دیگر لوک کہانیاں اور رومانی داستانیں بھی ڈراموں کی صورت میں قلمبند کی گئیں۔

فصل چہارم

برطانوی دور: مضمون نگاری، تحقیق و تنقید

(الف) مضمون

جب سے سندھی میں اخبار نویسی کی ابتدا ہوئی ہے، مضمون نویسی بھی اسی وقت سے شروع ہوئی ہے۔ سندھی زبان میں اخبار نویسی کی ابتدا اخبار "خورشید" سے ہوئی، جو سنہ ۱۸۶۰ء میں سکھر سے جاری ہوا۔ اس میں دو کالم ہوتے تھے ایک فارسی کا اور ایک سندھی کا۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۶۶ء میں حکومت سندھ کے محکمۂ تعلیم کی طرف سے "سندھ سدھار" کے نام سے ایک پندرہ روزہ رسالہ جاری ہوا، جس میں تعلیم سے متعلق مضامین شایع ہوتے تھے۔ پہلا طویل مضمون، جو سنہ ۱۸۶۲ء کے قریب کتابی صورت میں شایع ہوا، وہ دیوان کوڑومل نے "پکو پہہ" (پکا ارادہ) کے عنوان سے لکھا تھا، اس میں عورتوں کی تعلیم کے حق میں قوی دلائل دیئے گئے تھے۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۷۷ء میں مرزا قلیچ بیگ نے "مقالات الحکمہ" کے نام سے مضامین کا ایک مجموعہ شایع کیا، جو "بیکس اسیر" کا ترجمہ تھا۔ ان مضامین میں مختلف عنوانات پر فلسفیانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد مرزا صاحب کے اور بھی متعدد مضامین اور ان کے مجموعے شایع ہوئے۔ اس ابتدائی دور کے دیگر مضمون نگار تھے دیوان دیارام گدومل، مہاراج تیجو رام شرما، تولارام ہالانی، پھلاجرائے واسوانی اور دیوان لیلا رام سنگھ۔

سنہ ۱۸۹۰ء میں سادھو ھیرانند نے "سرسوتی" کے نام سے ایک مخزن جاری کیا، جس میں وقتاً فوقتاً اچھے مضامین شایع ھوتے رھے۔ خود سادھو ھیرانند کے متعدد مضامین شایع ھوئے جو اخلاقیات پر تھے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "ھیرے کی کنیاں" کے نام سے شایع ھوا جس میں مضامین کے ساتھہ کہانیاں بھی تھیں۔ اس مجموعہ میں سادھو ھیرانند کے علاوہ دیگر اھل قلم کے مضامین بھی تھے، مثلاً پریتمداس، کنول سنگھہ، صاحب سنگھہ شاھانی، بولچند دیارام، خانچند پرتاپ رائے اور کاکو بھیرو مل۔ اس مجموعہ میں شایع شدہ صاحب سنگھہ شاھانی کا مضمون "وھیو" سندھی زبان کے بہترین مضامین میں سے تھا۔

ایک اور اخبار جس میں بہترین مضامین شایع ھوئے "جوت" تھا، جو سنہ ۱۸۶۶ء میں پرمانند میوارام نے جاری کیا۔ اس اخبار میں پرمانند کے علاوہ دیگر اھل قلم کے مضامین بھی شایع ھوئے تھے مثلاً نارائن داس ملکانی، پربھداس اور کاکو بھیرو مل وغیرہ۔ اس اخبار کے شایع کردہ منتخب مضامین کا ایک مجموعہ "گل پھل" کے نام سے شایع کیا گیا، جس میں سب سے زیادہ پرمانند ھی کے تھے۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں ڈی۔ جے۔ سندھ کالج کی طرف سے ایک مخزن (مسلنی) جاری ھوا۔ اس میں بہترین مضامین شایع ھوئے۔ اس مسلنی کی اکتوبر ۱۹۲۵ء کی اشاعت میں کالج کے پرنسپل صاحب سنگھہ شاھانی کا ایک شاھکار مضمون "چنڈول" کے عنوان سے شایع ھوا۔ دیگر مضمون نگار جن کے مضامین شایع ھوئے، ان میں سے حسب ذیل اسماء قابل ذکر ھیں:-

مرزا قلیچ بیگ، پرمانند میوارام، سوبھراج نرملداس، دیوان کوڑو مل، لعلچند امرڈنو مل، کاکو بھیرو مل، محمد صدیق میمن،

میران محمد شاہ، ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، رام پنجوانی، چیتن ماڑی والا اور نارائن داس بھمبھانی۔ سنہ ۱۹۴۷ء تک اس مخزن کے پرچے ششماہی شایع ہوتے رہے۔

سنہ ۱۹۰۲ء میں اخبار تعلیم جاری ہوا۔ اس میں بھی چند اچھے مضامین شایع ہوئے، مثلاً لوکومل کا "سندھ کا قدیم عروج" (اگست ۱۹۲۵ء) وغیرہ۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں "سندھ مدرسۃ الاسلام" کراچی کی جانب سے "رسالہ مدرسہ" جاری ہوا، جس میں متعدد معلوماتی اور ادبی مضامین شایع ہوئے۔ اس رسالہ کے مضمون نگاروں میں سے شمس الدین بلبل، محمد ہاشم مخلص، اللہ بخش ابوجھو، شیخ عبدالمجید سندھی، مولانا دین محمد وفائی، پیر علی محمد راشدی اور حکیم فتح محمد سہوانی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ "بھارت واسی"، "روح رہان"، حیدرآباد کالج کا مخزن "پھلیلی"، "سندھو"، "ستارۂ سندھ"، "الوحید"، "اصلاح"، "قربانی"، "سندھ زمیندار"، "علمی دنیا"، "ادیب سندھ"، "مہران" اور دیگر اخبارات اور رسالہ جات میں وقتاً فوقتاً متعدد بہترین مضامین شایع ہوتے رہے۔

مضامین کے متعدد مجموعے بھی شایع ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں دیوان دیارام وسن مل اور لیلارام پریم چند نے "گلدستہ" کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کراکے شایع کیا۔ اس مجموعے کے مضامین "سرسوتی"، "جوت"، "اخبار تعلیم" اور "پربھات" سے منتخب کئے گئے تھے۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں "منتخب سندھی نثر" کے نام سے ایک مجموعہ شایع ہوا۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں کاکو بھیرومل کا مرتب کردہ "گلزار نثر" شایع ہوا۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں نانکرام دھرم داس نے مضامین کے دو مجموعے مرتب کئے، ایک "بہارستان" اور دوسرا "پھول پھلیل"۔ اسی سال "جوہر نثر" کے نام سے ایک اور مجموعہ شایع ہوا۔ اس کے بعد

لیکھراج کشن چند عزیز اور فتح چند واسوانی کا مرتب کردہ مجموعہ "گلستان" شایع ہوا۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں ڈاکٹر داؤد پوتہ کا مرتب کردہ "سندھی نثر اور نظم کا انتخاب" شایع ہوا۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں پروفیسر لعل سنگھہ اجوانی کا مرتب کردہ مجموعہ "وچار" شایع ہوا، جس کے مضامین "ڈی۔ جے۔ سندھہ کالج مسلنی" کے سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۴۲ء تک کی اشاعتوں سے منتخب کئے گئے تھے۔ سنہ ۱۹۴۴-۴۵ء میں نارائن داس بھمبھانی کے مرتب کردہ "ادبی گلشن" کے تین حصے شایع ہوئے۔

داخلی مضامین کے سلسلے میں پہلا مجموعہ "گل پھل" تھا، جس کا پہلا حصہ سنہ ۱۹۲۵ء میں اور دوسرا حصہ سنہ ۱۹۳۶ء میں شایع ہوا۔ اس مجموعہ کے مضامین "جوت" سے لئے گئے تھے، اور ان میں سے زیادہ تر پرمانند میوارام کے تھے۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں لعلچند امرڈنو مل کے مضامین کا مجموعہ "پھلن مٹھہ" شایع ہوا، جو سندھی ادب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد نارائن داس ملکانی کے مضامین کا مجموعہ "دیہاتی چھہر" (دو حصے) شایع ہوا. جس کے تمام مضامین دیہاتی زندگی سے متعلق ہیں۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں اسی مصنف کا دوسرا مجموعہ "انار دانہ" اور تیرتھہ وسنت کا مجموعہ "چنگاریاں" شایع ہوا۔ اسی سال گوبند بھاٹیہ کے مضامین کا مجموعہ "ورق" کے نام سے شایع ہوا۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں مشہور مجموعہ "ادبی آئینہ" شایع ہوا، جس کے تمام مضامین لیکھراج عزیز کے قلم سے نکلے ہیں۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں "ادبی غنچہ" کے نام سے ایک مجموعہ شایع ہوا، جس کے تمام مضامین رام پنجوانی اور نارائن داس بھمبھانی کے زور قلم کا نتیجہ تھے۔

سیر و سفر سے متعلق بھی مضامین شایع ہوئے۔ اس سلسلہ کا پہلا مضمون مرزا قلیچ بیگ کا تھا، جس کا عنوان تھا "ڈاڑھیالے جبل کی سیر"۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۱۵ء میں لعل چند امرڈنو مل کا ایک مضمون "سفر کا مزہ اور سیر کا رنگ" کے عنوان سے "سندھی ساہت سوسائٹی" کے ماہوار رسالہ میں شایع ہوا، جس میں ہندوستان کے اہم شہروں اور پہاڑوں کا حال بیان کیا گیا تھا۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں کاکو بھیرو مل کا مضمون "سندھ کا میلانی" کے عنوان سے شایع ہوا، جس میں سندھ کے مشہور شہروں، بزرگوں، ان کی درگاہوں اور ان پر منعقد ہونے والے میلوں کا ذکر تھا۔ اسی مصنف کی ایک کتاب سنہ ۱۹۲۱ء میں "لطیفی سیر" کے نام سے شایع ہوئی، جس میں شاہ لطیف کے سیر و سفر کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نارائنداس ملکانی کی "کشمیر کی سیر"، منوہرداس کوڑو مل کی "ہند کی سیر" اور اللہ بچایو سموں کی "سیر کوہستان" وغیرہ کتابیں شایع ہوئیں۔

اسی دور میں طنز و مزاح پر مشتمل نثر و نظم کے مضامین لکھنے والے بھی بہترین اہل قلم پیدا ہوئے۔ اس سلسلہ میں سب سے اول شمس‌الدین بلبل کا نام آتا ہے۔ محمد ہاشم مخلص طنز و مزاح کے بادشاہ تھے۔ ان کے قلم میں بڑا زور تھا۔ تیسرا نام مولوی نورمحمد نظامانی کا ہے، جن کی قلمی نوک جھونک ہمیشہ مخلص سے رہی۔ یہ تینوں اپنے زمانہ کے بے باک صحافی اور بیک وقت باکمال شاعر اور نثر نویس تھے۔ غرضیکہ ہر صنف میں اور ہر موضوع پر بہترین مضامین شایع ہوئے۔

(ب) تنقید و تحقیق

تحقیق، روایات کی چھان بین کا نام ہے، اور تنقید، کسی فن پارہ کے اصولی تجزیہ کا۔ بعض کتابیں ایسی ہیں، جن میں اصول، اور فنی قواعد و ضوابط بیان کئے گئے ہیں۔ ہم انہیں اصولی تنقید کی کتابیں کہیں گے۔ دوسری کتابیں اور مضامین ایسے ہیں، جن میں نظم و نثر کی کتابوں، مضامین، افسانوں، ناولوں اور ڈراموں پر تنقیدی نظر کی گئی ہے۔ انہیں ہم عملی تنقید کہیں گے۔ تیسری کتابیں وہ ہیں، جو تحقیق اور جستجو کے بعد مرتب کی گئی ہیں، ان میں سے بعض میں تنقید بھی ہے، انہیں ہم تحقیقی کتابیں کہیں گے۔ ذیل میں ان تینوں قسم کی تصانیف کا تدریجی ارتقا بیان کیا جاتا ہے۔

اصولی تنقید کی پہلی کتاب محمد فاضل شاہ کی "میزان الشعر" ہے، جو سنہ ۱۸۷۵ء میں شایع ہوئی۔ اس میں علم عروض کے قواعد و ضوابط بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد "انشا پردازی" کے فن پر مرزا قلیچ بیگ کی کتاب "انشائے سندھی" شایع ہوئی۔ پھر آخوند عبدالرحیم وفا عباسی کا مرتب کردہ "عمر مارئی" کا قصہ شایع ہوا، جس کے مقدمہ میں سندھی شعرا کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کو ہم پہلی تحقیقی کتاب کہہ سکتے ہیں، اور اس کے مقدمہ کو پہلا تنقیدی مضمون۔ اسی نوعیت کا دوسرا مضمون مرزا قلیچ بیگ کی وہ تقریر ہے، جو مرزا صاحب نے "سندھی شعر کی پہلی حالت اور آج کا ارتقا" کے عنوان سے سنہ ۱۹۱۴ء میں "سندھی ساہت سوسائٹی" کے سالانہ اجلاس میں کی، اور بعد میں اسے سوسائٹی کی جانب سے کتابی صورت میں شایع کیا گیا۔ اس تقریر میں شعر کی خوبیوں، خصوصیتوں اور تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور

عربی، فارسی، سندھی اور دیگر زبانوں کے شعر پر تنقید اور تبصرہ کیا گیا ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں مرزا صاحب کی تصنیف "علم بدیع" کے نام سے شایع ہوئی، جس میں علم بدیع کے اصول اور قواعد و ضوابط بیان کئے گئے ہیں۔

دیوان کوڑومل نے سامی کے سلوک بڑے اچھے طریقہ سے مرتب کرکے شایع کئے۔ اس کتاب کا مقدمہ سنہ ۱۸۸۵ء میں دیوان دیارام گدومل نے "سامی کے سلوکوں کا مقصد" کے عنوان سے لکھا۔ اس مقدمہ میں سامی کے سلوکوں کی تشریح کی گئی ہے۔ دیوان کوڑومل کی کارگذاری کو تحقیق اور دیوان دیارام کے مقدمہ کو تنقیدی مضمون کہا جا سکتا ہے۔ دیوان دیارام کا اسی نوعیت کا دوسرا مضمون ہے "رباعیات عمر خیام کا دیباچہ"، جو مرزا قلیچ بیگ کے ترجمۂ رباعیات خیام پر بطور دیباچہ کے سپرد قلم کیا۔ ان کے علاوہ مرزا قلیچ بیگ، تاراچند شوقی رام، لیلارام سنگھہ اور دیگر اہل قلم نے بھی اس قسم کے مضامین لکھے، جن میں شعر پر تبصرہ کیا جاتا، اور ابیات کی تشریح کی جاتی۔ اس سلسلہ کا ایک مفصل مضمون لعل چند امرڈنومل نے "شاہانہ شاہ" کے عنوان سے قلمبند کیا، جو سنہ ۱۹۱۴ء میں شایع ہوا۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۱۶ء میں اسی مصنف کی کتابیں "سونہارو سچل" اور سنہ ۱۹۲۰ء میں "بیرنگی باغ کا گل سندھی" شایع ہوئیں۔ آخری کتاب میں "دیوان گل" پر تبصرہ ہے۔

ابتدائی تنقید نگاروں کی فہرست میں جیٹھمل پرسرام کا نام بھی شامل ہے، جن کی بعض تصنیفات اور مضامین میں تنقیدی رنگ جھلکتا ہے۔ انہوں نے سنہ ۱۹۱۵ء میں شاہ لطیف کے سوانح حیات پر "شاہ بھٹائی کی زندگی" کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں شاہ کی صوفیانہ شاعری پر بھی کچھہ اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس

کے بعد سنہ ۲۳-۱۹۲۲ء میں "شاہ کی کہانیاں" کے نام سے ایک کتاب دو جلدوں میں شایع کی، جس میں شاہ کے کلام کو بنیاد بنا کر رومانی کہانیاں لکھیں۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں "شاہ کی کہانیوں کی تشریح" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی، جس میں کہانیوں کا تمثیلی مفہوم اور تصوف کے اسرار و نکات کی تشریح کی گئی ہے۔ اسی سال "سچل سرمست" کے نام سے ایک کتاب شایع کی، جس میں سچل سرمست کے کلام کی تشریح کی گئی ہے۔

مرزا قلیچ بیگ کے یہاں بھی تشریحی تنقید کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، اور اصولی تنقید پر بھی انہوں نے چند کتابیں لکھی ہیں۔ تحقیق کے سلسلہ میں مرزا صاحب نے سندھ کے قدیم شعرا کا کلام مرتب کرکے شایع کیا۔ مثلاً سنہ ۱۹۰۰ء میں سید ثابت علی شاہ کے مرثیے، سنہ ۱۹۰۵ء میں "رسالہ کریمی" اور سنہ ۱۹۱۳ء میں "شاہ جو رسالو" وغیرہ۔ تاریخ اور سوانح کے سلسلے میں بھی مرزا صاحب نے متعدد یادگاریں چھوڑی ہیں۔ مثلاً "شاہ بھٹائی کا احوال" (۱۸۸۵ء اور ۱۸۹۷ء)، "ثابت علی شاہ کا احوال" (۱۹۰۰ء)، "سندھی زبان کی تاریخ" (۱۹۲۲ء)، "سندھ کے قدیم شہر اور ان کے مشہور لوگ" (۱۹۲۱ء)، "تصوف کی تاریخ" (۱۹۲۲ء)، "ریاست خیرپور کی تاریخ" (۱۹۲۲ء) اور "قدیم سندھ کے ستارے" (۱۹۲۳ء)۔

اصولی تنقید کے سلسلہ میں مرزا صاحب نے سنہ ۱۹۲۰ء میں صرف، نحو، علم بدیع اور علم عروض پر کتابیں لکھیں۔ ان کی تشریحی تنقید کے نمونے رسالہ کریمی اور شاہ لطیف کے رسالہ میں نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے شاہ لطیف کے رسالہ کے سروں کی الگ الگ شرح بھی لکھی ہے۔ مثلاً "سر سوھنی کی شرح" (۱۹۱۱ء)،

"سسئی کے سروں کی شرح" (۱۹۱۳ء)، "سر سری راگ کی شرح" (۱۹۱۶ء)، "شاہ لطیف کے رسالہ کی کنجی" (۱۹۱۸ء)، "مومل رانو کی شرح" (۱۹۲۲ء)۔ اس کے علاوہ سنہ ۱۹۲۲ء میں دیوان گل کی شرح لکھی اور سنہ ۱۹۲۶ء میں "دیوان قاسم" اور "دیوان فاضل" کی شرحیں بھی لکھیں۔

ان کے بعد سندھ کے عظیم محقق اور نقاد ڈاکٹر ھوتچند مولچند گربخشانی کا نام لیا جا سکتا ھے، جن کا لازوال کارنامہ "شاہ لطیف کا رسالہ" ھے۔ رسالہ کی پہلی جلد سنہ۱۹۲۳ء میں، دوسری سنہ۱۹۲۴ء میں اور تیسری سنہ ۱۹۳۱ء میں شایع ھوئی۔ پہلی جلد میں جو مقدمہ ھے، اس میں شاہ لطیف کے حالات زندگی بھی ھیں اور ان کے کلام کا تشریحی اور تنقیدی جائزہ بھی۔ رسالہ کا متن نہایت ھی محنت، عرق ریزی اور تحقیق کے بعد مرتب کیا گیا ھے۔ آخر میں شعر کی شرح، الفاظ کے اشتقاق اور مادے اور ان کے معنی بتائے گئے ھیں۔ اس رسالہ کی اشاعت سے سندھی زبان میں جدید طرز کی تحقیق کا آغاز ھوا۔

اس رسالہ کی اشاعت کے بعد متعدد اھل قلم نے تنقیدیں کیں، جو بھارت واسی، سندھو اور دیگر جرائد میں شایع ھوئیں۔ جیٹھمل پرسرام نے اپنی تنقید میں اعتراض کیا کہ "ڈاکٹر گربخشانی نے رسالہ کو مرتب نہیں کیا، بلکہ شاہ لطیف کے ابیات کو خواہ مخواہ رسالہ سے خارج کردیا ھے"۔ یہ تنقید کتابی صورت میں بھی شایع ھوئی۔ دیوان لیلارام سنگھ بھی اس رائے میں جیٹھمل پرسرام سے متفق تھے۔ ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ "ڈاکٹر صاحب نے اپنے مقدمہ اور شرح میں عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ استعمال کئے ھیں"۔ بعض مسلمان ادیبوں نے بھی تنقیدیں کیں، جن میں سے سید اسداللہ شاہ

ٹکھڑائی اور محمد بخش واصف کے نام قابل ذکر ھیں۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ "ڈاکٹر صاحب نے ھندوانہ افکار کی تبلیغ کی ھے"۔

ڈاکٹر گربخشانی ان تنقیدوں سے قطعی متاثر نہیں ھوئے، اور خاموش رہ کر اپنی رائے کی صحت اور اصابت کا اظہار کیا۔ البتہ لعل چند امرڈنو مل، کاکو بھیرو مل اور عیدن مل مینگھراج نے ان اعتراضات کے جوابات دیئے۔

ڈاکٹر گربخشانی کا دوسرا تحقیقی کارنامہ "لنواری کے لعل" ھے، جس میں لنواری کے بزرگان کا تذکرہ نہایت تحقیق سے کیا گیا ھے۔

ماضی قریب کے نقادوں میں ڈاکٹر داؤد پوتہ بھی بلند مقام رکھتے ھیں۔ ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی اور تنقیدی کارنامے بہت زیادہ اور بہت ھی اھم ھیں، جن میں سے بعض کا ذکر اوپر کیا جاچکا ھے اور بعض کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ھے:

"شاہ کریم بلڑی والے کا کلام" (۱۹۳۷ء)، "ابیات سندھی" (۱۹۳۹ء)، اور "کلام گرھوڑی" (۱۹۵۶ء)۔ اس کے علاوہ مولانا غلام محمد خانزئی کی تصنیف "منہاج العاشقین" کا سندھی میں ترجمہ کیا (۱۹۳۴ء)، جس میں شاہ لطیف کے رسالہ کی تمثیلی کہانیوں کا مفہوم سمجھایا گیا ھے۔

ڈاکٹر صاحب نے متعدد تنقیدی اور تحقیقی مضامین بھی لکھے۔ ان کی مرتب کردہ کتاب "ابیات سندھی" پر ھندو ادیبوں اور اخبارات نے بہت اعتراضات کیئے۔ اعتراض کرنے والوں میں جیٹھمل پرسرام، رام پنجوانی، ٹی۔ ایل۔ پنوانی، کاکو بھیرو مل اور لعل چند امرڈنو مل پیش پیش تھے۔ ان کے اعتراضات زیادہ تر اعرابوں کے متعلق تھے۔ مثلاً "کراچی" کے لفظ میں زبر "چ" پر نہیں، بلکہ "ی" پر آنی چاھیئے وغیرہ۔ ان اعتراضات کے مسکت اور مدلل جوابات مسلمان ادیبوں

اور اخبارات نے دیئے، اور بالآخر مخالفت کا یہ طوفان تھم گیا۔

تنقید کے سلسلہ میں رسالے اور اخبارات اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سندھی کے اخبارات اور رسالہ جات نے بھی اس ضمن میں بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ان میں نہ صرف شعر پر تنقیدی مضامین شایع ہوئے ہیں، بلکہ ڈراموں، ناولوں اور افسانوں پر بھی سنجیدہ اور پرمغز مضامین شایع ہوئے۔ بھارت واسی پہلا اخبار تھا، جس میں اس کے سب ایڈیٹر چھتومل تھدھانی نے نئے ڈراموں پر تنقید کی۔ بھارت واسی میں پہلی تنقید سنہ ۱۹۲۲ء میں شایع ہوئی۔ اس اخبار نے ڈراموں کے علاوہ دیگر علوم و فنون کی کتابوں پر بھی تنقیدیں شایع کیں۔ ۱۷- مئی سنہ ۱۹۲۵ء کی اشاعت میں تیجومل شہانی کی کتاب "گوکلے کی زندگی" پر "ساھتی نکتہ چینی" کے عنوان سے جیٹھمل پرسرام کا تنقیدی مضمون شایع ہوا۔ بھارت واسی میں لعل چند امرڈنو مل کی کتاب "سون ورنیوں دلیوں" (سونے جیسے دل)، پرمانند میوارام کی کتاب "گل پھل" اور دیگر مصنفین کی کتابوں پر بھی تنقیدی مضامین شایع ہوئے۔ ماہنامہ "سندھو" میں بھی متعدد تنقیدی مضامین شایع ہوئے۔ اس رسالہ کے لئے جن اہل قلم نے تنقیدی مضامین لکھے، ان میں سے حسب ذیل کے نام قابل ذکر ہیں:

لعل چند امرڈنو مل، کلیان آڈوانی، منگھارام ملکانی، ڈاکٹر داؤد پوتہ، لطف اللہ بدوی، میر رحیمداد خان مولائی شیدائی، بھمبھانی، ڈاکٹر گربخشانی اور کاکو بھیرو مل وغیرہ۔

مذکورہ بالا اخبارات اور رسالہ جات کے علاوہ "کہانی"، "ھندو سنسار"، "ستارۂ سندھ"، "مہران"، "سندھ زمیندار"، "قربانی"، "اصلاح"، "الحق"، "الوحید"، "مسلمان" "نوراسلام"، "مرغ فلک"،

"طیراً ابابیل"، "اخبار تعلیم"، "تحفۂ احباب"، "بہار اخلاق"، "جعفر زٹلی"، "روح رھان"، "ترقی"، "علمی دنیا"، "الراشد" اور "الحقیقت" وغیرہ اخباروں اور رسالوں میں بھی تنقیدی مضامین شایع ہوتے تھے۔ ماھنامہ "ادیب سندھ" میں عروضی شاعری پر معیاری تنقیدی مضامین شایع ہوئے، جو محمد بخش واصف، حاجی محمود خادم، ڈاکٹر شیخ محمد ابراھیم خلیل اور جمعہ خان غریب اور دیگر اھل قلم لکھتے رہے۔

معیاری شاعری کے سلسلہ میں اوپر جن کتابوں کا ذکر آ چکا ہے، ان کے علاوہ اور بھی اھم اور معیاری کتابیں شایع ہوئیں، جن میں سے آغا غلام نبی صوفی کا "سچل سرمست" (۱۹۳۳ء)، محمد صدیق مسافر کا دیوان فاضل (۱۹۳۷ء)، ماسٹر وادھومل سولچند کا "سامی کے منتخب سلوک" (۱۹۳۸ء)، مولچند ٹھکر کا "صوفی دلپت رائے کے سندھی سلوک" (۱۹۳۸ء) اور گدومل ھرجانی کا "بیدل کا رسالہ" (۱۹۴۰-۴۲ء) قابل ذکر ھیں۔ ان میں متعلقہ شعرا کا کلام بڑی تحقیق کے بعد پیش کیا گیا ہے، اور ان پر مفصل تبصرہ اور تنقید بھی ہے۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں نارائنداس بھمبھانی کی کتاب "شاہ جوں سورمیوں" شایع ہوئی، جس میں ان عورتوں کی سیرت کی عکاسی کی گئی ہے، جن کا ذکر شاہ لطیف نے اپنے رسالہ میں کیا ہے۔

جدید تقاضوں کے مطابق پہلی تنقیدی کتاب "سندھی شعر کی کسوٹی" ہے، جو سنہ ۱۹۴۶ء میں شایع ہوئی۔ یہ دو مضامین پر مشتمل ہے۔ ایک لوکومل کیسوانی کا ہے، جس میں بیدل کے کلام پر تنقید کی گئی ہے، دوسرا ان کی لڑکی کملا کیسوانی کا، جس میں لیکھراج کشنچند عزیز کے کلام پر تنقید ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں پروفیسر لوکومل نرمل جیوتانی کے شعر پر بھی تنقید کی گئی ہے۔ اس کتاب کا جواب سنہ ۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر خلیل نے "کیسوانی

کی کسوٹی" کے عنوان سے دیا، جو کتابی صورت میں شایع ھوا۔ خلیل صاحب نے ثابت کیا تھا کہ عزیز کے شعر کے مقابلہ میں بیوس کا شعر خام اور غیر موزوں ھے۔

محمد صدیق مسافر نے سنہ ۱۹۳۶ء میں "قرب قلیچ" کے نام سے ایک کتاب لکھی، جو "مسلم ادبی سوسائٹی" کی جانب سے شایع ھوئی۔ اس میں مرزا صاحب کے حالات زندگی بھی ھیں، ان کی ادبی خدمات کا ذکر بھی ھے اور ان کی تصنیفات پر تبصرہ بھی۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں کاکو بھیرو مل کی تصنیف "سندھی زبان" شایع ھوئی، جس میں سندھی زبان کی اصلیت اور بنیاد پر بحث کی گئی ھے۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۴۱ء میں اسی موضوع پر ان ھی کی مشہور کتاب "سندھی زبان کی تاریخ" شایع ھوئی، جس میں سندھی زبان کی بنیاد، مزاج اور اس کے رسم الخط کا جائزہ لیا گیا ھے۔ سنہ ۱۹۳۷ء میں محمد صدیق میمن کی کتاب "سندھ کی ادبی تاریخ" (جلد اول) شایع ھوئی، جس میں ادبی تاریخ بھی ھے اور سندھی شعرا کے کلام کا تنقیدی تجزیہ بھی۔ سنہ ۱۹۴۳ء میں لطف اللہ بدوي کی تصنیف "تذکرۂ لطفی" (جلد اول) شایع ھوئی، جس میں سندھی شعرا کے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ، ان کے کلام پر بھی تبصرہ ھے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ھوگا کہ اس زمانہ میں زیادہ تر تشریحی تنقید کی گئی ھے، جس میں ادب کی صرف تشریح کی جاتی ھے اور روایتی انداز میں فنی خامیاں بیان کی جاتی ھیں۔ البتہ "شعر کی کسوٹی" میں مقرر کردہ معیار کو دخل ھے۔ اس دور کے آخری نقادوں میں سے ڈاکٹر گربخشانی، ڈاکٹر دائود پوتہ، کاکو بھیرو مل، حاجی محمود خادم، محمد صدیق میمن اور لوکو مل کیسوانی کو بڑی اھمیت حاصل ھے۔

فصل پنجم

شعر و شاعری: کافی اور بیت

اس دور کی سندھی شاعری میں بڑی وسعت اور گہرائی ہے، مضامین میں تنوع اور مفہوم میں مقصدیت کے لحاظ سے بھی، اور فکر و فن میں بلندی اور پختگی کے اعتبار سے بھی۔ اس دور کے شعرا نے شاعری کی ہر صنف پر طبع آزمائی کی۔ بیت اور کافی کے بھی بلند پایہ شاعر پیدا ہوئے اور عروضی شاعری کے میدان میں بھی متعدد اور بہترین شعرا نے قدم رکھا۔ مدحیں، معجزے، منقبتیں، مناجاتیں اور سی حرفیاں بھی کہی گئیں اور رومانی داستانیں اور قصے کہانیاں بھی منظوم کی گئیں۔ اس کے علاوہ لوک ادب کی مختلف صنفوں ڈور، سنگھار، ہنر، دراھو، واقعاتی ابیات اور مناظرہ وغیرہ کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ غزل میں نعتیہ رنگ بھی بھرا گیا اور معاشی اور معاشرتی امور پر بھی اظہار خیال کیا گیا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ شعرا میں نئے رجحانات بھی پیدا ہوئے۔ ذیل میں اس دور کی شاعری کے مختلف مکاتیب فکر کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

کافی اور بیت

قادر بخش بیدل: اس دور کے بڑے شاعر حضرت قادر بخش بیدل(۱) ہیں، جن کا شمار سندھی زبان کے چند عظیم شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں وحدۃالوجود کا عقیدہ کارفرما ہے۔ حسن و عشق کے مضامین کو بھی خوب نبھایا ہے۔ علمی اور ادبی لحاظ سے خواہ فنی اور فکری اعتبار سے ان کا کلام بڑی خوبیوں کا حامل ہے۔ منظر کشی اور واقعہ نگاری کے بھی بہترین نمونے موجود ہیں۔ کافی کو حضرت بیدل نے فنی اعتبار سے نہایت ہی پختگی بخشی ہے۔ ان کے سندھی بیت میں بھی انفرادیت کا رنگ جھلکتا ہے۔ قصیدے اور مرثیے بھی کہے ہیں اور مختلف عنوانات پر ابیات بھی۔ مثلاً وحدت، فرائض صوفیہ، سر مارئی اور سر سسئی وغیرہ۔ ان کا ایک بیت بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے، جس سے ان کے عقیدہ کا اظہار ہوتا ہے۔

---

(۱) حضرت بیدل کی ولادت سنہ ۱۸۱۴ء میں ہوئی اور وفات سنہ ۱۸۸۲ء میں۔ روہڑی کے قریشی خاندان سے تھے، جو گوٹہ کناری کا کام کرتے تھے۔ بارہ برس کی عمر میں تحصیل علوم سے فارغ ہو کر حضرت قلندر شہباز کی درگاہ پر زیارت کرنے گئے جہاں روحانی فیض سے مالا مال ہوئے۔ مجاز کی چوٹ بھی کھائی، لیکن ثابت قدم رہ کر اس منزل سے کامیابی کے ساتھ آگے گذر گئے۔ سندھی کے علاوہ عربی، فارسی، اردو اور سرائکی زبانوں میں بھی شعر کہا ہے۔ نظم اور نثر میں ان کی بیس سے زیادہ تصانیف ہیں، جو مختلف موضوعات اور مسائل پر ہیں، اور سب کی سب غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔

پسي موج محمدي مستي ٿين مقام	سالک محمدی موج دیکھ کر وجد اور سرمستی میں آجاتے ھیں
آديسين آرام اچي ٿيو اثبات ۾	لیکن پھر اثبات میں ان کو سکون اور اطمینان مل جاتا ھے۔

فنی ساخت کے اعتبار سے ان کی کافی میں متعدد انوکھے اور دلچسپ تجربے نظر آتے ھیں۔ روانی، دلکشی اور رنگینی ان کے کلام کی خاص خوبیاں ھیں۔ ان کی ایک کافی بطور نمونہ پیش کی جاتی ھے، جس کا ھر بیت مثلث کی طرح تین مصرعوں پر مشتمل ھے اور ھر بیت کا مصرعۂ ثانی دوسرے بیت کے مصرعۂ ثانی سے اور مصرعۂ ثالث دوسرے بیت کے مصرعۂ ثالث سے ہم قافیہ ھے۔ گویا ھر بیت دو قافیوں سے سجایا گیا ھے:-

كانگ لنوين مٺي لات — محب مسافر ڇاڻ ڪي ايندا

۱- جيڪس دانھون درد منھنجي جون، پھتيون اتي پرڀات
اتم اميد تہ ھيئن نہ ڇڏيندا

۲- ورندا، سي ساٿيھ تي سڄڻان، طلب جنين جي آھي تات
گولي پنھنجي گڏ گڏيندا

۳- ايندا جوء ۾ جانب جائي، وائي جنين جي اتم وات
دوست دلاسو دل کي ڏيندا

۴- درد فراقون انھيء جي مون ڪي، حالئون نيو ھيھات
وٺي وصال جي شال وندينداا

۵- بيدل بالڪل ٿيء نہ ماندو، سجھ صبح ڪي رات
ھوت اچي توسان ھڪ ٿيندا

ترجمہ :

اے کوے! تو میٹھی بولی بول رہا ھے، (غالباً) میر مسافر محبوب ابھی آنے والے ھیں

۱- شاید میری درد مندانہ فریادیں سویرے سویرے ان تک جا پہنچی ھیں

مجھے امید ھے کہ وہ مجھے اس حال میں چھوڑ نہیں دیں گے

۲- میرے محبوب، جن کی مجھے طلب اور فکر ھے، وطن واپس آ جائیں گے

اور اپنے اس غلام کو بھی اپنے ساتھ رکھیں گے

۳- محبوب سچ مچ یہاں آئیں گے، جن کا ذکر میری زبان پر ھے

اور میرے دل کو آ کر دلاسہ دیں گے

۴- ان کے درد فراق نے مجھے حال سے بے حال کر دیا ھے

امید ھے کہ وہ وصال کے پیالے پلائیں گے

۵- اے بیدل! تو بالکل پریشان نہ ھو، شام کو خواہ صبح کو خواہ رات کو

بالآخر محبوب آ کر مجھے اپنے وصل سے نوازیں گے

بیکس: حضرت بیدل کے فرزند محمد محسن بیکس بھی کافی اور بیت کے بلند پایہ شاعر تھے۔ اس لاابالی شاعر نے عین عالم شباب میں چوبیس سال کی عمر میں سنہ ۱۸۸۲ء میں انتقال کیا۔ ان کے کلام سے معلوم ھوتا ھے کہ ان کا دل سوز و گداز سے سرشار تھا۔ ان کے سینہ میں عشق کا بے پناہ درد سمایا ھوا تھا۔ وہ حسن سے متاثر تھے، حسن سے مسحور تھے اور حسن ھی کے شاعر تھے۔ فرماتے ھیں:-

خوني خماري چشمان چتين ٽيون
ڏسڻ ساڻ عاشق تہ ڪي ٿي
ڪهن ٽيون

مخمور اور خونیں آنکھیں تیراندازی کرتی ہیں، دیکھنے سے کئی عشاق کو قتل کر دیتی ہیں۔

تکا تیر مژگن جا ابرو ڪماني
سپر سينو منهنجو آ، هڻ تون جاني

اے محبوب! میرا سینہ سپر ہے۔ تو اپنے تیر مژگاں اور کمان ابرو سے اسے نشانہ بنا دے۔

ماهي مينون بخش ڏکان دا ڏاج

اے محبوب! مجھے دکھ درد کا خزانہ عطا کر۔

سنياسين مان سور، بيڪس پرايم
بره جو
جوش وڌائون جان ۾، وڃي تو
وهلور
ڪو جو پرايم پور، سنياسين جي
سور مان

اے بیکس! میں نے سنیاسیوں (سالکوں) سے عشق کا درد حاصل کیا۔ انہوں نے میرے اندر جوش بھر دیا (میرا دل) ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔ سنیاسیوں کے عطا کئے ہوئے درد سے میں نے غور و فکر کی دولت حاصل کرلی۔

اصغر: حضرت بیدل کے ہمعصر پیرصاحب پاگارہ پیر علی گوہر شاہ اصغر "بنگلہ دھنی" (ولادت ۱۲۳۱ھ، وفات ۱۲۶۳ھ) کافی کے باکمال شاعر تھے۔ ان کی کافی فنی خواہ فکری اعتبار سے نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی ہے۔ ہجر و فراق کی دل گداز کیفیت اور وصل یار کی زندگی بخش روداد بڑی خوبصورتی اور اثر انگیزی کے ساتھ بیان

کی ھے، جس سے ان کے کلام میں بڑا ھی سوز و گداز پیدا ھوگیا ھے۔ ان کی ایک کافی کے دو بند پیش کئے جاتے ھیں:۔

رمزان رانول منهنجي روح ۾، اج ڪي وري لاتئي نيون
ڦٽڙا درد فراق جا، تن ۾ وڌيءِ وِهه جون وٽيون

۱- اهي تاب تنهنجي ڪان تتيون، جيئن تيل جون تهڪن تيون
طوفان نوح جو وبو سڪي، اکڙيون جهڄڻ ڪان ناجهڪيون

۲- جهوليءَ پائي آءٌ ٿي جهجان، نيڻن پائي رت جون نيون
اصغر عاشق! عشق جون، ڳالهيون ڪيون تو سڀ نيون

ترجمہ:

اے محبوب! تم نے آج میری روح میں نئی امنگیں اور نئے ولولے پیدا کر دیئے ھیں

درد فراق نے جو زخم پیدا کئے تھے، تم نے ان میں زھر کی پیالیاں بھرکر ڈال دی ھیں

۱- وہ (آنکھیں) تیری تابش سے ایسے گرم ھوگئی ھیں، جیسے تیل کی اُبلتی ھوئی کڑاھیاں

طوفان نوح تو خشک ھو گیا، لیکن میری آنکھیں برسنے سے ابھی نہیں تھکیں

۲- آنکھوں سے خون کی ندیاں بہہ رھی ھیں اور وہ خون، میں اپنے دامن میں سمیٹ کر روتا رھتا ھوں

اے اصغر عاشق! تم نے عشق کی جو باتیں کی ھیں، وہ سب انوکھی ھیں

عثمان فقیر: عثمان فقیر سانگی (ضلع لاڑکانہ، وفات ۱۸۶۰ء) اعلیٰ پایہ کے صوفی شاعر تھے۔ انھوں نے اپنے کلام میں مسائل

تصوف کو دلکش اور اثرانگیز انداز میں بیان کیا ہے۔ روانی اور نغمگی ان کے کلام کی خاص خوبیاں ہیں۔ ان کی ایک کافی کے چند بند بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:

اکڙيون عزم ڪيڏو رکن ، دلڙي ڦاسائين دام ۾
ديدان ڪنهين دستور سان، موهيو وٺن ڪنهن مام ۾

۱- اکڙيون سڄڻ تنهنجون مارٽيون، ڪنهن ڏرن سان ڏتارٽيون
تو ڏاڙي ڪاتر ڏارٽيون، سگهڙو آٽين ٽيون دام ۾

۲- ڪجليون پائين ڦهري ڪجل ، دل ۾ اٿن خوني خلل
ملھ سان لڙي جيئن زور ملھ، گڏجن اچي ھڪ گام ۾

ترجمہ:

آنکھوں کا عزم تو دیکھئے، کس طرح دل کو دام میں پھانس لیتی ہیں
اور نگاہیں کسی پراسرار طریقے سے موہ لیتی ہیں

۱- اے محبوب! تیری آنکھیں شکاری ہیں، عجیب طریقوں سے ورغلاتی ہیں
تم نے ڈاکہ زنی کے لئے پال رکھی ہیں، اور وہ فوراً شکار کو قابو میں لے آتی ہیں

۲- سیاہ آنکھیں غضب کا کاجل ڈالتی ہیں، ان کی نیت میں خونریزی کرنے کا خلل ہے
جیسے کشتی لڑنے والا اپنے حریف کو گرفت میں لے لیتا ہے، اسی طرح ایک ہی دم میں پکڑلیتی ہیں۔

رمضان کمہار: سہون کے قریب آمڑہ گنبھیر گاؤں کے باشندہ تھے ۔ سنہ ۸۹-۱۸۸۸ء کے قریب انتقال کیا ۔ بقول ڈاکٹر داؤد پوتہ ان کے کلام میں اتنا زور، حسن اور مٹھاس ہے، کہ کسی اور شاعر کے کلام میں مشکل سے ملے گا ۔ کافی اور ابیات بھی کہے ھیں اور الف اشباع کے قافیہ میں نظم بھی ۔ ان کی ایک کافی کے چند ٹکڑے بطور نمونہ پیش کئے جاتے ھیں:-

مون کي مولا میڙین مصطفیٰ ۔ ڏسان دوست سندو دیدار
منھنجو محب مٺو مٺار ۔ مون کي مولا میڙین مصطفیٰ

۱- وڻ وڻ ووڙیندي وتان، ھو جو ڪاف مٿي ڪوھیار
دوست ملي مون دادلو ۔ منھنجو دانھ، دل قرار

۲- رمضان پرتو مصطفیٰ ۔ ھيءُ ڪوجھو آھي ڪمتار
مداحي ھيءَ مقبول ٿئي ۔ اوھین پھرایو پینار

ترجمہ:

اے مولا! مجھے محمد مصطفیٰ سے ملادے، تاکہ میں اس دوست کا دیدار کروں

میرے محبوب، میٹھے، دل کو سکون بخشنے والے ۔ اے مولا! مجھے محمد مصطفیٰ سے ملادے

۱- میں تو جگہ جگہ تلاش کرتی پھرتی ھوں، لیکن میرا محبوب شاید کوہ کاف کے اوپر ہے

میرا پیارا دوست مجھے ملنا چاھیئے، جو دانا ہے اور دل کے سکون کا باعث ہے

۲- رمضان جو عیبدار اور کمتر ہے، مصطفیٰ کی پناہ میں ہے

اے مصطفیٰ! اس ثنا گوئی اور ستائش گری کو شرف قبول عطا فرمائیے اور اس گدا کو خلعت پہنائیے ۔

صوفی خیر محمد: خیر محمد کے نام سے تین مشہور کافی گو شعرا گذرے ھیں۔ ایک خیر محمد جسکانی، دوسرے خیر محمد صوفی، جو صدیق فقیر سومرہ کے پوتے تھے، اور تیسرے صوفی خوش خیر محمد ھیسبانی۔ یہ تینوں کافی کے اچھے شاعر تھے لیکن "خوش خیر محمد" ان میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ ان کی کافی کو قبول عام حاصل ھوا۔ "خوش" ان کا تخلص ھے، لیکن وہ اپنے کلام میں تخلص اور نام ساتھ ساتھ لاتے ھیں۔ صوفی خوش خیر محمد (۱) کے کلام میں رنگینی اور روانی بھی ھے اور فکری بلندی بھی۔ ان کی حسب ذیل کافی بیحد مشہور اور مقبول ھے:۔

پسي صورت جو سلطان هم حيران لڳي

۱- جن، ملائڪ، حوران، پريون، هر هڪ ٿيو حيران
پڙهڻ سبحان لڳي

۲- سنهسين ساز سرود، تماشا، سازن جا سامان
جاتي تاتي تان لڳي

۳- سر سونهين پوشاڪ گلابي، موهيو مسي ۽ پان
مِسُ مرجان لڳي

۴- ڪليا حسن، چمن چوڌاري، بلبل ٿي مستان
برهه بستان لڳي

---

(۱) صوفی خوش خیر محمد قصبہ گل محمد فقیر ھیسبانی تحصیل کنڈیارہ ضلع نوابشاہ کے باشندہ تھے۔ بعد میں اپنے والد کے ساتھ قصبہ ٹکڑ ضلع خیرپور میں آ کر آباد ھوگئے۔ والد کا نام غلام حیدر تھا۔ فقیر صاحب کی ولادت سنہ ۱۷۹۰ء میں اور وفات سنہ ۱۸۷۷ء میں ھوئی۔ سندھی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی۔

۵- خوش خيرمحمد پڌ خبر انهن جي بيحد آهي بيان
جنين جند جان لڳي

ترجمہ :

مملکت حسن کے سلطان کو دیکھ کر سب حیرت زدہ رہ گئے

۱- جن، فرشتے، حوریں، پریاں سب حیران ہوئے
اور سب سبحان سبحان پڑھنے لگے

۲- سینکڑوں ساز، سرود، تماشے اور نغمہ و سرود کے سامان
جہاں تہاں تانیں چھڑ گئیں

۳- ان کے جسم پر گلابی رنگ کا لباس سجتا ہے، اور
اوپر سے مسی اور پان نے موہ لیا ہے
گویا مرجان کا جڑاؤ ہے

۴- چاروں طرف حسن کے چمن کھل اٹھے ہیں اور بلبل
مستان ہوگئی ہے
گویا یہ عشق کا باغ ہے

۵- اے خوش خیرمحمد! ان کی بات سن، بڑی طویل
داستان ہے، ان کی،
جن کے جی سے لگی ہے

ان کے علاوہ سید قطب علی شاہ (وفات ۱۸۷۹ء) بھی کافی اور بیت کے اچھے شاعر تھے۔

مخدوم امین محمد: ہالا کے مخدوم نوح کے سجادہ نشیں مخدوم امین محمد عرف "پکھا دھنی" (صاحب کاشانہ) (۱۸۳۸ء — ۱۸۸۶ء)، سندھی زبان کے بہترین شاعر تھے۔ ان کی کافی میں بڑی پختگی اور روانی ہے۔ ایک کافی بطور نمونہ درج ذیل ہے :-

تنهنجي نيڻن جادو لايو يار، رمزون رمزون رليون

۱- اکڙيون تنهنجون ڪجليون ڪاريون، ڏاڙيءَ ڪاڻ دلبر ڌاريون
هو گهر آجاڙين ڳليون يار

۲- دليون دلبر ڪاڻ سڌايون، وورڻ ويئون وري نہ آيون
او گهت نهارين گهتيون يار

۳- اکيون آيون، اکڙين آريءَ، وارن ور وڌڙا واري
هو جت پهچيون، تت جهليون يار

۴- جانب جنگي جادو لايو، سر ڏيڻ جو تن کيو سعيو
هر دم حاضر هليون يار

۵- امين محمد! اکڙيون اڙيون، زلف زنجير قلابين ڪڙيون
وه کين چتن، سي جهليون يار

ترجم :

اے محبوب! تیری آنکھوں نے جادو کر دیا، رمزیں، رمزوں سے مل گئیں

۱- تیری آنکھیں کالی اور کاجل بھری ہیں، یہ تو نے ڈاکے ڈالنے کے لئے پال رکھی ہیں
یہ ہر گھر اور ہر گلی کو اجاڑ دیتی ہیں

۲- دل، دلبر کی طلب میں روانہ ہوگئے ہیں، اس کی جستجو میں نکلے ہیں تو پھر واپس نہیں آئے
وہ ان کے راستے اور گلیاں دیکھ رہے ہیں

۳- میری آنکھیں تیری آنکھوں کی خاطر آئیں، تو تیری زلفوں نے دام بچھا دیئے
اور میری آنکھیں وہاں پہنچتے ہی پھنس گئیں

۴- جنگجو محبوب نے جادو کر دیا ہے، سب نے جان دینے کی تمنا کی ہے
اور وہ ہر وقت حاضر ہیں

۵- اے امین محمد! آنکھیں پھنس گئیں، زلفوں کی زنجیروں اور چوٹیوں کی رسیوں میں جکڑی گئیں
جو گرفتار ہو چکی ہیں، وہ اب آزاد نہیں ہو سکتیں۔

دریا خان: اس نام کے دو صوفی شاعر گذرے ہیں۔ ایک روحل فقیر کے فرزند، اور دوسرے دولہہ دریا خان۔ روحل فقیر کے دیگر فرزند شاہو فقیر، غلام علی فقیر اور خدابخش فقیر بھی شاعر تھے۔ دولہہ دریاخان کافی کے باکمال شاعر گذرے ہیں۔ وہ ھنگورجہ کے مخدوم خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ والد کا نام میاں محمد الیاس تھا۔ نوشہرہ کے مخدوم عبدالحی نقشبندی کے مرید تھے۔ سندھ اور بلوچستان کا سیر و سفر کرنے کے بعد قصبۂ لعلو رانک ضلع لاڑکانہ میں آستانہ قائم کر کے بیٹھ گئے، اور ۱۵ ذوالقعد سنہ ۱۳۰۹ھ کو انتقال کیا۔

دولہہ دریاخان ایک حقیقت پسند شاعر تھے۔ ان کی کافی میں جہاں تصوف کا رنگ جھلکتا ہے، وہاں حسن و عشق کی چاشنی بھی موجود ہے، جو ان کے ذاتی ذوق کی غماز ہے۔ ان کی کافی میں معاشی اور معاشرتی حالات کی عکاسی بھی ہے۔ صوفی ہونے کے ساتھہ ساتھہ چونکہ وہ ایک زندہ دل اور ظریف الطبع شاعر بھی تھے، لہذا ان کے کلام میں کہیں کہیں مزاح اور ظرافت کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ ذیل میں ان کے مزاحیہ کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے :-

(۱)

ان آهي ايمان، پوءِ ٿو بندو بود اچي

۱- پيرن لئي پيدا ڪيا، سڳداسي سبحان

۲- جوئر ٻاجهر ٻ نور، پر ڪڻڪ مٽ ڪان

۳- دل اسان جي دانگين سان، ڪنن تئون قربان

۴- سڀڪنهن جي دل درياخان، آ حلوي ڪاڻ حيران

ترجمہ :

آنؔ (اناج) ایمان ہے، اس کے خمار سے انسان میں سرمستی پیدا ہو جاتی ہے

۱- اللہ تعالیٰ نے سگداسی چاول پیر صاحبان کے لئے پیدا کئے ہیں

۲- جوار اور باجرہ بھی اچھے ہیں، لیکن وہ گندم کی برابری نہیں کر سکتے

۳- ہمارا دل دانگی (توا) میں اٹکا ہوا ہے، اور ہم ھانڈی پر سے قربان ہو رہے ہیں

۴- اے دریا خان! سب کے دل حلوے کی خاطر حیران ہیں۔

(۲)

مٺئون آيا هن مينهن ملي، هيٺئون درياه جي آب اٿل ڪئي

۱- ڪنڊ ٻڏندي خلق تڪي پئي، ڪير ٻاڻيءَ جو زور جهلي

۲- خاوند خلق ڪي خوش جو ڪيڙو، پو ڪون ڀڪيون ٿن آن" جهلي

۳- گاهه چري ٿيا مال متارا، ڏس ٻا گين جو ٻاڻ ٻلي

۴- درد دريا خان سپ دفع ٿيا، وٽ مقصد پنهنجا جهول جهلي

ترجمہ :

اوپر سے بارش برس رھی ھے، اور نیچے دریا میں سیلاب آیا ھوا ھے

۱- لوگ نہروں کے شگاف بھرتے بھرتے تھک گئے ھیں، پانی کی طغیانی کو کون روک سکتا ھے

۲- اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو خوش کردیا، لوگوں کی فصلیں تیار ھیں اور خوشوں میں دانے پیدا ھو چکے ھیں

۳- مال مویشی گھاس کھا کر موٹے ھو گئے ھیں، اب مالداروں کے پؤ بارہ ھیں

۴- اے دریا خان! سب دکھ درد دفع ھو گئے، اب دامن پھیلا کر اپنی مرادیں پالے۔

دولہہ دریا خان کے بھائی نشان علی بھی کافی کے اچھے شاعر تھے۔ محمد فقیر کھٹیان اور سید حسن بخش شاہ (۱۹۰۰ء) بھی کافی اور بیت کے بلند پایہ شاعر تھے۔

مولوی غلام محمد خانزئی: یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ اصل میں کہاں کے باشندہ تھے۔ لیکن علم کی تشنگی بجھانے کے لئے کہیں سے پیر جھنڈو میں آ گئے اور تمام عمر وھیں گذار دی۔ ان کی ولادت اور وفات کی تاریخیں بھی معلوم نہیں ہو سکیں۔ البتہ اس قدر پتہ چلا ھے کہ سنہ ۱۳۰۳ھ کے قریب زندہ تھے۔ قیاس یہ ھے کہ ان کی وفات اس سے آٹھ برس بعد میں ھوئی ھوگی۔ سندھی زبان کے بہترین شاعر تھے۔ ان کا مکمل رسالہ موجود ھے۔ حسن بیان کے لحاظ سے خواہ پختگی اور فکری بلندی کے اعتبار سے ان کا کلام اعلیٰ پایہ کا ھے۔ کافی بھی کہی ھے اور بیت بھی بہت ھی اچھے

کہے ھیں۔ زبان نہایت ھی سلیس اور دلکش ہے۔ الفاظ کی خوبصورت بندش اور بہترین ترتیب نے ان کے کلام میں حسن اور روانی پیدا کی ہے۔ دو بیت بطور نمونہ پیش کئے جاتے ھیں:-

(۱)

ويساهي سو وسهيو، مير محمد جام
حامي همت هاشمي، قائم ڏينهن قيام
تنهن دراچي سام، عاصي لڳا آسري.

(۱)

میر محمد جام (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رتبہ ایک عقیدتمند ھی سمجھ سکتا ہے۔ قیامت کے روز ھاشمی ھی حمایت کریں گے اور حوصلہ دلائیں گے۔ اسی امید پر گنہگاروں نے ان کے دروازہ پر آکر پناہ لی ہے۔

(۲)

ڪکين پتين پڌرو، ڪاريگر جو ڪم
اصل ڪثرت جو، پردو آهه عدم
سوئي سور الم، سوئي صحت سک جي.

(۲)

کاریگر کی کاریگری عمارت کے در و دیوار سے ظاھر ہے۔ عدم دراصل کثرت کا پردہ ہے۔ حقیقت میں دکھ درد بھی وھی ہے اور صحت اور سکون بھی وھی۔

ان کے علاوہ سکھر کے منشی خاندان میں سے میاں محمود (۱۸۷۵ء)، محمد عالم سومرہ ساکن بستی پلئو ویسر تحصیل میرپور ماتھیلو (وفات ۱۸۸۲ء) اور لعل محمد (۱۹۰۰ء) ساکن بستی "ساکھہ کندھرو" تحصیل پنو عاقل بیت اور کافی کے اچھے شاعر گذرے ھیں۔

غلام محمد شاہ راشدی : حضرت پیر پاگارہ پیر صبغت اللہ شاہ راشدی کے پوتے اور پیر علی ذوالفقار شاہ کے فرزند تھے۔ سنہ ۱۸۴۳ء کے قریب پیر گوٹھ میں متولد ہوئے اور سنہ ۱۹۰۱ء میں انتقال کیا۔ زندگی کے آخری ایام لاڑ میں بسر کئے۔ صرف کافیاں کہی ہیں جو سوز اور درد سے معمور ہیں۔ اپنے مولد و مسکن سے دوری، حالات کی ناسازگاری اور دنیا کی بے وفائی کے باعث ان کے کلام میں سوز و گداز کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ ان کی ایک کافی بطور نمونہ پیش کی جاتی ہے :-

دلڙي ديواني ڪري وئين يار، پوءِ ساجن مٺي جي لڌءِ نہ سار

۱- اڏر ڪيانتل ڪڏهين ايندا، دوست دلاسو دل کي ڏيندا

ڪانگل ڪر تون خبر چار

۲- تون منهنجو سائين، آءٌ تنهنجي ٻانهي، اڳڻ آسروندي
جي آءٌ تون جاني

سوڊل لڳــ ستار

ترجمہ:

اے محبوب! میرے دل کو دیوانہ بنا کر چلدیئے، اور پھر کوئی خبر گیری نہیں کی

۱- اے کوے اڑجا، اور دیکھ کر بتا کہ محبوب کب آئیں گے، اور دل کو کب دلاسہ دیں گے

اے کوے! مجھے آکر حال بتادے

۲- آپ میرے آقا اور میں آپ کی کنیز، اے محبوب! میں آس لگائے بیٹھی ہوں، ایک بار میرے گھر میں قدم رنجہ فرما

اے محبوب! خدا کے واسطے

خواجہ غلام فرید : سرائکی زبان کے عظیم شاعر حضرت خواجہ غلام فرید (۱۸۳۵-۱۹۰۱ء) نے بھی سندھی میں کافیاں کہی ھیں۔ ایک کافی بطور نمونہ پیش کی جاتی ہے :-

عشق تنھنجي جا ھيُ انصاف، مان ظلم نيائيندس
تہ بہ تنھنجا ٿورا ڳائيندس

۱- سجدو جانب! تنھنجي جانب، تنھنجي گرد طواف
قدم قدم تي سيس نوائيندس

۲- ٻانھي گولي يار جي آھيان، ناھي فريد خلاف
انھن کي پائيندس خواہ نہ پائيندس

ترجمہ:

یہ تیرے عشق کا انصاف ہے، میں ظلم برداشت کروں گی
اور پھر بھی تیرا احسان مانوں گی

۱- اے محبوب! میرا سجدہ بھی تیری جانب اور میرا طواف بھی تیرے ھی ارد گرد
میں قدم قدم پر سر جھکاؤں گی

۲- اے فرید! میں محبوب کی کنیز اور باندی ھوں، اس میں کوئی شک و شبہہ نہیں ہے
میں سب کچھ انھی کو سمجھوں گی، خواہ سمجھ نہیں سکوں گی۔

بچل شاہ : سنہ ۱۸۰۷ء میں مانجھند ضلع دادو میں متولد ھوئے۔ سیر و سفر اور فقرا اور درویشوں سے ملاقات اور مصاحبت کے بعد سکھر آئے اور شہر سے مغرب کی جانب بیراج کے قریب آستانہ قائم کر کے رھنے لگے۔ یہ خطہ انھی کے نام سے اب "بچل شاہ کی میانی" کہلواتا

ھے - سنہ ۱۹۰۶ء میں انتقال کیا اور وھیں مدفون ھوئے۔ بیت کے بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کا کلام وحدت اور معرفت کا بحر عمیق ھے۔ ان کے دو بیت بطور نمونہ پیش کئے جاتے ھیں:-

پاڻ پنھنجو پاڻ ۾ جن ڏٺو نہ پيھي	جن لوگوں نے خود اپنے اندر سما کر اپنے آپ کو نہیں دیکھا
بچل ھن بناءَ جي ڪل تنين ڪيھي	اے بچل! ان کو اس مقام کا کیا علم ھوگا
وھامي ويئي، وچي گھڙيون ڏس گھڙيال جون	وقت گذر گیا، جاکر گھڑی کی سوئیاں دیکھ ۔

دنيا دو رنگي دادلي، ونشا وانگر نچي	یہ خوبصورت نازنین دو رنگی دنیا طوائف کی طرح ناچتی ھے
سھسين رنگ تماشا، ناز بحري بچي	سیکڑوں رنگ برنگ تماشے بھی دکھاتی ھے اور بلائیں بھی مسلط کرتی ھے
ڪو ورلو مرد ملاح ھن بلا کان بچي	کوئی بہادر مرد ھوگا جو اس بلا سے نجات حاصل کرسکے گا۔

ان کے علاوہ شکارپور کے محمد اکرم خان (وفات ۱۹۰۵ء)، فقیر احمد علی (وفات ۱۹۱۰ء) اور روھڑی کے نواب شاہ "سکایل" (وفات ۱۹۰۱ء)، میر جان اللہ شاہ ثالث (وفات شروع بیسویں صدی)، اور روھڑی کے ایک نواحی گاؤں کے باشندہ میر غلام نجف (وفات ۱۹۰۲ء) کافی اور بیت کے اچھے شاعر تھے۔ نیز لاڑکانہ ضلع کے حسین دیدڑ اور شاہ محمد دیدڑ بیت کے باکمال شاعر گذرے ھیں۔

حاجی خانن چنجنی: کافی کے بہترین شاعر تھے۔ قصبہ چنجنی ضلع لاڑکانہ کے باشندہ تھے۔ اسی برس کی عمر میں سنہ ۱۳۲۵ھ سے کچھ عرصہ بعد انتقال کیا۔ ان کی کافی کی خوبی یہ ہے کہ ہر مصرعہ مرصع ہوتا ہے یعنی اس کے تمام فقرے مقفیٰ ہوتے ہیں، اور اس سے ان کے کلام میں رنگینی اور دلکشی پیدا ہوتی ہے، اور سلاست اور روانی بھی متاثر نہیں ہوتی۔ نمونہ درج ذیل ہے:-

منھنجا سائین! ڳل لائین، توڙ نڀائين
سگھو موٽ سڪندي مران سور ۾
وجھ نہ وٿيون وصال ڪئون، جھاتي چاتيءَ منجھ پائين
رمز رلائين، نہ ڇپائين، وو يار

ترجمہ:

اے محبوب! مجھے گلے سے لگائیے، اور اخیر دم تک دوستی نبھائیے
جلدی واپس آجائیے، میں درد فراق میں مر رہی ہوں
وصال میں اتنے وقفے نہ ڈال، میرے سینہ کے اندر جھانک کر دیکھ
آنکھ سے آنکھ ملا، منہ نہ چھپا اے دوست

حضرت پیر صالح شاہ: حضرت پیر سید محمد صالح شاہ سجادہ نشین رانی پور، بھی کافی کے اچھے شاعر تھے۔ پاندھی آریسر (وفات ۱۹۰۰ء) اور اسماعیل فقیر (۱۹۰۲ء) بیت کے اچھے شاعر گذرے ہیں۔ ان کے علاوہ رمضان کمھار، مخدوم امین محمد، عثمان فقیر اور بیکس بھی بیت کے بلند پایہ شاعر تھے۔

مصری شاہ: نصرپور کے رضوی سادات میں سے تھے۔ والد کا نام بلند شاہ تھا۔ سندھی کے علاوہ فارسی اور عربی کی تعلیم بھی

حاصل کی تھی۔ سندھ کے مختلف شہروں کے علاوہ ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت بھی کی تھی۔ ولادت سنہ ۱۸۲۸ء میں اور وفات سنہ ۱۹۰۶ء میں ہوئی۔ کافی کے بے نظیر شاعر تھے۔ رس، رچاؤ، روانی اور تاثیر ان کی کافی کی خاص خوبیاں ہیں۔ ان کے کلام میں سندھی کے خالص الفاظ کے ساتھ فارسی اور عربی کے الفاظ کا حسین امتزاج بھی ہے۔ ان کی متعدد کافیاں غزل کے طرز پر ہیں اور غزل ہی کی طرح کافی کو تشبیہات و استعارات سے مزین کیا ہے۔ کافی کے علاوہ غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان کی کافی کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے:۔

جيجان جوڳي جاوي ويڙا، سمر سجوڙا سرت سبحان

۱۔ چيلهه چڪر ٻڌائون چمڙا، چوڏس چاڙهيائون چوگان

۲۔ آهه هريجن ان جي هردي، هرڪنهن مهل وتن حيران

۳۔ تڪيا تاڪي ترڪ ڪيائون، ترت طمع جا سڀ طولان

ترجمہ:

اے میری ماں! جوگی جاوا کی سمت میں اپنا اسباب سمیٹ کر چلے گئے۔ کمر کس لی اور کشتی کے اطراف بادبان تیار کر لئے۔ ان کے دلوں میں اپنے محبوب کی لگن ہے (اور محبوب کے حسن و ادا) پر ہر ہر لمحہ محو حیرت ہیں۔ ترک عیش و نشاط کر کے وہ (جوگی) چلے گئے۔

چھتو سانگی: ضلع لاڑکانہ کے صوفی شاعر چھتو فقیر سانگی (وفات ۱۸۹۲ء) کافی کے بہترین شاعر گذرے ہیں۔ ان کے کلام میں سادگی ہے، لیکن تاثیر سے خالی نہیں ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے:۔

هوند حال جي منهنجو ٻڌين، سڄ سوز ٽئي سهڻا سٽي

سو سور سانديون تو وتان، خاطر ڏنم تنهنجي ڪٽي

تنھنجي شوق کيو اھڙو چيتو، ڇا جو ڏندڻ، ڪنھن جي ڦڻي
گذري عمر گردش اندر برسر اچي اھڙي بڻي

ترجمہ :

اگر آپ میرا حال سنیں گے، تو سچ مچ آپ کے دل میں درد و سوز پیدا ہوگا
میں محض آپ کی وجہ سے سیکڑوں دکھ درد ساتھ لئے پھرتا ہوں
آپ کے شوق نے مجھے ایسا دیوانہ بنا دیا ہے کہ نہ مسواک کا پتہ ہے اور نہ لنگھی کا ہوش ہے
میری قسمت ہی کچھ ایسی ہے کہ پوری زندگی گردش کی نذر ہوگئی۔

چھتو سانگی نے ابیات بھی بہت اچھے کہے ہیں۔ ان کے کلام میں حسن و عشق کا ذکر اس کثرت سے ہے اور اس نہج پر ہے کہ بظاہر مجاز کا رنگ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے لیکن وہ چونکہ صوفی ہیں اور ان کا مسلک تصوف ہے، لہذا ان کے پیش نظر مجاز نہیں، بلکہ عین حقیقت ہے۔

شاہ نصیر: تصوف کے بڑے مبلغ، متعدد صوفی شعرا کے پیر طریقت نوشہرو فیروز کے بزرگ شاہ نصیرالدین نقشبندی (وفات ۱۹۰۰ء کے قریب) بلند پایہ صوفی شاعر گذرے ہیں۔ سندھی کے علاوہ فارسی، اردو اور سرائکی میں بھی نہایت ہی اعلیٰ پایہ کے اشعار کہے ہیں۔ روانی، اثرانگیزی اور نغمگی ان کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ان کی ایک کافی سے نمونہ کے طور پر کچھ بند پیش کئے جاتے ہیں۔

مست اکیون متوالڙيون تنھنجون، قتل کري دل کرن کباب

۱- ترس نہ تن کي کھڻ جو کوئي، اصل اٿن کم اھوئي
ماري ڏين پوءِ عشق عتاب

۲- کيفي نيڻ نصير خماري، شوخ و تن منجھہ شوق شکاري
ترت رکن آئي ڏاڍو تاب

ترجمہ:

تمھاری مستانی اور متوالی آنکھیں، قتل کرکے دل کو کباب کردیتی ھیں

۱- ذبح کرتے وقت ان کو ذرہ بھر رحم نہیں آتا، کیوں کہ ان کا کام ھی یہ ھے

مارتی خود ھیں اور پھر عشق کو معتوب بناتی ھیں

۲- اے نصیر! محبوب کی آنکھیں پر کیف اور مخمور ھیں، ان میں شوخی بھری ھوئی ھے اور ھمیشہ شکار کے شوق میں رھتی ھیں اور فوراً شکار کر لیتی ھیں۔

ان کے علاوہ میرعبدالقادر (ساکن متصل روھڑی، وفات ۱۳۳۲ھ) اور تاجپور کے لغاری خاندان کے نواب فقیر ولی محمد خان لغاری (وفات ۱۹۱۴ع) کافی کے اعلیٰ پایہ کے شاعر گذرے ھیں۔ فقیر ولی محمد خان کی ایک کافی کا نمونہ پیش کیا جاتا ھے:-

گڏيو رات محبوب سوئي، جنھن جي حسن ھئي دل موھي

۱- الفراق، وصال ٿي پيڙو، مليون اکيون اکين سان روئي
رنگ محل جي سير وساريو، دور دنيا جو سيوئي

ترجمہ:

رات وھی محبوب مل گئے، جن کے حسن نے دل کو موہ لیا ھے

۱- فراق، وصال سے بدل گیا، اور آنکھیں، آنکھوں سے رو رو کر ملیں، رنگ محل کی سیر نے اِس دنیا کے دور کو یکسر بھلا دیا۔

پیرل فقیر (وفات ۱۹۰۶ء)، پیر رشیدالدین صاحب‌العلم ثالث، پیر رشداللہ صاحب‌العلم رابع، سید امیرعلی شاہ، اللہ رکھیو ساکن حبیب کوٹ ضلع سکھر (وفات ۱۹۱۲ء)، رمضان واڈھو (۱۹۱۱ء)، فیض دریا شاہ ساکن ھنباہ ضلع سکھر (وفات ۱۹۰۷ء)، صاحب ڈنو شاہ سجادہ نشین درگاہ بلڑی شریف (وفات ۱۹۰۵ء)، وریل فقیر ابڑو ضلع لاڑکانہ (وفات ۱۹۱۸ء)، حافظ ھادی ڈنو ساکن ماڑی ضلع سکھر (وفات ۱۹۱۷ء)، خلیفہ چھٹہ درس تحصیل کھپرہ (وفات ۱۹۱۹ء)، اور حافظ عبداللہ تحصیل گھوڑا باری بیت اور کافی کے نامور شعرا گذرے ھیں۔ حافظ عبداللہ کی کافی فنی اعتبار سے درجۂ کمال کو پہنچی ھوئی ھے۔ ان کی ایک کافی سے نمونہ پیش کیا جاتا ھے:-

جيءُ جيءُ چوان جتن، جن مان پنهل پيارو

۱- جا ڳان ڏسان نہ جانی، جنهن جي ٻڌيس آءٌ ٻانهي
منهون حال تيو حيراني، هي هوت مان هٿن
کن کيچ نيو کوهيارو

ترجمہ:

میں جتوں کو لبیک لبیک کہتی ھوں، کیونکہ میرا پیارا پنھوں انھی میں سے ھے

۱- میں جب جاگی تو دیکھا کہ میرا محبوب موجود نہیں ھے، جس کی میں کنیز ھوں
میں حیران رہ گئی، میرے محبوب کو میرے ھاتھوں سے چھین کر کیچ لیجایا گیا تھا۔

آخری دور کے شعرا میں سے میاں ابوبکر ہالائی، قاضی کمال ساکن کڈھن، عبدالقادر ہالائی، بلند شاہ، عبداللہ فقیر، محمد عالم میمن حیدرآباد، منٹھار فقیر راجڑ (۱۹۳۸ء) اور لعلو رانک ضلع لاڑکانہ کے ہدایت علی تارک، بیت اور کافی کی شاعری میں اچھا مقام رکھتے ہیں۔ تارک نے عروضی شاعری میں بھی کافی طبع آزمائی کی ہے، اور نثر میں بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ سندھی کے علاوہ فارسی، عربی، سرائیکی، پنجابی اور اردو میں بھی شعر کہا ہے۔ نظم اور نثر میں تقریباً دو سو کتابیں تصنیف کیں۔ سندھی زبان کے بے نظیر شاعر ہیں۔ ان کی ایک کافی سے نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

اچي مل يار، اي منٺار، توکان ڌار، دم نہ سري
هلي هڪ وار، ڏي آڌار، ٿو بيمار عشق مري

۱- جگر ٽوڙي، تون منهن موڙي، ڇني ڇوڙي وئين ڇا کان
محبت آر، تنهنجي تار، عشق آزار، آندو اري

۲- سندء صورت، مٺي مورت، آهي عبرت، هنئين حيرت
نظر نروار، گل رخسار، ٿو اظهار، نور پري

ترجمہ:

اے محبوب! دل کے سکون آ کر مل لے، تیرے سوا ایک گھڑی بھی نہیں گذرتی
ایک بار آ کر دلاسہ دے کیونکہ بیمار عشق مر رہا ہے

۱- جگر کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے، منہہ موڑ کے، محبت توڑ کے کہاں چلے گئے
محبت تکیہ ہے، آسرا ہے، اور عشق آزار ہے جس نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے

۲- تمہاری صورت دلکش مورت ہے، عبرت کا مقام ہے اور دل حیران ہے

آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، سامنے گل رخسار ہے، اور نور کی تجلیاں ظاہر ہو رہی ہیں

عروضی شعرا میں سے میر علی نواز علوی، میر عبدالحسین سانگی، سید فاضل شاہ اور شمس العلما میرزا قلیچ بیگ کافی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ مشہور فقیہہ، عالم اور حضرت علامہ عبدالغفور ہمایونی (۱۳۳۶ھ) نے بھی شعر گوئی کی ہے۔ غزلیں بھی کہی ہیں اور کافیاں بھی۔ ان کے کلام میں بے پناہ روانی اور سوز و گداز ہے۔ ان کی ایک کافی میں سے نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

تنهنجي صورت گل گلاب چوان، يا ملڪ سندو مهتاب چوان

۱- تنهنجي منهن مٺي کي ماه چوان، يا مظهر نور الہ' چوان
يا مسجد جو محراب چوان

۲- تنهنجي قد سڌي کي ڪان چوان، يا لفظ الف ايران چوان
يا سرو سهي جو شان چوان

ترجمہ:

میں تیری صورت کو گلاب کا گل کہوں، یا دنیا کا ماھتاب کہوں

۱- تیرے دلکش چہرہ کو چاند کہوں، یا اللہ کے نور کا مظہر کہوں
یا مسجد کا محراب کہوں

۲- تیرے سیدھے قد کو تیر کہوں، یا ایران کے لفظ کا الف کہوں
یا سرو سہی کی شان کہوں

تحصیل شکارپور کے صوفی بڈھڑو فقیر (۱۹۳۹ء)، قصبۂ گھوری تحصیل امرکوٹ کے حافظ خان محمد ملون (وفات ۱۹۴۶ء) اور

گنداواہ بلوچستان کے صوفی سید رکھیل شاہ کافی کے بلند پایہ شاعر گذرے ھیں۔ سید رکھیل شاہ کا کلام بلوچستان کے علاقہ کچھی کی سندھی کا عمدہ نمونہ ھے۔ ان کے کلام میں سندھی کے الفاظ کے ساتھہ بلوچی کے الفاظ کا امتزاج بھی ھے۔ ایک کافی سے نمونہ پیش کیا جاتا ھے:-

وجي ٿيس درد ۾ داخل، ڏنم درياه ٽو ٻوڙي
نڪا سنگت، نڪو ساٿي، لا ڳاها سڀ ڇڏيم توڙي

۱- اهڙي آويڙ آ ڪن ۾، ڏسڻ سان جان ٿي ٿڙڪي
نه ڊڄ دل ٿي چوي توڪل، متان محبوب منهن موڙي

ترجمہ:

درد عشق گویا ایک دریا ھے، میں جب اس میں داخل ھوا تو وہ مجھے ڈبونے لگا

نہ کوئی دوست تھا نہ ساتھی، میں نے تمام تعلقات توڑ ڈالے

گرداب کی گرفت ایسی سخت ھے کہ دیکھتے ھی جان لرزنے لگتی ھے

لیکن دل کہتا ھے کہ خوف نہ کر، توکل کر، ورنہ محبوب منھہ پھیر لے گا۔

جیہا تحصیل گڑھی یاسین کے نبن فقیر (۱۸۲۹ء-۱۹۲۹ء) بھی اچھے صوفی شاعر گذرے ھیں۔ ان کے بیت بھی اچھے ھیں اور کافی میں بھی رس اور رچاؤ ھے۔ تصوف کے نکات کے علاوہ ان کے کلام میں حسن و عشق کا ذکر بھی ھے۔ آنکھوں کے متعلق مختلف شعرا نے اپنے اپنے تاثرات بیان کئے ھیں، لیکن نبن فقیر نے آنکھوں کی عادت کے متعلق جو تاثر بیان کیا ھے، وہ درج ذیل ھے:-

اکین کي آهن عجب جهڙيون عادتون،	آنکھوں کی عادت بھی عجیب ہے
کيرايو کوهن ٽئون ڏسي پر کيو پهڪن	کوسوں کے فاصلے سے دمکتی ہوئی نظر آتی ہیں
نبن نيٺ وڃي اڙجن، دلبر سندي دام ۾	اے نبن! آخر جا کر محبوب کے دام میں پھنس جاتی ہیں۔

درگاہ خانگڑھ (متصل گھوٹکی، تحصیل میرپور ماتھیلو) کے بانی حضرت مولانا احمد یار صاحب (وفات ۱۹۳۳ء) بھی بلند پایہ شاعر گذرے ہیں۔ ان کا کلام بیت، سی حرفی، مناجات، مدح، مولود اور کافی پر مشتمل ہے۔ ان کے کلام میں تجنیس حرفی اور مرصع فقروں (اندرونی قافیوں) کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کلام تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ کافی کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

اسان دين ڪفر کان دور ميان۔ هڪ وحدت ۾ وهلور ميان

۱- ڪڏان ملا هون ڪڏان قاضي هون۔ ڪڏان رندي رمز تي راضي هون
ڪڏان موج ٿيون منصور ميان

ترجمہ:

اے دوست! ہم دین اور کفر سے دور ہیں۔ ہم وحدت کے شیدائی ہیں

میں کبھی ملا ہوں، کبھی قاضی ہوں۔ اور کبھی رندی رمز پر راضی ہوں

کبھی موج آجاتی ہے تو منصور بن جاتا ہوں

شکارپور کے مولا بخش "مسکین" بھٹو (وفات ۱۹۵۳ء) بیت کے باکمال شاعر گذرے ہیں۔ ان کا خصوصی موضوع اخلاقیات رہا ہے،

لیکن کبھی حسن و عشق کے ذکر سے بھی اپنے کلام کا حسن دوبالا کرتے رہے ہیں۔ نمونہ درج ذیل ہے:۔

اڄ سارينديءَ سڄڻ کي ڳوڙها پيم ڳڙي	آج دوست کو یاد کرتے ہوئے آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے
ناهي آرام عجيب ري گهايل کي تہ گهڙي	محبوب کے بغیر اس مجروح کو ایک پل بھی آرام نہیں ہے
لالڻ اڄ لڙي، تہ وڃي سور سندا کيون	اے محبوب! آجا، کہ یہ دکھ درد دور ہوجائے۔

اس دور میں متعدد ہندو ویدانتی شاعر بھی گذرے ہیں۔ مثلاً صوفی آسورام ہالا، جیوت سنگھہ قنبر (دیہانت ۱۸۹۹)، دیوان بھوج راج لاڑکانہ، موھن فقیر لاڑکانہ، ھری سنگھہ عاصی لاڑکانہ اور ایسرداس اسیر روھڑی (دیہانت ۱۸۹۰ء) وغیرہ۔ موھن فقیر کی کافی سے نمونہ پیش کیا جاتا ہے:۔

تارون تہ تک تار جو، متان گهير گهاتيءَ کان گهرين
۱۔ کل اٿئي کن کاھ جي، چڪ دھشتي درياہ جي
رک خبر آگاھ جي، متان زور سان اڇلئي ذرين

ترجمہ:

پانی کے تیز بہاؤ میں تیرنا سیکھہ، اس خطرناک گھاٹ سے پانی میں داخل نہیں ہونا

۱۔ تجھے گرداب کا کوئی پتہ بھی ہے، اور دریا کی ھیبتناک کشش کا

ھشیار رھنا، ایسا نہ ہو کہ پانی زور سے تجھے اچھال کر دور پھینک دے۔

مانجھو تحصیل کوٹری کے بھاروانی خاندان میں بھی متعدد شاعر پیدا ہوئے، مثلاً نہال لال (۱۸۶۵ء)، وشنداس (۱۹۲۹ء)، سریچند (۱۹۳۲ء) اور اودھو داس (۱۹۳۶ء)۔ نہال لال کا ایک بیت بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

جن کي ڦٽن ڦٽيو، چڪن تنهين جا چاڪ	جو زخموں سے چور ہیں اور ان کے زخم رس رہے ہیں انہوں نے
ملڻ ڪاڻ ملام جي، وڏا ڪن سي واڪ	مرہم حاصل کرنے کے لئے بڑی کوشش کی۔ لیکن اے نہال!
نهال حق جي هاڪ، سڻي سي سرها ٿيا	جنھوں نے حق کا آوازہ سنا (یعنی جنہیں حقیقت سے آگاھی حاصل ہوئی) دراصل وھی خوش اور مطمئن ھیں۔

نم منگنہار (میراثی): لس بیلہ کے شہر تھل کے باشندہ تھے۔ سنہ ۱۸۹۶ء کے قریب انتقال کیا، آپ کو نسب نامے، جنگیں، سخن فہمی اور علم مجلس کے تمام نکتے ازبر تھے۔ ان کا شمار لس بیلہ کے بڑے شعرا میں ہوتا ھے۔ ایک بیت بطور نمونہ پیش کیا جاتا ھے:-

مون تان تو سين هت ڪڏهن ڪينو ڪونه ڪيو؛	میرے محبوب! میں نے تم سے کبھی کینہ نہیں رکھا۔
هن منهنجي حال جو دارون تو وٽ دوس؛	میرے دوست! میرے درد کی دوا تمھارے پاس ھے۔
ويندس ڪيچ ٻروچ؛ متڻ مون کي ڇڏئين	اے بلوچ! میں بھی کیچ چلوں گی مجھے چھوڑ نہیں دینا۔

نم قبیلے میں ان کے علاوہ بھی اس دور میں متعدد شعراء گذرے ھیں۔

همت علی شاہ: روھڑی کے باشندہ تھے۔ تیرھویں صدی ھجری کے آخر میں وفات پائی۔ لولی، گھڑولی اور سی حرفی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ ان کی ایک لولی میں سے ایک بند پیش کیا جاتا ھے، جو سی حرفی کی صورت میں ہے :-

ت۔ تهدل تو سان سپرين، منهنجو پرتئون پيچ پيو ؛
لکيو روز الست کئون، منهنجو تو سان ليک هيو ،
سورن سوز فراق جي، منهنجو چريو چت ڪيو ؛
دلبر ڏيان ڏ ريو، ڪر مهر سون مسڪين تي .

ترجمہ :

حرف ت۔ اے محبوب! میں نے دل کی گہرائیوں کے ساتھ تم سے محبت کا رشتہ قائم کیا ھے۔
روز ازل سے کاتب تقدیر نے میری قسمت تمہارے ساتھ وابستہ کردی ھے۔
درد فراق نے مجھے دیوانہ بنا دیا ھے۔
اے محبوب! مجھ مسکین پر شفقت سے توجہ فرما۔ ھوئے لولی،
تمہیں خوش و خرم اور ھنستا ھوا دیکھوں، ھوئے لولی۔

حاجی عبداللہ ڈکھن: ان کے علاوہ متعدد شعرا نے سندھی بیت کے مختلف اقسام مثلاً ھفتے، بارہ ماہ، سی حرفی اور لولی وغیرہ پر طبع آزمائی کی۔ جن میں حاجی عبداللہ ڈکھن کا نام خاص طور پر قابل ذکر ھے۔ وہ قصبہ اللہ رکھیو جلبانی ضلع لاڑکانہ (وفات ۱۹۳۰ء) کے باشندہ تھے۔ ان کی "ھفتہ" سے متعلق لکھی ھوئی ایک نظم میں سے ایک بند بطور نمونہ پیش کیا جاتا ھے :-

سومر ڏينهن سڪان ۽ ساريان، مارن لئي ٿي هنجون هاريان
ماڙين منجهه گهڙيون ڪيئن گهاريان، پانيان آتش جا آڙاهه
مارو ملڙا ميل الله

ترجمہ :

پیر کے دن اشتیاق سے یاد کرتی ، اور ماروؤں کے لئے آنسو بہاتی ہوں

قصر شاہی کے اندر گھڑیاں کیسے گذاروں، میں تو اسے آگ کا جہنم سمجھتی ہوں

اے اللہ ! مجھے میرے پیارے ماروؤں سے ملادے۔

ان کے علاوہ علی محمد جسکانی ، نوح پنہور ، سالار بلی اور دیگر شعرا نے بھی "ھفتے" کہے ھیں۔ صاحبڈنو شاہ، پیرل کالرو ، عارب فقیر ، بیدل فقیر ، غلام حیدر ، رمضان واڈھو اور دیگر شعرا نے "دن"، "راتیں" اور "بارہ مہینے" کہے ھیں۔ درگاہ بلڑی کے سجادہ نشین صاحبڈنو شاہ (وفات ۱۹۱۵ء) نے "راتوں" کے سلسلہ میں جو ابیات کہے ھیں، ان میں سے ایک بیت پیش کیا جاتا ہے :-

ڏنا ڏهين ۽ جا مون ڏوٿين هي ۽ ڏس
وليون وڻ ڦلاريا، نڪيا للر لس
اچي ڪين آسن مان چيڙن جي چس
پڪا، گلر، گولون، ڪيون لاليون ليار

میں نے دسویں تاریخ کے مسلسلے میں ڈوتھیوں (ماروؤں) کو یہ باتیں بتادی ھیں کہ بیل اور بوٹے پھل پھول گئے، اور للر اور لس نکل آئے۔ چبھڑ میں جو مزیدار ذائقہ ہے وہ آم میں کہاں ہے۔ گلر اور گولوں پک گئے ھیں اور لیار پک کر

وساریان نہ وسرن مون پائر جا پنھوار
سدا سومرا ! سک وسن سي سنگھار

سرخ ھوچکا ھے(۱)۔ میں پائر (۲) کے پنھواروں کو بھلانے کی کوشش کرتی ھوں لیکن وہ بھلائے نہیں جاسکتے۔ اے سومرا ! خدا کرے میرے سنگھار ھمیشہ خوش و خرم رھیں۔

چاکرخان رستمانی بلوچ ساکن چھنی تحصیل جوھی ضلع دادو (وفات ۱۹۳۰ء) شاہ محمد دیدڑ، حسین دیدڑ، عارف شاہ (دادو) اور دیگر شعرا اور سخن فھموں نے ھنر، ڈور، سنگھار وغیرہ کے ابیات کہے ھیں۔ متعدد داستان گو بھی شاعر تھے، جنھوں نے مشھور رومانی داستانیں اور قصے منظوم کئے ھیں۔ ان میں سے حفیظ تیونو (وفات ۱۸۸۵ء) بلند پایہ شاعر گذرے ھیں، جن کا منظوم کردہ "مومل رانو" مرزا قلیچ بیگ نے چھپوا کر شایع کیا۔ اس کے علاوہ حفیظ نے عمر مارئی، سوھنی مہینوال اور کامسین کامروپ کے قصے بھی منظوم کئے۔ محمد عارف کلھوڑہ نے بھی دو داستانیں سسئی پنھوں اور عمر مارئی منظوم کیں۔ عمر مارئی کی داستان غیرمکمل رہ گئی تھی، جو ان کے فرزند غلام محمد نے مکمل کی۔ ایوب ساکن میاں جو گوٹھ تحصیل شکارپور نے شمشاد کافر کا قصہ بیان کیا، جو عام طور پر عثمان کلھوڑہ سے منسوب کیا جاتا ھے۔ فقیر محمد برڑو ساکن گٹھڑ تحصیل قنبر نے "مومل میندھرو" منظوم کیا۔ فقیر محمد ولد فتح محمد ماچھی ساکن ڈڑو ماچھی تحصیل ککڑ (وفات ۱۳۱۶ھ) نے متعدد داستانیں

---

(۱) یہ تھر کے خود رو جنگلی پھلوں کے نام ھیں۔
(۲) تھر کا وہ علاقہ جھاں مارو بستے ھیں۔

منظوم کیں۔ پیرو فقیر نے "سوھنی مہینوال" کا قصہ منظوم کیا۔ موریو فقیر ساکن ٹنڈو آدم نے "سسئی پنھوں" منظوم کیا۔ محمد رحیم عاجز ولد سلیمان راجڑ ساکن پیر جو گوٹھ نے ایک عشقیہ داستان پر مشتمل مثنوی لکھی۔

ساون فقیر: ساون فقیر کا نام "نڑ" (بانسری) کے بیت کے سلسلہ میں آتا ھے۔ قصبۂ مراد علی خان ٹالپور ضلع تھرپارکر کے باشندہ اور قوم کے خاصخیلی تھے۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں انتقال کیا۔ "نڑ۔ بیت" کی محفلوں میں اپنے ابیات گاتے تھے۔ ان کے ابیات طویل ھیں اور ان میں الفاظ کا اعادہ زیادہ ھے۔ الفاظ کا ذخیرہ بھی کافی ھے۔ قافیہ مروج استعمال کرتے ھیں۔ سوز، درد اور گداز ان کے بیت کی خاص خوبی ھے۔ ان کا ایک چھوٹا سا بیت بطور نمونہ پیش کیا جاتا ھے:۔

نکو علم، نکو عقل، نکا اکر سندي اوٽ،	نہ علم ھے، نہ عقل ھے، اور نہ ھی الفاظ ھیں
اولانیي عشق جي چاڙھي آھیان، چوٽ،	عشق نے شعلہ نے انتہا تک پہنچا دیا ھے
ھنیون وریو حق ڏي، من کائي موٽ،	دل کا رخ حق کی جانب ھے، اب مشکل ھی سے باز آئے
امر ساڻ الله جي کين جھلیندا کوٽ،	الله کے حکم سے حصار نہیں روکیں گے
حسن میر حسین کي مون روئي کئي رپوٽ	میں نے حسن اور حسین سے رو کر شکایت کی ھے

سرهي ڪندو سانوڻ چئي سٺو	ساون کہتا ہے کہ پیارے محمد
محمد گھوٽ	بہت ھی اچھا کریں گے
ڇارين جا ڇاسوت، مٿيءَ سڀ ملهايا	اس محبوب نے حقیر لوگوں کو بھی نواز دیا ہے۔

ساون کے ساتھی مولابخش خاصخیلی (وفات ۱۹۴۰ء کے قریب)، محمود شیخ (وفات ۱۹۳۲ء کے قریب)، بچایو فقیر رند (۱۹۵۴ء)، اللہ ڈنو نوناری (۱۹۳۰ء)، جمعہ بارچ (وفات ۱۹۴۵ء کے قریب) اور مدو فقیر بھی "نڑ - بیت" کے شاعر تھے۔

باب ہشتم

فصل اول

مولود، مدح، مناجات، معجزہ اور مناظرہ

مولود

سندھ میں مولود، شاعری کی اس صنف کو کہتے ہیں جس میں حضور پرنور محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح گوئی و ستائش گری کی جاتی ہے۔ مولود کے لغوی معنی ہیں: نوزائیدہ بچہ۔ اس صنف پر یہ نام اس لئے پڑگیا کہ اس میں حضور صلعم کی ولادت با سعادت کا حال بیان کیا جاتا ہے اور اس پر مسرت و شادمانی کا اظہار ہوتا ہے۔ نیز حضور صلعم کی ذات با برکات کے فضائل و محاسن کا بیان ہوتا ہے، مدینہ کی زیارت کے لئے اشتیاق اور بے تابی ہوتی ہے، مسجد نبوی کی فضیلت اور عظمت، اور اس کے مناروں کا ذکر ہوتا ہے۔ بعض مولودوں میں پنجتن (صلواۃ اللہ علیہم اجمعین) کے مناقب بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ فارسی میں اس قسم کے شعر کو نعت کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کی نوعیت غزل جیسی ہوتی ہے، اور مولود کی ساخت وائی یا کافی جیسی۔ بعض مولود عروض کی بحروں اور وزنوں میں بھی کہے گئے ہیں۔ وائی، کافی اور مولود میں فرق یہ ہے کہ وائی اور کافی ساز و سرود کے ساتھ گائی جاتی ہے اور مولود الحان سے پڑھا جاتا ہے۔

کلہوڑہ دور

سب سے پہلے اس قسم کا مضمون شاہ عنایت رضوی کی بعض وائیوں میں پایا گیا ہے۔ ایسی ہی ایک وائی میں سے دو بیت بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:۔

منهنجي سيد سار لهندو، مون کي آهي اميد الله ۾

۱۔ سجدي ۾ پئي سپرين، زاري زور کندو
مون کي آهي اميد الله ۾

۲۔ امت کارڻ احمد اچي، پر مل پاڪ پسندو
مون کي آهي اميد الله ۾

ترجمہ:

سید مجھے یاد فرمائیں گے، مجھے اللہ سے یہی امید ہے

۱۔ محبوب سجدہ میں سر رکھ کر اظہار عجز بھی کریں گے اور اصرار بھی
مجھے اللہ سے یہی امید ہے

۲۔ احمد صلعم امت کی شفاعت کے لئے خدا تعالیٰ کے سامنے آئیں گے
مجھے اللہ سے یہی امید ہے۔

شاہ عنایت رضوی کے بعد متعدد شعرا نے اپنے آپ کو مولود کے لئے مخصوص کر لیا۔ جن میں سب سے پہلے مخدوم عبدالرؤف بھٹی کا نام آتا ہے۔

مخدوم عبدالرؤف بھٹی: ہالا کے بزرگ تھے۔ سنہ ۱۶۸۲ء کے قریب ہالا میں متولد ہوئے اور سنہ ۱۷۵۲ء میں مدینہ طیبہ میں رحلت فرمائی۔ ان کی مدحیں اور مولود مشہور ہیں، جن میں حضور انور رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کی توصیف ہے اور ان کے روضۂ اقدس کی زیارت کے لئے اشتیاق کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس قسم کے مضامین اگرچہ ان کے پیشرو شعرا کے کلام میں بھی پائے جاتے ہیں، لیکن

مولود باقاعدہ شاعری کی ایک صنف کی حیثیت سے مخدوم صاحب ھی کے کلام میں موجود ھے۔ مخدوم صاحب کے مولود فنی اعتبار سے نہایت ھی پختہ ھیں، جس سے قیاس کیا جاتا ھے کہ یہ صنف پہلے سے موجود تھی اور سندھ میں مقبول عام تھی۔

فنی لحاظ سے مولود، کافی سے تعلق رکھنے والی ایک صنف ھے۔ کافی ساز پر گائی جاتی ھے اور مولود الحان سے سنایا جاتا ھے۔ مولود، آٹھ دس مولود خوان مل کر سناتے ھیں، لیکن اب یہ رواج مٹتا جا رہا ھے۔ آجکل ایک آدمی بھی مولود سناتا ھے۔

مخدوم صاحب کی مدحیں الف اشباع کے قافیہ پر ھیں، اور متعدد مولود عروض کی بحروں میں بھی موزوں کئے ھیں۔ مثلاً :-

محمد ڏسي من ٺاريان، جنهن لئي اڪندو آهيان	محمد کو دیکھ کر اپنا دل خوش کروں، جن کے لئے مشتاق ھوں۔
سيد ڏسي سڪ لاهيان، جنهن لئي اڪندو آهيان	سید کو دیکھ کر اشتیاق پورا کروں، جن کے لئے مشتاق ھوں۔

مذکورہ بالا مولود بحر رجز مثمن سالم میں ھے۔ اور مندرجۂ ذیل مولود بحر ہزج مثمن سالم میں :-

ڪري سينگار اڄ آيو، عجب اسرار، بسم الله	آج محبوب سنگھار کر کے آئے ھیں عجب اسرار ھے، مرحبا بسم اللہ

اس سے ثابت ھوتا ھے کہ کلہوڑہ دور میں عروض کی بحر و اوزان پر بھی سندھی میں شعر کہا جاتا تھا۔ اگرچہ مخدوم صاحب نے مولودوں میں عروض کے بحور و اوزان اختیار کئے ھیں، تاھم فنی ساخت وائی اور کافی کے طرز پر ھے۔ نمونہ کے طور پر ان کے

ایک مولود کا مطلع پیش کیا جاتا ھے، جو بحر ھزج مثمن سالم میں ھے :-

منارا مير مرسل جا ڏسان شل ڏيهہ سڀ ڏوري
هلي هالا مٽيان ميسا، انڙپور کي ڇڏيان اوري

ترجمہ :

خدا کرے تمام ممالک کو طے کر کے جاؤں اور میر مرسل کے منارے جا کر دیکھوں۔ ھالا سے چلوں، اور میسا اور انڑپور سے گذر جاؤں۔

ٹالپور دور

اس دور میں بھی مولود کے متعدد شاعر گذرے ھیں۔ حضرت سچل سرمست کی بعض کافیاں حضور انور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا میں ھیں۔ ایسی ھی ایک نعتیہ غزل کا نمونہ، جو موضوع کے اعتبار سے مولود سے مماثلت رکھتا ھے، پیش خدمت ھے :-

يا رسول الله جي روضي مقدس کي ڪر سلام
سو ڪندو واهر ولهن جي هيءُ سندس آهي انجام
آ اڙين جو آسرو ميرل مديني ۾ مدام
حشر ۾ حامي اسان جو چؤ تنهين تون سلام
بوبڪر شاهہ و عمر، عثمان علي حسنين پاڪ
سان يقيني ٿي سندن گولو الله جو آ غلام
رک صدق ثابوت سڀ تنهن ۾ ٿيندءِ مشڪل آسان
ڪربلا جو آهہ سيد ضامنم روز تمام
لا فتیٰ الا علي لا سيف الا ذوالفقار
سڪ منجهئون سچل چوي تحقيق تن جو سان غلام

ترجمہ :

حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر سلام عرض کر

ان کا وعدہ ہے کہ وہ ضعیفوں کی مدد فرمائیں گے

مدینہ کے میر ہمیشہ سے بے سہاروں کے سہارا ہیں

وہ حشر میں ہماری حمایت کریں گے، تو ان پر درود اور سلام بھیج

ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، علی المرتضیٰ اور حضرات حسنین کا پوری عقیدت کے ساتھ غلام بنجا، یہ اللہ کی ہدایت ہے

اپنے اعتقاد میں خلوص پیدا کر، اس سے تیری مشکل آسان ہو جائے گی

کربلا کے سید روز قیامت کے ضامن ہیں

لا فتیٰ الا علی، لا سیف الا ذوالفقار

سچل محبت اور عقیدت سے کہتا ہے کہ میں ان کا غلام ہوں۔

کافی گو شعرا میں سے فتح فقیر نے بھی مولود کہے ہیں۔

حضرت پیر پاگارہ محمد راشد صاحب کے مولود بھی ملے ہیں۔ نمونہ درج ذیل ہے :-

رمي راحم يا رهبرا، پاڻئون ڪريو پونواري

۱- حيرت تنهنجي حسن جي، آهي تارن ۾ تڪراري

۲- سج چنډ سجدي ۾ پيو، تنهنجي سونهن ڏسي سونهاري

ترجمہ:

اے راحم، اے راہبر! آپ خود آکر میری خبر گیری کیجئے

۱- ستارے آپ کا حسن دیکھ کر بار بار حیرت زدہ رہ گئے

۲- سورج اور چاند تیرا مقدس حسن دیکھ کر سر بسجود ہو گئے۔

ملا صاحبڈنہ شکارپوری (۱) کے مولود بھی ملے ہیں، جن کی ہیئت غزل کی سی ہے۔ ایک مولود بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

گھوریان جنسار جنت جا، گھوریان گلشن بهشتن جا
گھوریان سڀ عيش عالم جا، بنا ديدار ساجن جي

۱- عجب لنوء کا پرينء لائي، آئي وٽي سندن وائي
لڳي خوش کانہ ہي ڪائي، سوا محبت سپرين جي

۲- من له المولیٰ فله الکل، جنين سمجهيو، تنين حاصل
انهن آسان هر مشڪل، حمايت ساڻ هوتن جي

۳- اها ٺي وائي شهر واسي، برهہ ہر ڪو مرڻ باسي
سيد تن ڪون ناهي پاسي، ثمر سوري سنباهن جي

۴- محل ماڙيون دنيا دولت ۽ حجرا زيور و زينت
ايندا ڪم ڪين منجهہ قيامت، پرين درسن ڏيکائين جي

۵- اچي صاحبڏنا محبن، ڏنو دارون سندو دردن
تيو وهمن ڪان خالي من، تيس آڏو عجيبن جي

ترجمہ:

میں محبوب کے دیدار کے بغیر بہشت کی آرائش و زیبائش،
اس کے باغ و بستان اور تمام دنیا کے عیش و عشرت کو ٹھکراتا ہوں

---

(۱) ملا صاحبڈنہ-شکارپور میں ایک مکتب میں پڑھاتے تھے۔ حضرت شاہ فقیراللہ علوی سے عقیدت رکھتے تھے۔ اس دور کے حکمران ان کی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ سنہ ۱۸۳۴ء کے قریب انتقال کیا۔ فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ سندھی میں ان کی دو مدحیں اور چند مولود دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کی مدح "اغثنی یا سیدا" تمام سندھ میں مشہور و مقبول ہے۔

۱- محبوب نے محبت کی ایسی عجیب لذت عطا فرمائی ہے کہ اٹھتے بیٹھتے
اسی کی یاد اور اسی کی بات ہے، اس کی محبت کے بغیر اور کوئی چیز اچھی نہیں لگتی

۲- من لہالمولیٰ فلہ الکل کا مقصد جنھوں نے سمجھا ہے، انھی کو حاصل ہوا ہے
محبوب کی مدد سے ان کی ہر مشکل آسان ہے

۳- شہر بھر میں یہی صدا سننے میں آتی ہے کہ کوئی ہے، جو عشق میں مرنا قبول کرے؟
سید آن سے دور نہیں ہیں، جو سولی پر چڑھنے سے نہیں ڈرتے

۴- یہ محل، یہ قصر، یہ دنیا، یہ دولت، یہ مکان، یہ زیور اور یہ زیب و زینت
قیامت کے روز کام نہیں آئیں گے، صرف محبوب کا دیدار کام آئے گا

۵- اے صاحبڈنہ! محبوب نے خود آ کر میرے درد کا مداوا کیا
اور جب میں محبوب کے قرب سے سرفراز ہوا تو دل سے تمام خدشے اور وسوسے نکل گئے

مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ دیگر متعدد شعرا نے بھی مولود کہے ہیں۔ مثلاً قائم الدین، نور محمد، امیر بخش، عثمان، فیض محمد، سومر، اللہ رکھیہ اور خلیفہ کرم اللہ وغیرہ۔ آخر میں خلیفہ کرم اللہ(۱)

---

(۱) شکارپور کے باشندہ تھے۔ سن رسیدہ ہو کر سنہ ۱۸۵۴ء میں انتقال کیا۔ بڑے عالم و فاضل اور سندھی اور سرائیکی کے اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے۔ کافی، مولود اور بیت کہے ہیں، غزلیں بھی کہی ہیں۔ "کوا اور مینا" کے عنوان سے ان کا ایک منظوم مناظرہ بھی ملا ہے۔

کا ایک مولود بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

رس مشکل ویل سوچارا نبي
توکي آھ ٹو سنپاريان سردار نبي

۱- آزاري آھون کري، تنھنجو غور کيم غم خوارا
۲- معافي کيو منھنجا ہرين، جيکي ڈوہ کيم ڈتارا
۳- سٹي سڈ عليل جا، آھ تون سيد سالارا
۴- قريشي کرم‌الله کي کيو آ جو کٹون آزارا

ترجمہ:

اے پیارے نبی! مشکل کے وقت میں فریاد رسی فرمائیے
اے نبی سردار! میں آپ کو یاد کرتا ہوں اور پکارتا ہوں

۱- اے غمخوار! میں درد مند فریاد کرتا ہوں اور آپ کو یاد کرتا ہوں

۲- اے میرے محبوب، اے میرے داتا! مجھ سے جو خطائیں سرزد ہوئی ہیں، وہ معاف کردیجیئے

۳- اے سید سالار! آئیے اور بیمار کی پکار سنئے

۴- اے قریشی! کرم‌الله کو دکھ درد سے نجات عطا فرمائیے۔

برطانوی دور

اس دور میں متعدد شعرا نے مولود کہے ہیں۔ مثلاً سید قنبر علی شاہ، خلیفہ عبداللہ، یاسین شاہ مقیم، پیر مہدی شاہ، محمد اکرم خان، کرموں اور حضرت مولانا عبدالغفور ھمایونی وغیرہ۔

حضرت مولانا عبدالغفور ھمایونی: سچے عاشق رسول تھے۔ بڑے عالم و فاضل ہونے کے ساتھ بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ ان کا تمام کلام عشق رسول کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ نعتیہ کافیاں بھی کہی ہیں اور غزلیں بھی۔ ان کی ایک شاہکار نعتیہ

غزل پیش کی جاتی ھے :-

تنهنجي زلف جي بند ڪمند وڌا، زندان هزارين، مان نہ رڳو
تنهنجي شاهي دسترخوان مٿي مهمان هزارين، مان نہ رڳو
ڪي ٿي گهائل تنهنجي گهور سندا مخمور غفور سرور سندا
تنهنجي نور ظهور حضور سندا نگران هزارين، مان نہ رڳو
ڪي ٿي ابرو تيغ شهيد ڪيا، ڪي ٿي ناز مزيد مريد ڪيا
ريءَ ناڻي ديد خريد ڪيا سلطان هزارين، مان نہ رڳو
تنهنجي جلوي جمال جي عشوه گري ڪيا ملڪ مطيع وسيع وري
ٿيا جن ملائڪ حور پري غلمان هزارين ، مان نہ رڳو
ڪي نوڪر چاڪر ۽ اڪبر ڪي خادم هن خاقان نوڪر
سوين در تي دارا ۽ سڪندر دربان هزارين، مان نہ رڳو
اي ماه لقا محبوب مٺا تنهنجي ناز ادا تان جان فدا
ٿيا دامن گير اسير گدا حيران هزارين ، مان نہ رڳو
دلبر پيارا ڪر نوري نظر آهين سرور عالم جن و بشر
تو تان قربان تارا شمس قمر مفتون هزارين ، مان نہ رڳو

ترجمہ :

تیری زلف کی زنجیر نے کمندیں پھینک کر ہزاروں انسانوں
کو زندان میں ڈال دیا، صرف مجھے ھی نہیں
تیرے شاھی دسترخوان پر ہزاروں مہمان ھیں، صرف میں ھی
نہیں ھوں
تیرے گھورنے سے کئی لوگوں کے دل مجروح ھو گئے اور
کئی لوگوں نے کیف و سرور حاصل کیا
تیرے نور، ظہور اور حضور کے دیکھنے والے ہزاروں ھیں،
صرف میں ھی نہیں ھوں

تیغ ابرو نے کئی لوگوں کو شہید کر دیا اور ناز و ادا نے
اور بھی گرویدہ بنا لیا
تیری نگاھوں نے ھزاروں سلطانوں کو بلا قیمت خرید لیا،
صرف مجھے ھی نہیں
تیرے حسن کے جلوہ اور عشوہ گری نے دنیا بھر کو مطیع
بنا دیا
ھزاروں جنوں، فرشتوں، حوروں، پریوں اور غلمانوں کو بھی،
صرف مجھے ھی نہیں
کئی اکابر آپ کے غلام ھیں اور کئی خاقان آپ کے نوکر ھیں
سیکڑوں سکندر اور دارا تیرے در پر دربان ھیں، صرف میں
ھی نہیں ھوں
اے ماہ لقا، اے پیارے محبوب! میری جان تیرے ناز و ادا
پر قربان
ھزاروں امیر اور فقیر تیرے دامنگیر ھیں اور حیران کھڑے
ھیں، صرف میں ھی نہیں ھوں
اے پیارے محبوب! اپنی نوری نظریں میری طرف منعطف
کر، آپ جنوں، انسانوں اور سارے جہاں کے سردار ھیں
شمس و قمر اور ستارے بھی آپ کے لئے دیوانے ھیں، صرف
میں ھی نہیں ھوں۔

متعدد شعرا مثلاً میر علی نواز علوی اور عبدالرؤف عبد وغیرہ نے اس غزل کا تتبع کرنے کی کوشش کی ھے، لیکن زمین و آسمان کا تفاوت ھے۔

سندھ کے باکمال عالم اور مجاھد حضرت امروٹی (وفات ۱۹۲۹ء) کے ایک مولود میں سے نمونہ پیش کیا جاتا ھے:-

ٻڌي زاريون نمائيءَ جون اچي رس يا رسول الله
ٻرين سو پاڻ تو ٻاجھون اچي ٻس يا رسول الله
هيڻو عاجز نذر ويتر ڪيو آ ڦٽ وڇوڙي جي
ملڻ جي مهر مرهم جو ڏيو ڏس يا رسول الله
ٻرين پرتئون ٻسي توکي ٿيان سرهو سجڻ سائين
وڇوڙي جي لهي دل تان مٺا! ڪس يا رسول الله
توڙي ڪيو قيد قسمت جي جدا امروٽ ۾ قابو
هنيون هردم مديني جو گھمي گس يا رسول الله

ترجمہ :

یا رسول اللہ ! اس عاجز کی آہ و زاری سنکر پہنچ جائیے
یا رسول اللہ ! اپنی شفقت بھری نظر سے آ کر نواز دیجئے
مجھے فراق کے زخموں نے اور بھی کمزور، عاجز اور درماندہ بنادیا ہے
یا رسول اللہ ! وصال کے مرہم کا پتہ بتادیجئے
اے محبوب ! آپ کو دیکھ کر میں خوش و خرم ہوجاؤں گا، اور
یا رسول اللہ ! فراق کا زنگ دل سے اتر جائے گا
اگرچہ تقدیر نے مجھے امروٹ میں قید کردیا ہے
لیکن یا رسول اللہ ! میرا دل ہر وقت مدینہ کی گلیوں میں رہتا ہے۔

گڑھی یاسین کے عالم و فاضل اور مشہور فقیہہ حضرت علامہ محمد قاسم (وفات ۱۳۴۹ھ) کی نعتیہ غزلیں بھی ملی ہیں۔ ایک غزل میں سے نمونہ پیش کیا جاتا ہے :-

مٺ ماه رويءِ مدني اهل زمن جو چاهي
نيڻن سندس برابر نرگس چمن جو چاهي

قدسي دهن سان دلبر زندهء کري مئن کي
اعجاز عيسويء جو مٽ تنهن دهن جو چاهي

ترجمہ:

اهل جہاں، مدینہ کے ماہتاب کی ہمسری نہیں کر سکتے
گل نرگس ان کی آنکھوں کے آگے ہیچ ہے
میرا محبوب اپنے مقدس منہہ سے مُردوں کو زندہ کر دیتا ہے
اعجاز عیسوی ان کے منہہ کی کیا برابری کر سکتا ہے۔

مقیم سمہ کے مولود مشہور ہیں، ان کے ایک مقبول عام مولود میں سے نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

سڄڻ سي آيا، صاحب سي آيا	وہ محبوب آگئے، وہ آقا آگئے
سال سکياسون تي جن کي	جن کے لئے میں برسوں سے مشتاق تھا
سي دلبر دوست مون ديکيا	میں نے اس دلبر دوست کا دیدار کرلیا

مشہور عالم و فاضل مولانا شفیع محمد صدیقی پاٹائی کے مولود بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کے ایک مولود میں سے نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

هينئڙي لڳي هير، جا آئي عرب پار جي	نسیم صبح کے جھونکے دل سے ٹکرا رہے ہیں جو دیار عرب سے آئی ہے
سرهي منجهہ، سرير هدايت هيڪار جي	وحدت کی تلقین نے طبیعت کو سکون بخشا ہے
ساعت منجهہ سذير، تي همت دل هشيار جي	ایک پل کے اندر دل بیدار اور ہشیار ہو گیا ہے اور اس میں ہمت پیدا ہو گئی ہے
اڳري تي اکير محب مني منثار جي	پیارے محبوب کی محبت میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

درگاہ ھالا کے مخدوم حضرت امین محمد ثالث نے کافی کے ساتھ ساتھ مولود بھی کہے ھیں۔ ان کے ایک مولود سے نمونہ پیش کیا جاتا ھے:۔

مرحبا يا مصطفيٰ سردار سرور مرحبا	مرحبا یا مصطفیٰ، سردار سرور مرحبا
مرحبا شاه رسل، يا مير مدني مرحبا	مرحبا شاہ رسل، یا میر مدنی مرحبا
مرحبا معراج ۾ آن کي چيو خلقي خدا	خالق اکبر نے معراج کی رات مرحبا کہتے ہوئے آپ سے کہا
يا شفيع المذنبين، آءُ عاصين احمد اچھا	اے شفیع المذنبیں، اے گنہگاروں کے یار و مددگار تشریف لے آئیے۔

ضلع لاڑکانہ کے ایک گاؤں "عاقل" کے مشہور عالم اور شاعر مولانا محمد عاقل عاقلی نے، جو فارسی زبان کے تسلیم شدہ اور بہترین شاعر تھے، سندھی میں بھی شعر کہے ھیں۔ ان کی ایک نعتیہ غزل کے چند شعر پیش کئے جاتے ھیں:۔

دل اندر دائم اکنڊ آهي سچي سردار جي
ڏي مريضن کي ميان مرسل دوا ديدار جي
تون تہ ڪيچي ڪارڻي سردار سونهون ساٿ جو
هيءَ ويچاري ويسلي واقف نہ آ وٽڪار جي
ناهہ عاقل کي عبادت ۽ عمل تي آسرو
ڪر سفارش سيدا هن بي وڙي بيڪار جي

ترجمہ:

دل میں ھمیشہ سچے سردار کی محبت جا گزیں ھے
اے رسول خدا! بیماروں کو دیدار کی دوا عطا فرمائیے
اے محبوب! آپ باعث تخلیق کائنات ھیں، اور پیشوا، اور میر کارواں

میں عاجز و درماندہ ہوں، اور "کیچ" کے راستوں سے بے خبر
اور غیر واقف ہوں
عاقلی کو عبادت اور عمل پر تکیہ نہیں ہے
اے سید! آپ اس بے عمل اور نا اہل کی شفاعت فرمائیے۔

مدح، مناجات اور معجزہ

مدح

سندھی شاعری کی اس صنف میں آقائے دو جہاں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا کی جاتی ہے۔ اہل بیت عظام اور اولیائے کرام کی منقبت میں بھی مناجات کے انداز میں مدحیں کہی گئی ہیں۔ فنی اعتبار سے مدحیں کبت کی ہیئت پر بھی ہوتی ہیں اور الف اشباع والی نظم کی صورت میں بھی، مثنوی کی صورت میں بھی ہوتی ہیں اور مسمط کی صورت میں بھی۔

مناجات

اس لفظ کا مادہ "نجوا" ہے، جس کے معنی ہیں راز کی بات کہنا۔ اصطلاحاً اس کا اطلاق ایسی نظم پر ہوتا ہے جس کے ذریعہ شاعر بارگاہ ایزدی میں آہ و زاری کرتا ہے اور اپنی مشکل کشائی اور حاجت روائی کے لئے التجا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ شاعر کبھی حضور انور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں یا دیگر بزرگان اور اولیاء اللہ کی خدمت میں بھی اپنا سوال پیش کرتا ہے۔ اگرچہ شاعر ضمنی طور پر مدح میں بھی اپنی حاجت بیان کرتا ہے، لیکن مناجات آہ و زاری اور مشکل کشائی اور حاجت روائی کے لئے عرض پرداز ہونے کے واسطے شاعری کی مخصوص صنف ہے۔ فنی لحاظ سے مناجات بھی مدح ہی کی طرح ہے۔

معجزے

اگر کسی پیغمبر کے ھاتھوں غیر ممکن بات ظہور پذیر ھوجائے تو اسے معجزہ کہتے ھیں اور کسی ولی اللہ کے ھاتھوں سرزد ھو تو اسے کرامت کہتے ھیں۔ سندھی شعرا نے حضور انور رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کے معجزات منظوم کئے ھیں۔ یہ صنف سندھی شاعری میں معجزہ کے نام سے متعارف ھے۔ بعض سندھی شعرا نے صحابہ کرام یا اولیاء اللہ کی کرامتیں منظوم کی ھیں، تو عام لوگوں نے ان کو بھی معجزہ ھی کا نام دیا ھے۔

تاریخی ارتقا

ان تینوں صنفوں کا تاریخی ارتقا "کلھوڑہ دور" سے شروع ھوتا ھے۔ سندھی زبان میں پہلی مناجات مخدوم عبداللہ عرف میاں موریو کی دستیاب ھوئی ھے، جن کا ذکر پہلے آچکا ھے۔ ان کی مناجات سے ایک بند بطور نمونہ پیش کیا جاتا ھے:-

مون کي من ۾ اوسيڙو مگر جو آهي
ايندو عاصين ڏنهون قيامت ڏينهن ڪاهي
ورنه اسھ وقت تنهن لاڳاپا لاهي
لنگھندا سير صراط جو سهرين ساهي
ٻاڙي ٻهرائي، فرياد رس يا مصطفیٰ

ترجمہ:

مجھے اپنے محبوب کا انتظار ھے
قیامت کے روز خود ھی عاصیوں کی طرف آئیں گے
دوسری تمام باتیں چھوڑ کر مشکل کے وقت میں میرے پاس پہنچ جانا

محبوب کو یاد کرتے ہوئے سب کے سب پل صراط پر سے
گذر جائیں گے
اے مصطفیٰ! اپنے غلام کو کامیاب بنائیے گا۔

سب سے اول مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی کے معجزے دستیاب ہوئے ہیں، جو ان کی تصنیف "قوۃ العاشقین" میں درج ہیں۔ ان کے منظوم کردہ ایک معجزہ سے نمونہ پیش کیا جاتا ہے:۔

اردو	سندھی
سرور پر درود ہو جو عالم کے امام ہیں	۽ پڻ صلواتون سرور اتي جو عالم اماما
ازل سے لے کر ابد تک ہمیشہ	هون ازل کنا ابد سي ئي هردم هميشا
جو تمام مخلوق کے پیشوا ہیں اور آدم، بلکہ تمام عالم سے قدیم ہیں	جو مهند مڙهين خلق کنان عالم آدم کنان
"اول ما خلق اللہ نوری" سے ثابت ہے کہ وہ سب سے پہلے ہیں۔	اول ما خلق الله نوري آ ڳاٽو اصلا

مخدوم غلام محمد بگائی کے متعدد معجزے بھی ملے ہیں۔ ان کے ایک معجزہ کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:۔

اردو	سندھی
محمد مصطفیٰ کا عاشق گھر سے نکل کھڑا ہوا	سو چلي ٻيٺو ڇپرين عاشق احمدا
نہ کھانا کھایا نہ پانی پیا، بلکہ اپنے وجود ہی کو بھلادیا	جنهن ان نہ چکيو، آب کين وسريس وجودا
اور عرض کرنے لگا کہ اے میرے اللہ! اے میرے مہربان مولا! اے میرے خالق!	تڏهن اپي عرض کيائين الله کي، سائيم سپاجها

ڏيکاريم راه مديني جي ور خالق مون خدا	اے خدا! آ، اور مجھے مدینہ کی راہ دکھا
تڏهن پرور سو پهچايو مديني جي پهران	اور اللہ نے اسے مدینہ منورہ تک پہنچا دیا۔

مدح کے نمونے بھی سب سے پہلے کلہوڑہ دور میں ہی دستیاب ہوتے ہیں۔ "جمن چارن کا سوال" سندھ میں ضرب المثل کی طرح زبان زد عام و خاص ہے۔ اسی طرح ان کی مدح بھی سندھ کے کونہ کونہ میں مشہور ہے۔ ان کے بعض مقولے بھی اچھی خاصی شہرت رکھتے ہیں: "پنج ئی بدنام"، "پنج ئی مٹی مت"، "پنج ئی گھر چالی" اور "پنج ئی سھنج"۔ میاں نورمحمد کلہوڑہ اور قلات کے خان عبداللہ خان کے درمیان جو لڑائی ہوئی، اسے نظم میں بیان کیا اور اہل سندھ کی شجاعت و مردانگی کی تعریف کی۔ اس کے علاوہ "پھول" پر بھی ان کی ایک عمدہ نظم موجود ہے۔ بہترین مدح نگار بھی تھے، اور رزمیہ شاعری، واقعات نگاری اور فطرت کی عکاسی میں کمال رکھتے تھے۔ سنہ ۱۱۵۱ھ (۱۷۳۸ء) میں انتقال کیا۔ تربت قبرستان پیر کٹپر (ضلع خیرپور) میں ہے۔ کھڑا تحصیل گمبٹ کے باشندہ تھے۔ سندھی کی مدحوں میں سے جمن چارن کی مدح پہلی ہے جو دستیاب ہوئی ہے۔ اس میں سے دو بیت بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:-

سواليءَ سپڙ جيئن، چوڏول ۾ چاڙهيو تيئن	جس طرح سم داتار سپڑ نے سائل کا سوال پورا کیا تھا، اسی طرح آپ بھی میرا سوال پورا کیجئے۔
آءٌ اوڙ کئون تنهنجو ايئن، هٿي در وجان کهڙي کيئن،	میں شروع ہی سے آپ کا ہوں،

پر سير کر مون کي کنئين، يا
پير پيران بادشاه

کسی اور کے دروازہ پر کیسے جاؤں۔ میری تمام حاجتیں آپ پوری کر دیجئے، اے پیر پیران بادشاہ۔

جمن چوي جاهل آهيان، ڪرتئون
ڪچو ڪاهل آهيان
تو در سندو سائل آهيان، يا پير
پيران بادشاه

جمن کہتا ہے میں جاہل ہوں۔ عمل کے لحاظ سے خام اور کاہل ہوں۔ آپ کے دروازہ پر سائل ہوں، اے پیر پیران بادشاہ۔

میاں سرفراز: سندھ کے حکمران میاں غلام شاہ کلہوڑہ کے بڑے فرزند اور ولی عہد تھے۔ ان کے بعد سنہ ۱۷۷۲ء میں تخت نشیں ہوئے۔ بڑے عالم، بلند پایہ شاعر اور علما اور شعرا کے قدردان تھے۔ ان کی علمی اور ادبی محفلوں کی شہرت ایران تک پھیلی ہوئی تھی۔ ٹالپوروں کے ساتھ اختلاف کی بنا پر میر بہرام کو قتل کرایا۔ ٹالپوروں نے ان کے خلاف بغاوت کی اور معزول کر کے حیدرآباد کے قلعہ میں نظربند کر دیا۔ اس کے بعد پہلے محمود خان کو اور بعد میں میاں عبدالنبی کو تخت پر بٹھایا۔ محمود خان کی شہادت کے بعد میاں عبدالنبی تخت نشین ہوئے، جنھوں نے میاں سرفراز کو قید میں قتل کرادیا۔

میاں سرفراز فارسی زبان کے بھی صاحب دیوان شاعر تھے۔ سنہ ۱۷۷۳ء میں نظربندی کے عالم میں ایک مدح کہی، جو سوز و گداز اور درد و تاثیر کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے، اور سندھی ادب میں لافانی حیثیت حاصل کر چکی ہے۔ ٹیپ کا مصرعہ "يلا جام! هن غلام

سندو سوال سٹھ تون" (اے خیرالانام! اس غلام کی فریاد سن لیجئے) کا کوئی جواب ھی نہیں ھے۔ ھر بند میں متعدد اندرونی قافیے ھیں یعنی ھر مصرعہ کا ایک ایک فقرہ مقفیٰ اور مسجع و مرصع ھے، جس نے مدح کو پر اثر بنا دیا ھے اور اس میں غیر معمولی دلکشی اور روانی پیدا کردی ھے۔ یہ مدح تمام سندھ میں مشہور ھے، اور مشکل کے وقت میں لوگ اسے مناجات کے طور پر پڑھتے ھیں۔ قدامت کے لحاظ سے اسے سندھی کی اولین مدحوں میں شمار کیا جاتا ھے، کیونکہ اس سے پہلے صرف جمن چارن کی مدح ھے۔ سرفراز کی مدح کو سندھی ادب میں صرف قدامت ھی کے لحاظ سے اھمیت نہیں ھے، بلکہ فنی پختگی، فکر کی گہرائی، درد، سوز اور خوبصورت مقفیٰ فقروں کی وجہ سے ایک لازوال شاھکار کی حیثیت رکھتی ھے۔ نمونہ کے طور پر دو بند پیش کئے جاتے ھیں:-

(۱)

مان جاھل ۽ کاھل، آھیان کچو کمینو
نہ مون حال، نہ مون قال، پلا پال کرین تون
پلا جام! ھن غلام سندو سوال سٹھ تون

(۱)

میں جاھل اور کاھل ھوں، ناپختہ کار اور ھیچ ھوں
میں نہ صاحب حال ھوں، نہ صاحب قال، آپ کرم کیجئے
اے خیرالانام! اس غلام کی فریاد سن لیجئے

(۲)

آھیان ڈڈ، غمن گڈ، سچا سڈ سٹھ تون

(۲)

میں خامکار ھوں، غمزدہ ھوں، اے صادق و مصدوق! میری پکار سن لیں

پسي پاڻ ڪرم ساڻ ڏکيا ڏاڻ ڏئين تون	میرا حال خود دیکھ لیں، نظر کرم کریں اور میرے درد کا مداوا کریں
پلا ڇام! هن غلام سندو سوال سڻ تون	اے خیرالانام! اس غلام کی فریاد سن لیجئے۔

مخدوم عبداللہ واعظ (مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی کا بھانجہ) کی مناجاتیں بھی ملی ہیں۔ مخدوم عبدالرحیم گرہوڑی (شہادت ۱۷۷۸ء)، مخدوم غلام محمد بگائی اور دیگر علما اور بزرگان کی مدحیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ مخدوم غلام محمد بگائی کی مدح کا نمونہ درج ذیل ہے:-

سو ڇاپندو سپرين صاحب سيف سخا	وہ محبوب ظہور پذیر ہوں گے جو صاحب سیف اور صاحب جود و کرم ہیں
ڏک لاهيندو ڏيهن تان، ڏجهو ڏور ڏوڙا	دنیا بھر کے درد مندوں کے دکھ، درد اور خوف دور کریں گے
سو ڇام ڇاپندو جڳ سندو، والي ٿيندو مهد ملهندو	وہ محبوب ظہور پذیر ہوں گے جو تمام دنیا کے بادشاہ ہوں گے
سو سام جهليندو، اوڏر ٿيندو، اوکيءَ ايندو	وہ پناہ دیں گے، سائبان بنیں گے، اور مشکل میں کام آئیں گے
لڪ لنگهائيندو، تان نہ ڇڏيندو ڏکين ڏيندو احمد اڇي دلبر دلاسا	پل صراط عبور کرائیں گے۔ غمزدوں کو چھوڑ نہیں دیں گے اور وہ محبوب، جو محمد ہیں خود آکر اطمینان دلائیں گے
رونق ڪندو، ٿيندو علوو اسلاما	وہ جب جلوہ گر ہوں گے تو اسلام کو سربلندی حاصل ہوگی۔

ٹالپور دور

اس دور میں بھی مدح اور مناجات کے بلند پایہ شعرا گذرے ہیں۔ کافی گو شعرا میں فتح فقیر نے مدحیں بھی کہی ہیں۔ ان کی ایک مدح سے ایک بند بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے :-

مرسل ماھ صحابي تارا، سونھن صحابي سٹ سونھارا
چار ئي جگروند جھونجھارا، چار ئي وير ولايت وارا
چار ئي قوت منجھ قرارا، عرش زمين سندن اوتارا
بغض رکين ڇو ھيا ھچارا، چار ئي سرور سان سونھن
چئني جي رک محبت من

ترجمہ :

رسول اکرم چاند ہیں اور صحابہ کرام ستارے، صحابہ کرام ان کی محفل کی زیب و زینت ہیں
چاروں خلفا ان کے دلی دوست، بہادر اور صاحب ولایت ہیں
چاروں بڑے طاقتور ہیں، اور عرش و فرش ان کی بیٹھک ہے
اے بدبخت! تو ان سے بغض کیوں رکھتا ہے، چاروں رسول اکرم کے ساتھ سجتے ہیں
اپنے دل میں چاروں کے ساتھ محبت کر۔

پیر محمد اشرف کامارائی نے بھی مدحیں اور مناجاتیں کہی ہیں۔ چاروں خلفائے راشدین کی شان میں کہی ہوئی ان کی ایک منقبت سے ایک بند پیش کیا جاتا ہے :-

نبي محمد تيو نروار - ڇو سلام درود ھزار
سيد سرداريں سردار - تيو مقرر جھانِ مدار
سونھن سيني جو سينگار - مھڙ مرسلن جو مھندار
ڏيڻ وڻڻ جو تيو ڏاتار - شفيع مذنبن جو آڌار

ترجمہ :

محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ظہور پذیر ہوگئے ہیں۔
ہزاروں درود اور سلام پڑھ
ہمارے سید، تمام سرداروں کے سردار ہیں، اور اس کائنات
کے مرکز و محور ہیں
وہ سب کی زیب و زینت ہیں، اور تمام رسولوں کے پیشوا ہیں
وہ داتا ہیں، لینا دینا انھی کے ہاتھ میں ہے، وہ گنہگاروں
کی شفاعت اور سب کی حمایت کرنے والے ہیں۔

اس دور میں شعرا نے الف اشباع کے قافیہ میں بھی مدحیں، منقبتیں اور مناجاتیں کہی ہیں، اور عروض کی بحروں اور وزنوں میں بھی۔ بعض شعرا نے سی حرفی کا انداز بھی اختیار کیا، جس کے مطابق ہر بند حروف تہجی میں سے ایک حرف کے ساتھ ترتیب وار شروع ہوتا ہے۔ آخوند محمد بچل انور (۱) نے عروضی بحروں میں بھی مدحیں منظوم کی ہیں۔ ان کی ایک نعت میں سے ایک بند پیش کیا جاتا ہے، جو سی حرفی ہے اور بحر رمل مثمن محذوف میں ہے:-

ثي، ثنا تنهنجي صفت هر جاءِ عالم ۾ عيان
عزّ آن جو سڀ نبين ۾ پلو ٿيو بي بيان

(۱) بڑے عالم و فاضل، میر نصیر خان کے استاد اور مٹیاری کے آخوندوں میں سے تھے۔ والد ماجد کا نام محمد صالح تھا۔ آخوند محمد بچل فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ انور اور بچل تخلص کرتے تھے۔ اردو اور سندھی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان کا سندھی کلام غزل، سی حرفی اور مدح پر مشتمل ہے۔ سنہ ۱۸۶۱ء میں انتقال کیا۔

کنڌ نمائي تو سدائين پيش آن جي آسمان
نور نرمل نعت آن جي سچ سدا ساراهيان
تات تاري آن جي احمد آهه مون صبح و مسا
يا حبيبي عرض سڻ آذار عالم جا اجها

ترجمہ :

ث، آپ کی ثنا اور صفت دنیا میں ہر جگہ عیاں ہے
آپ کی عظمت تمام انبیائے کرام سے بڑھ کر اور بیان سے باہر ہے
آسمان آپ کے سامنے ہمیشہ سر تسلیم خم کرتا ہے
اے سراپا نور! میں ہمیشہ آپ کی ثنا گوئی اور ستائش گری کرتا ہوں
اے احمد! صبح و شام میری زبان پر آپ ہی کا ذکر ہے
اے حبیب، اے عالم پناہ! میری عرض سن لیجئے۔

آخوند محمد بچل نے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شان میں بھی ایک مدح کہی ہے، جس کا ایک بند پیش کیا جاتا ہے:۔

خدا جو ولي ۽ نبيءِ جو تون نور — عليءَ جي تون سيني جو سيد سرور
جي آيا وٽئه تن کي حاصل حضور — کرين مدعي منهنجو ضايع ضرور
کرم کر سخي شاهه عبداللطيف

ترجمہ :

آپ خدا کے ولی اور نبی کے نور ہیں، آپ علی کے دل کے سرور ہیں
جو آپ کے پاس آئے، ان کو حضوری حاصل ہوئی، آپ میرے دشمن کو تباہ و برباد کردیجئے
اے سخی شاہ عبداللطیف کرم کیجئے۔

ملا صاحبڈنہ بھی مدح کے بڑے شاعر تھے، ان کی مدح ”اغثنی یا سیدا“ بےحد مقبول ہے۔ یہ مدح عام طور پر پڑھی جاتی ہے اور لوگ بڑے سوز و گداز کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہ سی حرفی مدح ہے، اس کا پہلا بند پیش کیا جاتا ہے:۔

الف ۔ اول اي سچا لھ سار سونھان سيدا
مجتبىٰ مختار مرسل ماڙ ڪر يا محمدا
تو بنا ناهي تڳڻ عاجز اپوجهن احمدا
نور نرمل ڪر نظر مان تي نبي نورالهدا

اغثني يا سيدا رس يا نبي خيرالبشر
غور ڪر غمگين جو اي نور نافع نامور

ترجمہ :

الف، اول اے سچے سید اور رہبر! میری خبر گیری کیجئے
اے محمد مجتبیٰ، اے رسول، اے مختار کل! میری دستگیری کیجئے
اے احمد! تیرے بغیر عاجزوں اور بےیار و مددگاروں کا جینا محال ہے
اے مجسم نور! اے نبی نورالھدیٰ! نظر کرم کیجئے
اے سید! اے نبی خیرالبشر! میری فریاد رسی کیجئے اور میری مدد کو آئیے
اے نور! اے نافع! اے نامور! اس غمزدہ کے حال زار پر غور کیجئے۔

صدرالدین چارن(۱) کی مدحیں بھی مشہور ہیں۔ ان کی مدحوں کے بند طویل ہیں، لیکن ان میں قافیے مروج استعمال کئے گئے ہیں، اور عربی اور فارسی کے الفاظ بھی کثرت سے استعمال ہوئے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب علم تھے۔ ان کی ایک مدح میں سے ایک بند پیش کیا جاتا ہے:-

کيئن کيان، ڪاڏي وڃان، ڪنهن ڪان پڇان ڏيرن جو ڏس
تَحَيَّرَتِ الْعُقُوْلْ فِيْ ذَاتِهِ، اهڙو فڪر آهي عبث
وصفون ڏسي وهسي هنيون، جيءُ ڪي رسي ٿو جور جس
ويري وجهي وسواس ٿو، ناقص عقل، ناهل نجس
تَعَوُّذُ سندي تلوار جو تر جو نہ ٿيو تنهن ڪي ترس
واهر وري ويري ويو، دشمن نہ ڏسيو ڏنوس ڏس
آلاپ ذاتي اسم جي جهونگار جيءَ ۾ جڻ جرس
ريءَ دير ڪر درگاه مان مقصد سکهو محتاج جو
رک يا رسول الله! تون ٻانهي مٿي هٿ ٻاجهہ جو

ترجمہ:

کیا کروں، کہاں جاؤں، دیوروں (پنھوں کے بھائی۔ سسئی کے دیور) کا پتہ کس سے پوچھوں

---

(۱) قریہ فتح پور (ضلع دادو) کے باشندہ تھے، والد کا نام مہرل فقیر تھا۔ سہراب چارن ان کے استاد تھے جو خود بھی ایک مدح گو شاعر تھے۔ ان کے ہمعصر "جانو" چارن بھی مدح کے شاعر تھے۔ لیکن جمن چارن کے بعد صدرالدین چارن کی مدحوں کو قبول عام حاصل ہوا۔

"تحیرت العقول فی ذاتہ" (اس کی ذات کو پہچاننے میں عقل حیرت زدہ ھے) ایسا خیال ھی فضول ھے

اوصاف دیکھ کر دل یقین کر لیتا ھے، اور طبیعت میں سکون و اطمینان پیدا ھوتا ھے

عقل، ناقص، نا اھل اور نجس ھے، جو دشمن بن کر وسوسے پیدا کرتی ھے

تعوذ (اعوذ باللہ) کی تلوار کا اس کو ذرہ برابر بھی خوف نہیں ھے

مدد پہنچ گئی، دشمن دفع ھوا، اور مجھ پر کامیاب نہیں ھو سکا

اسم ذات (اللہ) کا ورد کر جیسے گھڑیال کی آواز آتی ھے (ذکر بالجہر)

بارگاہ ایزدی سے بلاتاخیر مجھ محتاج کی مقصد برآری کرادے

یا رسول اللہ! اِس غلام کے سر پر مہر و کرم کا ھاتھ دھرئیے۔

سید خیر شاہ نامی ایک شاعر کے معجزے بھی دستیاب ھوئے ھیں۔ ایک بند ان کے اس معجزہ سے پیش کیا جاتا ھے، جو حضرت جابر انصاری کے سلسلہ میں ظہور پذیر ھوا :-

آءٌ اپر عاجز نهایت، منهنجا ٿيا ڪيئي جرم	میں نہایت ھی عاجز ھوں، مجھ سے کئی گناہ سرزد ھوئے ھیں۔
جي ڏسي هر هر ڏجان ٿو، ڪو قريشي ڪر ڪرم	میں ان گناھوں کو دیکھ کر بار بار ڈرتا ھوں، اے قریشی اپنا کرم کر۔
فضل ڪر في الحال مون تي صاحب خيرالامم	اے امت کے سردار! اب مجھ پر فضل کر۔
هل، هيبت قيام جي، اي شاهه منهنجو رک شرم	قیامت کا دن بڑا ھیبتناک اور ھنگامہ خیز ھے، اے بادشاہ وھاں میری لاج

سندھی	اردو
ات رسین رهبر رسولا، جت کاهیندا منجھ قبر	رکھنا۔ اے رہبر! اے رسول جب نکیرین قبر میں مجھ پر یلغار کریں تو میری مدد کرنا۔

برطانوی دور

انگریزوں کے دور میں بھی متعدد شعرا نے مدح، مناجات اور معجزہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ مدح کے سلسلہ میں حمل خان لغاری (وفات ۱۸۷۸ء)، شاہ محمد دیدڑ (۱۸۹۱ء)، عنایت اللہ چوڈھو (وفات ۱۹۰۰ء)، عبدالرحمان چانڈیو (وفات ۱۹۲۷ء)، نواب الهداد خان لغاری صوفی اور میاں احمد خانگڑھی کے نام قابل ذکر ہیں۔ حمل خان لغاری کی ایک مدح سے ایک بند بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

سندھی	اردو
توکي قرب قوسين جو	تم پر قوسین کا قرب ہے
صاحب آهين ثقلين جو	تم صاحب ثقلین ہو
تون قرة العينين جو	تم قرۃ العینین ہو
کر مهر مون تي مصطفيٰ	مصطفیٰ مجھ پر رحم فرما۔

شاہ محمد دیدڑ مدح کے باکمال شاعر گذرے ہیں۔ ان کی ایک مدح سے ایک بند مثال کے طور پر مندرجہ ذیل دیا جاتا ہے۔ اس مدح میں انہوں نے حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کا سراپا بیان کیا ہے:-

سندھی	اردو
وھ قائم القامت هو قد	ان کا قائم القامت قد بہت خوب تھا
سهڻو سنئون قد هو بہ حد	حد درجہ خوبصورت اور سیدھا قدتھا
توڙي هجن ٻيا سرو قد	دوسرے سر قد محبوب کے سامنے
آڏو عجيبن روپ رد	کوئی حیثیت نہیں رکھتے
شمشاد ٿيو بيکار بد	شمشاد ان کے آگے بیکار اور خراب معلوم ہوتا ہے
طوبيٰ ٿيو شرميو شجر	طوبیٰ ان کو دیکھ کر شرمسار ہو گیا۔

مناجات کے سلسلہ میں بھی کئی شعرا کے نام ملتے ھیں، مثلاً: حاجی طاھر محمد، شیخ محمد حسن ، حسین فقیر دیدڑ ، ھمت علی شاہ، غلام حیدر شر ، حاجی خان محمد چنجنی، حاجی عثمان چاکی، مصری شاہ ، حاجی عبداللہ ڈکھن ، پیر محمد اشرف کامارائی ، مولوی احمد ملاح ، مل محمود پلی وغیرہ۔ حسین دیدڑ کی ایک مناجات سے ایک بند نمونہ کے طور پر پیش کیا جاتا ھے :۔

کين جاچي آءُ گھڙيس تک تار ۾	میں بغیر کسی احتیاط کے عمیق بحر میں کود پڑا
چا نھاريان چوُطرف چوڌار ۾	اطراف و جنوب میں کیا دیکھوں؟
ڪونہ ٻيلي ٻيو وسيلو پار ۾	(کیونکہ) دوسرا کوئی بھی وسیلہ منجھدھار میں نہیں ھے
رحم تنھنجو رھنما! درڪار ۾	(اس لئے) اے رھنما! تیری رحمت ھی درکار ھے
يا رسول الله عربي الغياث	یا رسول‌اللہ عربی الغیاث!

معجزہ کے سلسلہ میں شاہ محمد دیدڑ، حمل خان لغاری ، عبداللہ ڈکھن کے علاوہ رمضان واڈھو، فقیر محمد ساچھی، رمضان کنبھر، مھدی شاہ ، ولن ولھاری، پاندھی آریسر اور دوسرے کئی شعرا کے نام ملتے ھیں۔ رمضان واڈھو ایک معجزہ میں ، معجزہ بیان کرکے آخر میں کہتے ھیں :۔

يار يتيمن اجھو اڙين ڏيندو دلبر دلاسا
اھڙا لکين معجزا آھن نبي نور سندا
رمضان منگتو، مصطفيٰ سندو، ڪري سوال سدا
پرتو پاجي پنڻو، تو ڏاڻ منگي ڏوڙا
عاصي ابوجھہ ابتر گھڻو، عاجز عيبن ڪان

ترجمہ :

وہ (نبی صہ) یتیموں کے وارث ، بے کسوں کے سہارے ھیں
میرے دلبر ھیں مجھے بھی امید یا دلاسا دیں گے
ایسے لاکھوں معجزے نبیؐ سراپا نور کے ھیں
رمضان فقیر ، مصطفیٰ صہ کے در پر دست سوال دراز کرتا ھے
وہ (رمضان فقیر) جاھل ، بھکاری آپ کے سپرد ھے ، آپ اسے
دوھرا دان (بھیک) دیدیں
وہ گنہگار اور بہت ھی جاھل و ابتر ھے اور عیوب سے عاجز ھے ۔

مناظرہ

سندھی شاعری کی اس صنف میں دو چیزوں کے درمیان سوال و جواب (مکالمے) ھوتے ھیں ۔ انکار ، اعتراض اور رد و قد کے بعد دونوں فریق ایک ثالث کو درمیان میں لاکر اس سے فیصلہ طلب کرتے ھیں ۔ اس لحاظ سے اس صنف کو گویا ایک منظوم ڈرامہ کی سی حیثیت حاصل ھو جاتی ھے ۔

ٹالپوروں کے دور سے پیشتر اس صنف کا کوئی نمونہ نہیں ملتا ۔ لیکن ٹالپور دور میں اس کا رواج عام پایا جاتا ھے ۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے سید خیر شاہ کے مناظرے ملتے ھیں ۔

سید خیر شاہ : حیدرآباد کے باشندہ تھے اور "خیر شاہ جو پڑ" میں ان کی سکونت تھی ، اور یہ محلہ انھی کے نام سے موسوم ھے ۔ میر کرم علی خان ان سے ناراض تھے ۔ بعد میں ان کے علم و فضل سے متاثر ھوئے ، اور ان کے لئے مواجب مقرر کردیئے ۔ سید ثابت علی شاہ کے ساتھ ان کی حریفانہ چشمک رہتی تھی ، جس سے سندھی شاعری میں مناظرہ اور ھجوگوئی کی بنیاد پڑی ، اور اس کی ابتدا یہیں

سے ہوئی ۔ سید خیر شاہ کا مناظرہ "ٹوپی اور پگڑی کا جھگڑا" سندھی شاعری میں اپنی قسم کا پہلا مناظرہ ہے، جس میں طنز و مزاح کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے چند منظوم معجزے، اور امام عالی مقام سیدنا حضرت حسین علیہ السلام کی شہادت سے متعلق ایک منظوم "جنگ نامہ" بھی موجود ہے۔ جنگ نامہ ۶۴ دوہوں پر مشتمل ہے اور ہر دوہہ مخمس کے طرز پر پانچ مصرعوں سے مرکب۔

ان کے مناظرہ "ٹوپی اور پگڑی کا جھگڑا" سے ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے :۔

پڳ

چي : مولي سندي ملڪ ۾ آءُ
تہ ڳالھيون ڳالھايون
هت ڪي راڄ رهي ويا، دايون
۽ بايون
ٿهلون ائين ٽوپيءَ تان ڪنهين
ڪين ڪرايون
پوءِ عقل ۾ آيون انڌيون تنهنجون
عادتون

پگڑی (ٹوپی سے مخاطب ہو کر)

آؤ تو خدا کی اِس خدائی میں بیٹھ کر باتیں کریں۔ یہاں کئی قومیں رہی ہیں جن میں دائیاں بھی تھیں اور بائیاں بھی (یعنی چھوٹے بڑے سب)۔ اس وقت تو کسی نے بھی ٹوپی کا مذاق نہیں اڑایا تھا۔ لیکن بعد میں تیری اندھی عادتیں لوگوں کی سمجھ میں آ گئیں۔

ٽوپي

چي : چڱيون اسان جون عادتون،
جي ڄيون ٿي چڱن
ترت ڏيئي تعظيمون سي مٿي
منجهہ رکن

ٹوپی (پگڑی کے جواب میں)

ہماری عادتیں اچھی ہیں اور اچھے لوگ ان سے باخبر ہیں۔ وہ تعظیم و تکریم کے ساتھ ہمیں اپنے سر پر رکھتے ہیں۔

اهو ٻڌڻ پيو ٻن، جو ٻئي هٿ تڪجن هاج ۾	پگڑی باندھنا تو ایک مصیبت ہے کہ دونوں ہاتھ، باندھنے سے تھک جاتے ہیں۔

اس کے بعد خلیفہ کرم‌اللہ کا ایک مناظرہ "مینا اور کوا" کے عنوان سے دستیاب ہوا ہے۔ ان کا کلام نہایت ہی پاکیزہ ہے۔ مینا سے ان کی مراد ہے ایک پاکیزہ انسان اور کوے سے مراد نفس امارہ۔

بعد میں متعدد شعرا نے مناظرے منظوم کئے، خصوصاً برطانوی دور میں تو بہت سے مناظرے لکھے گئے۔

فصل دوم

غزل، مرثیہ اور مثنوی

غزل

کلہوڑہ دور

سندھی غزل کے آثار کلہوڑا دور سے ملتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کلہوڑہ دور کے شعرا نے غزل پر طبع آزمائی شروع کی تھی۔ ان آثار سے جو کچھ معلوم ہوسکا ہے، اس کا حال درج ذیل ہے۔

نور محمد خستہ: ٹکھڑ کے قدیم شہر کے باشندہ تھے۔ بارھویں صدی ھجری میں گذرے ھیں۔ مخدوم محمد ھاشم ٹھٹوی کے شاگرد تھے۔ ان کی جو غزلیں ملی ھیں، وہ سندھی غزل کا پہلا اور ابتدائی نمونہ ھیں۔ نور محمد خستہ کی غزل سے دو بیت پیش کئے جاتے ھیں:-

تا برافگندی از رخ تو نقاب حشر ٿيو، آفتاب لايو تاب محب ماٹا نہ کر منا مونسان خوبرو خصلتون سکین ٹو خراب	جب تم نے اپنے چہرے سے نقاب الٹا، تو قیامت برپا ھوگئی اور سورج کی تپش بڑھ گئی۔ میرے اچھے محبوب! مجھ سے اتنے نخرے نہ کر۔ تم خوبصورت ھو کر خراب عادتیں سیکھ رھے ھو۔

مرزا تقی: یہ بھی ٹکھڑ کے قدیم شہر کے باشندہ تھے، اور نواب حفظ اللہ خان کے مصاحبین میں سے۔ میر علی شیر قانع نے

"مقالات الشعرا" میں فارسی زبان کے شاعر کی حیثیت سے ان کا ذکر کیا ہے، لیکن ان کی سندھی کی غزلیں بھی موجود ہیں۔ ایک شعر بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

اچي محبوب گهر پيهي،	محبوب جب میرے گھر آتا ہے،
پريان پو ٿئي اجل پيدا	تو دور سے موت بھی نمودار ہو جاتی ہے۔

ٹالپور دور: اس دور میں غزل کی ترقی شروع ہوئی۔ اس دور میں مندرجہ ذیل شعرا کی غزلیں ملتی ہیں۔

حافظ عالی: یہ بھی ٹکھڑ کے باشندہ تھے۔ قوم کے میمن اور مومن اسلام کوٹی کے شاگرد تھے۔ نورمحمد خستہ سے کچھ عرصہ بعد کے ہیں۔ ان کے فارسی اور سندھی کلام کے نمونے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کا سندھی شعر عروض کے مطابق ہے۔ ایک شعر بطور نمونہ درج ذیل ہے:-

سڪ وارن سبق سڀ سارو سالم	محبت کرنے والوں نے پورا سبق
پرت وارن پسيو پراهون پار	حفظ کرلیا اور انہوں نے دور دیس دیکھ لیا۔

سچل سرمست: حضرت سچل سرمست کی چند غزلیں بھی ملتی ہیں، جن میں انہوں نے حسب دستور اپنا مسلک بیان کیا ہے، تاہم تغزل کو نظرانداز نہیں کیا۔ محبوب کی آنکھوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

(۱)	(۱)
آهي انهن اکين کي خاصو خمار تنهنجو	ان آنکھوں میں تمہارا خمار جھلکتا ہے

وٺو وٺي سان آهيان ڪامل قرار تنهنجو	اے کامل ! میں تجھی سے سکون و قرار حاصل کر کے اطمینان سے بیٹھ گیا ہوں۔
(۲)	(۲)
تيز تيرانداز چشمون يار جون خوني خطاب ناز پرورده نظر سان ٿيون ڪرن عاشق ڪباب	یار کی آنکھیں، جنھیں "خونیں" (قاتل) کا خطاب دیا گیا ھے بڑی ھشیار تیرانداز ھیں۔ یہ ناز پروردہ آنکھیں عاشق کو ایک ھی نگاہ سے کباب کر دیتی ھیں۔

مرثیہ گو شاعر سید ثابت علی شاہ کی بھی چند غزلیں دستیاب ہوئی ھیں۔ ان کے علاوہ محمد بچل انور، محمد عارف صنعت، اویس شکارپوری (متوفی سنہ ۱۸۳۰ع)، ملا صاحبڈنہ اور خلیفہ کرم‌اللہ کی غزلیں بھی ملی ھیں۔ خلیفہ کرم‌اللہ کی ایک غزل بطور نمونہ پیش کی جاتی ھے :-

دلڙي اسان جي هٿ ڪري تون پاڻ وڃي ٿئين ياقي
ساهه سڏايو ساڻ اوهان جي، بت رهيو هت باقي
موهي مست مون ڪي ڪيو آهه محبت محب اوهان جي
ڏوري وو ڏکي تي ڏونگر، ٿيءُ اچي اوطاقي
دلبر دانا، دوست دلارا، محب اچي مل مون سان
درسن ڪاڻ اوهان جي دم دم منهن قران مشتاقي
رهي رين روانا ٿيڙا اوٺي اٺ پلاٽي
ڪرمون! ڪنهن سان حال اوريان ڏيرن ڪيم قزاقي

ترجمہ :

ھمارا دل اپنے قبضہ میں لے کر تم بے وفا بن گئے ۔ جان تو تمھارے ساتھ چلی گئی اور جسم یہاں باقی رہ گیا ۔ اے محبوب! تمھاری محبت نے موہ لیا اور مست بنا دیا ۔ تم میرے پاس آ جاؤ اس دکھی کو تمھارے بغیر گویا پہاڑوں کو طے کرنا پڑ رہا ھے ۔ اے دلبر، دل آرا، دوست دانا اور محبوب! مجھ سے آکر مل لے ۔ میں تمھارے دیدار کے لئے ھر دم مشتاق بنا پھرتا ھوں ۔ قافلہ والے (پنھوں کے بھائی) ایک رات رہ کر اونٹ سجا کر چل دیئے ۔ اے کرمو! میں حال دل کس سے بیان کروں ۔ دیوروں نے میرے ساتھ قزاقی کی ھے ۔

میر صاحبان کو شعر و شاعری کے ساتھ گہری دلچسپی تھی ۔ وہ خود بھی شعر کہتے تھے ۔ ان کا فارسی کلام بھی ملا ھے، اور میر حسن علی خان اور میر نصیر خان کی سندھی غزلیں بھی ملی ھیں ۔ جن میر صاحبان کی سندھی غزلیں ملی ھیں، ان کا بیان کیا جاتا ھے :۔

میر نصیر خان: سندھ کے ٹالپور حکمرانوں کو شاعری سے بڑی دلچسپی تھی ۔ ٹالپور حکومت کی بنیاد رکھنے والے میر فتح علی خان اگرچہ خود شاعر نہیں تھے، لیکن اس کے باوجود شعرا کے بڑے قدردان تھے ۔ میر فتح علی خان کے بعد میر غلام علی خان سندھ کے حکمران ھوئے، تو انھوں نے بھی علما اور شعرا کی قدردانی اور عزت افزائی کی ۔ ان کے بعد میر کرم علی خان تخت نشیں ھوئے، جو خود بڑے عالم و فاضل اور فارسی زبان کے بلند پایہ شاعر تھے ۔ ان کے دربار میں علما، فضلا اور باکمال شعرا کا جمگھٹا رہتا تھا ۔ ان کے

بعد میر مراد علی خان حکمران ہوئے، جو فارسی اور اردو کے شاعر تھے۔

میر نصیر خان، میر مراد علی خان کے فرزند تھے۔ ۱۴ محرم سنہ ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۴ء) کو متولد ہوئے۔ سنہ ۱۸۳۳ء میں میر مراد علی خان کے انتقال کے بعد جب دوسری "چوپاری" قائم ہوئی، تو اس میں میر نصیر خان بھی شامل تھے۔ سنہ ۱۸۴۱ء میر نورمحمد خان کے انتقال کے بعد سندھ کے مستقل حکمران ہوئے۔ سنہ ۱۸۴۳ء میں انگریزوں سے جنگ ہار گئے، اور انہیں نظربند کر کے پونہ بھیجا گیا، جہاں سنہ ۱۸۴۵ء میں انتقال کر گئے۔

میر نصیر خان سندھی، سرائکی، اردو اور فارسی کے بلند مرتبت شاعر تھے۔ فارسی میں ایک دیوان، دو مثنویاں، ایک منظوم سفرنامہ اور مکاتیب ان کی یادگار ہیں۔ سندھی میں ان کا صرف ایک مرثیہ، دو غزلیں اور سرائکی میں چند اشعار مل سکے ہیں۔ ان کی دونوں سندھی غزلوں میں سے چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں، جن میں سے ایک میں اعزہ و احباب کی بیوفائی، اپنی جلاوطنی اور انگریزوں کے ظلم و زیادتی کا حال بیان کیا ہے۔ یہ دونوں غزلیں شعریت سے بھرپور اور ان کے جذبات لطیف کی آئینہ دار ہیں:-

(۱)	(۱)
اعتماد هو جن عزيزن، دوستن تي دائما	جن عزیزوں اور دوستوں پر ہمیشہ اعتماد رہا
ويا ڇڏي گوندر گڏي، تن کي نہ هاڻي ياد ڪر	وہ رنج و غم میں چھوڑ کر چلے گئے، اب انہیں یاد نہ کر
آه، بي وطني ۽ دربدري ۽ پڻ قيد و بلا	جلاوطنی ہے، دربدری ہے اور قید و بند کی مصیبت ہے

سندھی	اردو
زندگي آهي زهر ڪا يا خدا امداد ڪر	یہ زندگی زہر بن گئی ہے خدایا مدد کر
گهٽ نہ ڪيو آهي ستم مون تي نصارن، چرخ پير!	اے چرخ پیر! نصاریٰ نے مجھ پر ظلم و ستم ڈھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی
تو ڪي پڻ جيڪي وڻي تون پڻ ستم بيداد ڪر (۱)	تیرے جی میں بھی جو بیداد آئے، وہ میرے اوپر کر گذر۔
(۲)	(۲)
نہ وڃي دل مان خيال رخ جانان هرگز	رخ جاناں کا خیال دل سے ہرگز نہیں جاتا
خانۂ عيش نہ ٿئي خانۂ ويران هرگز	خانۂ عشق کو ہرگز ویران نہیں ہونا چاہیئے
حسن وارن ۾ آهين تون شهہ خوبان لاريب	اے محبوب! تم بلا شبہہ حسینوں کے بادشاہ ہو
تو مثل هوندو نہ ڪو حسن جو سلطان هرگز	تمہاری طرح کوئی شہنشاہ حسن نہیں ہوگا
ڪشور حسن پري روءِ جي قبضي تي سندم	کشور حسن، میرے پری رخ محبوب کے تسلط میں ہے
مفت ۾ پڻ نہ وٺان ملڪ سليمان هرگز (۲)	میں مفت میں بھی ملک سلیمان نہ لوں۔

(۱، ۲) "ٹالپوروں کے علمی کارنامے"، مضمون از احسن کربلائی، شائع شدہ "مہران کی موجیں" مرتبۂ پیر حسام الدین راشدی ص ۹۳، ۹۴۔

میر شہداد خان: میر نصیر خان نے اپنی حکومت میں میر شہداد خان اور میر حسین علی خان کو شریک کیا تھا۔ انگریزوں نے سندھ پر تسلط کے بعد میر شہداد خان کو نظربند کر کے کلکتہ بھیجدیا تھا، جہاں ۸ محرم سنہ ۱۲۸۴ھ (۱۸٦۷ء) کو ان کا انتقال ہوا۔ فارسی، اردو اور سندھی کے بہترین شاعر تھے۔ ان کا مکمل قلمی دیوان موجود ہے۔ ان کی ایک سندھی غزل میں سے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں:-

سندھی	اردو
حسن وجمال جو ٿيو سندم رشڪ ماھ ۾	میر ے رشک ماہ محبوب میں جو حسن و جمال ہے،
سو حسن سو جمال ناهي مهر و ماه ۾	وہ آفتاب اور ماہتاب میں نہیں ہے
زلف سيہ جو عڪس اکين ۾ سمايو جڏھن	میری آنکھوں میں جب زلف سیاہ کا عکس سمایا
عالم سياھ ٿي ويو منھنجي نگاھ ۾	تو تمام عالم میری نگاہوں میں تاریک ہوگیا
پھلو مان راھ عشق ۾ دل ويو ڪسي ڪوئي	راہ عشق میں کوئی میرے دل کو میرے پہلو سے اڑا کر لے گیا
لتجي ويس مان واديءِ الفت جي راھ ۾	اور میں وادیٔ الفت کی راہ میں لٹ گیا
ايندو ھو شوخ تنھنجي اڱڻ ھڪڙي ڏينھن ضرور	اے حیدری! وہ شوخ ایک روز تیرے گھر میں ضرور آئے گا
اي حيدري! جي آھ اثر تنھنجي آھ ۾	بشرطیکہ تیری آہ میں کوئی اثر ہو۔

میر حسین علی خان: میر شہداد خان کے بھائی تھے اور ان کی حکومت میں شریک تھے - وہ بھی کلکتہ میں نظربند رہے - ۲٦ ربیع الاول سنہ ١٢٩٥ھ (١٨٧٨ء) کو انتقال کیا۔ سندھی، اردو اور فارسی کے باکمال شاعر تھے - فارسی اور اردو میں صاحب دیوان تھے - فارسی نثر میں ان کی تین تصنیفیں ھیں: "مناقب علوی"، "شاھد الامامت" اور "لب لباب"۔ ان کے کلام میں محبوب کی بے وفائی اور چرخ ستمگر کی جفاکاری کا ذکر بھی ہے، اور غریب الوطنی کے دکھ درد اور مصائب و آلام کا حال بھی۔ اس کے باوجود ان کی طبیعت میں مایوسی نام کو بھی نہیں ہے - ان کی ایک غزل سے چند اشعار پیش کئے جاتے ھیں:-

اڄ وري موسم بهار آيو	آج پھر موسم بہار آگیا ہے
جو چمن ۾ هو گلعذار آيو	کیونکہ چمن میں وہ گلعذار آیا ہوا ہے
تون اچي جڏهن ويٺين پهلوءِ ۾	تم جو میرے پہلو میں آکر بیٹھے
دل بي قرار کي قرار آيو	تو دل بےتاب کو قرار آ گیا
ڏسي ان منهنجي طائر دل کي	میرے طائر دل کو دیکھ کر
کلي چيائين سندم شڪار آيو	ھنسے اور کہنے لگے کہ میرا شکار آ گیا
ان کي محفل ۾ ڪنهن چيو اي حسين	اے حسین! کسی نے ان کی محفل میں
ڏس تہ تنهنجو هو جان نثار آيو	ان سے کہا کہ دیکھئے تمہارا جاں نثار آیا ہے۔

برطانوی دور

اس دور میں غزل کی شاعری نے بڑی ترقی کی، چھوٹے بڑے

متعدد شعرا پیدا ہوئے، جن کے تین دور متعین کئے جا سکتے ہیں:
(۱) قدما کا دور (۲) درمیانی دور (۳) آخری دور۔

(۱) قدما کا دور: اس دور کے غزل گو شعرا کے سرخیل خلیفہ گل محمد ہالائی ہیں، جو سندھی زبان کے اولین صاحب دیوان شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی غزل میں فارسی غزل کی روایات اور سندھی قدیم شاعری کی روایات کا حسین امتزاج کیا۔ عربی اور فارسی کے الفاظ کے بجائے خالص سندھی کے الفاظ اور سندھی کے محاورے کثرت سے استعمال کئے۔ تشبیہات اور استعارات بھی سندھی ماحول سے اخذ کئے۔ ان کی غزل میں سندھ کے رہن سہن اور سندھ کے معاشی اور معاشرتی حالات کی عکاسی نظر آتی ہے۔ شاہ لطیف کی طرح ان کے شعر میں بھی سندھ میں پیدا ہونے والی چیزوں، دھندھوں، لین دین اور زراعت کے طریقوں کا ذکر ہے۔ ربیع اور خریف کی فصلوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

اپاڙي چاڙھ عاشق، عشق جو اُئت	اے عاشق! ہمت کر کے کاشت کی تیاری کر
ڪتي پوکي وڏائي ڪر، مٿس چيٽ	ربیع کی فصل بو کر، پھر خریف کا بندوبست کر۔

غزل کا مخصوص مضمون اگرچہ حسن و عشق ہے تاہم اس میں تصوف کے نکات اور معاشی اور معاشرتی مسائل کو بھی لایا گیا ہے۔ گل کی غزل میں تصوف کے نکات، اخلاقی ہدایات اور معاشی اور معاشرتی مسائل کو ایسے رنگین اور دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے، کہ تغزل بھی متاثر نہیں ہوا، اور شاعر کا مقصد بھی پورا ہو گیا۔

سندھ میں رائج زراعت کی اصطلاحات "کھرڑا" اور "روت" کے استعمال سے فنا اور بقا کے فلسفہ پر اس طرح روشنی ڈالتے ھیں:-

لڏنو جاء ھڪ جاء مان وھن جاء ٻي	ایک جگہ سے نقل مکانی کر کے دوسری جگہ جا کر سکونت اختیار کرتے ھیں،
ھڻن جيئن ٽا ھاري کرڙا ۽ روت	جیسے کسان کھرڑا اور روت لگاتے ھیں۔

ذات مطلق سے لو لگانے کے سلسلہ میں جلاھے کی تانی کے تار کانٹھنے کی مثال بیان کرتے ھوئے ھدایت کرتے ھیں:-

ھاڻي پيھ تانيءَ ۾ پيرن پڌار ٽيا ڳنيدجي "ڳل" مڙئي ڳوپ ڳوت	تار اور پود کو آپس میں ملا کر کپڑا بن لے۔

آخوند محمد قاسم: آخوند محمد قاسم ھالائی (وفات ۱۸۸۱ء) بھی اس دور کے شاعر ھیں۔ انھوں نے ایک مکمل دیوان مرتب کیا۔ سلاست اور روانی ان کی غزل کی خصوصیت ھے۔ حسن و عشق کے ذکر کے ساتھ ساتھ اخلاقیات پر بھت زور دیا ھے۔ نیز اپنے دور کے حالات پر بھی اظھار خیال کیا ھے۔ انھیں اس بات پر بھت افسوس ھے کہ لوگوں میں مروت، صداقت، الفت اور وفا نھیں رھی۔ کھتے ھیں:-

اڄ مروت ۽ وفا منجھہ آدمين آھي اليپ	آج لوگوں میں مروت اور وفا نایاب ھے
پڻ صداقت ۽ صفا منجھہ آدمين آھي اليپ	اور ان میں صداقت اور صفا بھی نایاب ھے۔

حسن اخلاق کی تلقین کرتے ھوئے کھتے ھیں:-

آءُ اي دل! عشق ۾ الله جي نرت نوڙت رک نہ کر کنھن سان نفاق	اے دل! اللہ سے لو لگا لے عجز اور انکسار اختیار کر اور کسی کے ساتھ نفاق نہ کر۔

اخلاق کی ترغیب و تلقین کے بعد وصل محبوب سے محظوظ اور لطف اندوز ہونے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

سنڌي	اردو
ساهُ صحبت جو چکيم چس چاهه سان	میں نے صحبت کا ذائقہ لطف اور چاہ کے ساتھ چکھا
هوت هٿ واري هنئين جي هار وٽ	محبوب کے یہاں، جن پر حجت ہے اور میرے سینے کے ہار ہیں۔

فقیر والیڈنہ: فقیر والیڈنہ شکارپور (وفات ۱۸۸۶ء) بھی غزل کے اچھے شاعر تھے۔ کافیاں بھی کہی ہیں۔ ان کی ایک غزل کا مطلع پیش کیا جاتا ہے:-

سنڌي	اردو
وڏو ٿم آسرو دل کي اڱڻ منهنجي پرين ايندا	دل کو بڑا آسرا ہے کہ محبوب میرے گھر آئیں گے
دلاسو دل ڏتاريل کي ڏسڻ سان ئي اچي ڏيندا	اور دیکھتے ہی اس دل ربودہ کو دلاسہ دیں گے

سید حیدر شاہ: سید حیدر شاہ (وفات ۱۸۸۵ء) کا کلام زیادہ تر ابیات پر مشتمل ہے، لیکن ان کی چند غزلیں بھی ملی ہیں۔

غلام محمد خان زئی: مولوی غلام محمد خان زئی (۱۳۰۳ھ کے قریب زندہ تھے) نے بھی کافیاں اور بیت کے علاوہ غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان کی ایک غزل کا مطلع پیش کیا جاتا ہے:-

سنڌي	اردو
اچي ساقي سکايل کي پري ڏي مئي سندا پيالا	اے ساقی! اس مشتاق کو مئے کے جام بھر بھر کر دے
ته جيرا جوش جانب جي جلايون جان ۾ جالا	تاکہ محبوب کے جوش عشق میں جگر اور جان کو جلا ڈالوں۔

قاضی غلام علی: قاضی غلام علی بن قاضی محمد یحییٰ ٹھٹوی (وفات ۱۸۸۵ء) ایلس کمیٹی کے ممبر تھے۔ وکالت کرتے تھے۔ متعدد کتابوں کا سندھی میں ترجمہ کیا، جن میں سے "تاریخ سندھ" قابل ذکر ہے، شعر بھی کہتے تھے اور جعفری تخلص کرتے تھے۔

امام بخش شاہ فدوی: امام بخش شاہ فدوی ٹھٹہ کے رضوی سادات میں سے تھے۔ سنہ ۱۸۲۲ء میں متولد ہوئے۔ اور سنہ ۱۸۸۸ء میں انتقال کیا۔ بڑے عالم اور بزرگ تھے۔ مہدوی عقیدہ رکھتے تھے۔ ٹھٹہ میں اپنا مدرسہ قائم کیا تھا، جہاں خود درس دیتے تھے۔ میر مرتضائی ٹھٹوی کے بھتیجے اور شاگرد تھے، شعر بھی کہتے تھے۔ مرثیہ، منقبت اور غزل کے علاوہ "یوسف زلیخا" کے نام سے ایک مثنوی بھی تصنیف کی ہے۔

غلام مرتضیٰ شاہ: غلام مرتضیٰ شاہ ٹھٹہ کے رضوی سادات میں سے تھے۔ سنہ ۱۸۳۶ء میں متولد ہوئے اور سنہ ۱۸۹۹ء میں انتقال کیا۔ ان کے والد روشن علی شاہ "روشن" بھی سندھی اور فارسی کے شاعر تھے۔ شاعری میں ان کے استاد امام بخش شاہ فدوی تھے۔ غلام مرتضیٰ شاہ سندھی اور فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ سندھی میں ان کا مکمل دیوان موجود ہے، اور اس کے علاوہ تین مثنویاں بھی "سکندر نامہ"، "یوسف و زلیخا" اور "شاھنامہ"۔ ان کا فارسی اور سندھی کلام اس دور کے اخبارات "مفرح القلوب"، "معین الاسلام" اور "معاون" میں شایع ہوتا تھا۔ ان کی بعض غزلوں میں ان کے ھمعصر شعرا کا ذکر بھی ہے۔

سید محمود شاہ مجتبائی: قصبہ "آمری" ضلع دادو کے باشندہ تھے اور "گدا" کے ہم صحبت۔ ان کا شمار اس دور کے پختہ مشق شعرا میں ہوتا تھا۔ گدا نے ان کے متعلق کہا ہے:-

عدیم المثل ٿيندو مجتبائي فصاحت ۾ بلاغت ۾ بيان ۾	مجتبائی فصاحت، بلاغت اور بیان میں عدیم المثل بن جائیں گے۔

<u>میر حسن علی خان حسن</u> : سندھ کے حکمران ٹالپور خاندان کے فرد میر حسن علی خان "حسن" ۲۶ ذوالقعد سنہ ۱۲۳۰ھ کو تولد ہوئے۔ میانی کی جنگ کے بعد انگریزوں نے حکمران خاندان کے متعدد افراد کو قید کرکے کلکتہ میں نظربند رکھا۔ میر حسن علی خان بھی اپنے والد ماجد والیٔ سندھ میر نصیر خان کے ساتھ قید ہوکر کلکتہ لیجائے گئے۔ وہاں سے سنہ ۱۸۶۳ء میں آزاد ہوکر حیدرآباد آئے اور ۱۵ ذوالحج سنہ ۱۳۲۴ھ کو انتقال کیا۔

فارسی اور سندھی زبانوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔ خاص طور پر مرثیہ گوئی میں تو کمال رکھتے تھے۔ رزمیہ شاعری میں بھی اپنی نظیر آپ تھے۔ سندھی میں بھی متعدد منظوم کتابیں تصنیف کیں، مثلاً: "مختارنامہ ثقفی" دو جلد (جلد اول سنہ ۱۸۹۲ء میں اور جلد دوم سنہ ۱۸۹۵ء میں شایع ہوئیں)، "نہر البکا" (۱۳۶۲ھ — ۱۹۰۸ء میں شایع ہوئی)، مثنوی "فتح نامۂ سندھ یا شاہنامۂ سندھ" (سنہ ۱۹۳۸ء میں شایع ہوئی)، مثنوی "شہنشاہ نامہ یا حملۂ حیدری" اور "مختار نامہ" وغیرہ کے علاوہ مرثیے، منقبتیں اور سلام بھی کہے ہیں۔

میر صاحب پہلے سندھی شاعر ہیں، جنھوں نے "سکندر نامۂ نظامی" کے طرز پر "شاہنامۂ سندھ" کے نام سے ایک رزمیہ مثنوی تصنیف کی، جس میں میاں سرفراز کلھوڑہ کے دور حکومت سے لیکر میر فتح علی خان کے سندھ فتح کرنے تک کے مفصل حالات درج ہیں۔ سندھی زبان کی یہ پہلی مثنوی ہے، جس میں سیرت نگاری،

منظر کشی اور واقعہ نویسی کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ دو بیت بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:-

ٻہ لشڪر چوان يا ٻہ دريا چوان	دو لشکر کہوں یا دو دریا کہوں
ٻہ لشڪر ھا يا ابر آتش فشان	دو لشکر تھے یا دو ابر آتش فشاں تھے
ائين گرم ٿي آتش ڪار زار	آتش کار زار اس قدر گرم ہوئی
جو تپ لرزہ ٿيو در دل ڪوھسار	کہ پہاڑوں کو بھی تپ لرزہ آگیا۔

میر صاحب کی غزلیں بھی ملی ہیں۔ ان کی غزلوں میں صرف حسن و عشق ھی کا ذکر نہیں ھے، بلکہ آپ بیتی، ماحول کی عکاسی، اعزہ اور اقربا سے جدائی اور دنیا کی بے ثباتی پر بھی اظہار خیال کیا ھے۔ ایک غزل میں کہتے ہیں:-

جي جمع ھئاسون يڪجا، تن سڀ وڃي ڪيو تنھا	ہم جو ایک جگہ اکٹھے تھے، سب ایک دوسرے سے بچھڑ کر یک و تنہا رہ گئے
نوبت وڄائي سڀ ڪنھن، وارو سين لنگھايو	سب نے اپنی اپنی نوبت بجائی اور سب نے اپنی اپنی باری پوری کی۔

لوگوں کی قسم کھانے کی عادت پر اظہار خیال کرتے ہوئے خود داری اور عزت نفس کے تحفظ کی تلقین کرتے ہیں:-

ڪو ڪري اعتبار يا نہ ڪري	کوئی اعتبار کرے یا نہ کرے
تون ڪرين ڇو تو اختيار قسم	تم قسم کیوں کھاتے ہو۔

تعلّی تقریباً ہر شاعر کی جبلت میں داخل ھے۔ میرصاحب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ کہتے ہیں:-

آءِ مملڪت نظم ۾ سلطان سخن جو	میں مملکت نظم میں سلطان سخن ہوں
شائق هجين تان ڏس اچي ميدان	تجھے شوق ہو تو میدان سخن
سخن جو	آکر دیکھ لے۔

مصری شاہ : مصری شاہ (وفات ۱۹۰۳ء) اگرچہ کافی کے عظیم شاعر تھے، لیکن غزل میں بھی ان کو بڑی دسترس حاصل تھی۔ غزل میں جو تشبیہات استعمال کی ہیں، وہ سندھ کے ماحول سے لی گئی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ فارسی غزل کے لوازمات کو بھی بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے نباہا ہے۔ ایک غزل سے دو شعر نموتناً پیش کئے جاتے ہیں:-

ناز سين لاهئو نقاب، گڏ وهئو گهونگهٽ ڪيڏن

ڪوه مٺا مشتاق مارين، ڏئي نظارا بي سبب

لعل لب لعلون يمن جون، روئي رخ رشڪ چمن

نيڻ نرگس نيم خوابي، انتظارا بي سبب

ترجمہ :

اے محبوب! (دور ہوتے ہو تو) ناز سے نقاب الٹ دیتے ہو اور قریب بیٹھتے ہو تو گھونگھٹ نکال لیتے ہو

پیارے! نظارۂ جمال سے خواہ مخواہ مشتاقوں کو کیوں مارتے ہو

آپ کے لب لعلیں، لعل یمن ہیں اور آپ کا رخ انور رشک چمن

آپ کی آنکھیں نرگس نیم خواب ہیں، جو خواہ مخواہ انتظار میں رکھتی ہیں۔

حافظ حامد ٹکھڑائی : حافظ حامد ٹکھڑ تحصیل گونی ضلع حیدرآباد میں متولد ہوئے اور سنہ ۱۸۹۷ء میں انتقال کیا۔ بصارت نہیں رکھتے تھے، لیکن قدرت نے بصیرت بڑی فراخدلی سے عطا فرمائی تھی، جس نے

ان کے دل و دماغ کو اجاگر کردیا تھا۔ غزل اور نظم کے بہترین شاعر تھے۔ نظم میں خاص طور پر ان کا مقام بلند تھا۔ سادہ لیکن لطیف اور دلکش الفاظ کے استعمال سے سادہ سے سادہ خیال کو بھی بڑی خوبصورتی اور دلکشی سے پیش کرتے ھیں۔ ان کی ایک غزل سے دو شعر پیش کئے جاتے ھیں، جن میں سے پہلے میں محبوب کی بے نیازی اور دوسرے میں ان کی وعدہ خلافی کا ذکر بڑے مؤثر انداز میں کیا ھے:-

مڪا محبوب مون ڏي جي سنيها نت سھائين سي
تڪيان تارون ٿيون تن ڪي دلاسن تي سلامن تي
وڏي وعدي ڪان ويا ويلا وري محبن نہ ڪيا ميلا
اکيون هارين ٿيون رت ريلا قرارن تي انجامن تي

ترجم:

محبوب نے میرے پاس جو پیغام بھیجے ھیں وہ مجھے بہت اچھے لگتے ھیں
میں ان کے دلاسوں اور سلاموں پر تکیہ کئے ہوئے بیٹھا ھوں
محبوب نے ملاقات کے لئے جو دن مقرر کیا تھا، اس سے زیادہ دن گذر گئے لیکن وہ پھر بھی نہیں ملے
محبوب کے قول و قرار پر آنکھیں خون کی ندیاں بہا رھی ھیں۔

غلام محمد شاہ گدا: اس دور کے عظیم اور استاد شاعر تھے۔

میر عبدالحسین سانگی ان سے اصلاح لیتے تھے۔ سنہ ۱۸۲۶ء میں متولد ہوئے اور سنہ ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا۔ ان کے کلام میں مجاز کی ترجمانی بھی ھے اور حقیقت کی عکاسی بھی۔ اخلاق کا درس بھی ھے اور دین کی ترغیب بھی، اور سندھی شعرا کی پسندیدہ اور مروج

روایت کے مطابق تصوف کا رنگ بھی، اور کہیں کہیں غم دوران کا شکوہ بھی۔ غزل کے حسب ذیل شعر میں اپنی قناعت اور خودداری کی طرف اشارہ کرتے ہیں:۔

پنهنجي هن خرقي پراڻي جي برابر ڪيئن ڪريان قاقم وسنجاب ۽ زربفت ۽ اطلس کي آءٌ	میں قاقم، سنجاب، زربفت اور اطلس کو اپنے اس بوسیدہ خرقہ کے برابر کیسے سمجھوں۔

لوگوں میں محبت کا فقدان دیکھ کر کہتے ہیں:۔

جڏهن الفت زماني ۾ نٿي ڏسجي تڏهن بيشڪ رهڻ دنيا ۾ ٿيو دشوار پنهنجن ۾ پراون ۾	جب زمانے میں الفت ہی نہیں رہی، تب دنیا کے اندر اپنوں کے ساتھ خواہ غیروں کے ساتھ رہنا دشوار ہے۔

ان کی غزلیں اگرچہ فارسی کی ترکیبوں اور تشبیہوں سے مزین ہیں، لیکن ان کا استعمال ذوق سلیم پر گراں نہیں گذرتا۔ کہتے ہیں:۔

رقيبن کي جلائڻ ڪاڻ مون کي قرب مان ڪوٺي قمر طلعت پري رخسار ويهن ٿا ويهارين ٿا	قمر طلعت اور پری رخسار محبوب، رقیبوں کو جلانے کی خاطر مجھے پیار سے بلاتے ہیں، خودبھی بیٹھتے ہیں اور مجھے بھی بٹھاتے ہیں۔

گدا کی یہ سندھی غزل، حافظ شیرازی کی حسب ذیل غزل کا تتبع ہے:۔

پری رویان غبار دل چو بنشینند، بنشانند

متعدد غزلوں میں خالص سندھی زبان استعمال کی ہے اور الفاظ ایسے سلیس اور دلنشیں استعمال کئے ہیں کہ غزل میں نئی جان پیدا ہوگئی ہے۔ کہتے ہیں:۔

سندھی	اردو
سوال منهنجو سڻي سڄڻ سائين	اے میرے پیارے محبوب! میرا سوال سن کر
مون کي ڀاڪر کو پرت جو پائين	مجھے پیار سے اپنی آغوش میں لے لے
سئو لڳا توکي مون آ پرچايو	میں نے تجھے سیکڑوں مرتبہ منایا ہے
هڪ لڳا مون کي ڇو نہ پرچائين	ایک بار تو بھی مجھے کیوں نہیں مناتا۔

فضل محمد ماتم: فضل محمد ماتم بھی اس دور کے بہترین شاعر تھے۔ مرثیے اور سلام کے علاوہ غزلیں بھی کہی ہیں۔ غلام محمد شاہ گدا اور ماتم کے درمیان دوستانہ تعلقات تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے شاعرانہ کمالات کے قائل تھے۔ دونوں نے اپنی غزلوں کے مقطعوں میں ایک دوسرے کا ذکر احترام سے کیا ہے اور ایک دوسرے کے کمالات فن کا اقرار بھی۔ ماتم کہتے ہیں:-

سندھی	اردو
ماتم ادا! گدا جي سوا ڪنهن جي چا مجال	اے ماتم! گدا کے سوا اور کس کی مجال ہے
هن شعر جي جواب جو ميدان سر ڪري	کہ اس شعر کے جواب کا میدان سر کر سکے

گدا جواب میں کہتے ہیں:-

سندھی	اردو
گدا جو هي تہ غزل لاجواب آهي، اگر	گدا کی یہ غزل لاجواب تو ہے، بشرطیکہ
قبول خاطر ماتم اهو جواب ٿئي	یہ جوابی غزل ماتم کے لئے بھی قابل قبول ہو۔

آخوند لطف اللہ لطف: بہترین نثر نویس اور "داستان گل خنداں" کے مصنف آخوند لطف اللہ لطف حیدرآبادی (۱۸۴۲ء-۱۹۰۳ء) شاعر

بھی تھے۔ ان کی غزلیں ملی ہیں۔ ایک غزل سے نموںتاً دو شعر پیش کئے جاتے ہیں:-

سواد زلف دلبر جي مان کليو خط سياهي جو ته صبح وصل جو آخر کندو ظاهر ضيا امشب دلِ مجنون سان اي يارو اچي منهنجي ٿئي ياري ته وحشت کان ٻهر لحظ کري تو التجا امشب	محبوب کی زلف کی سیاھی سے رات کی سیاھی ظھور پذیر ھوئی ھے۔ آج رات کی سیاھی سے صبح وصل پھوٹ کر نکلے گی۔ دل مجنوں کے ساتھ میری دوستی ھوگئی، تو عالم وحشت میں ہر لحظ التجائیں کرنے لگا۔

مشاعرے

اس زمانہ میں مشاعرہ کی محفلیں بھی منعقد ھوتی تھیں۔ یہ محفلیں علامہ آئی۔ آئی۔ قاضی کے والد ماجد قاضی امام علی کی بیٹھک میں بھی ھوتی تھیں، اور ٹنڈو آغا میں سید آغا زین العابدین شاہ عابد کی بیٹھک میں بھی۔ قاضی امام علی انگریزوں کے ابتدائی دور میں حیدرآباد میں تحصیلدار تھے اور آغا زین العابدین میر صاحبان کے عھد میں شکارپور کے ناظم اعلیٰ تھے۔ مشاعرہ کی محفلیں انگریزی دور میں ان ھی کے یہاں منعقد ھوتی تھیں۔

اس زمانہ میں کراچی سے "سندھ سدھار"، "مجمع محمدی"، "اِکلیل"، معین الاسلام" اور"معاون الاسلام" اخبارات اور رسالہ "سرسوتی" شایع ھوتے تھے، اور حیدرآباد سے ماھنامہ "اخبار تعلیم"۔ ان اخبارات اور رسالہ جات میں سندھی شعرا کی طرحی اور غیر طرحی غزلیں شایع ھوتی تھیں۔

جائزہ

اس دور کے شعرا کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فارسی غزل کی روایت کو انتہائی خوبصورتی سے نبھانے کی کوشش کی، اور اس کے ساتھ سندھی شعر کی روایت کو بھی غزل میں سمو کر خالص سندھی غزل کے اصول متعین کئے۔ مضمون کے لحاظ سے اگرچہ تغزل کو قائم رکھا، لیکن تصوف اور اخلاقیات کی جانب بھی مائل رہے۔ اس کے علاوہ غم جاناں اور غم دوراں کا اظہار بھی کبھی صراحتاً اور کبھی اشارتاً کرتے رہے ہیں۔

درمیانی دور

سانگی: اس دور کی ابتدا غزل کے باکمال شاعر میر عبدالحسین سانگی سے ہوتی ہے۔ سانگی سندھ کے آخری ٹالپور حکمران میر نصیر خان کے پوتے اور میر عباس علی خان کے فرزند تھے۔ سنہ ۱۸۵۱ء میں متولد ہوئے، جبکہ ان کے والد کلکتہ میں نظربند تھے۔ سنہ ۱۸۶۲ء میں اپنے چچا میر حسن علی خان حسن کے ساتھ حیدرآباد واپس آئے۔ امیرانہ شان کے باوجود فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ شاہ لطیف سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں انتقال کیا۔

سانگی نے غزل کے روایتی انداز کو قائم رکھتے ہوئے اس میں نیا رنگ بھرا، اور سندھی غزل کے انفرادی مزاج اور مقام کو متعین کیا۔ انہوں نے غزل میں نہ صرف سندھی زبان استعمال کی، بلکہ اسے سندھ کے ماحول کا متحمل بھی بنایا۔ سانگی نے شیراز اور وہاں کے باغات یعنی "کنار آب رکنا باد" اور "گلگشت مصلیٰ" پر ہی دارومدار نہیں رکھا، بلکہ سندھو کے ساحل اور سندھ کے سبزہ زاروں اور ریگستانوں کو بھی اپنی شاعری کا مرکز و محور بنایا۔ کہتے ہیں:-

جو مهراڻن جي ڪينجهر ۾ ڪنارو آهي گهاري جو	مہران کی کیٹی میں کھارو کا ساحل
سو سارو سير حاصل غيرت ڪشمير تيو آهي	تمامتر غیرت کشمیر ہے۔

سانگی نے حقیقت بیانی اور وطن پرستی کے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے، تخیل میں جدت، اور اسلوب بیان میں ندرت پیدا کی۔ سندھی غزل کو سنوار کر اسے سندھی ثقافت کے ساتھہ ہم آھنگ کردیا، اور جیتی جاگتی زندگی کے بالکل ھی قریب لے آئے۔ ان کی غزل میں ان کی اپنی طبیعت کے مختلف احساسات و کیفیات کی جھلک بھی ہے اور سندھ کے معاشی و معاشرتی حالات کا عکس بھی۔ ان کی غزل میں فارسی غزل کی روایات بھی نمایاں نظر آتی ھیں اور سندھ کے ماحول سے اخذ کی ھوئی تشبیہیں اور تمثیلیں بھی۔ "ھاری" اور "بھیچی" سندھی کھیلوں کی مخصوص اصطلاحات ھیں، یہ اصطلاحات انہوں نے حسب ذیل شعر میں تمثیلی طور پر، لیکن بڑی چابکدستی کے ساتھہ استعمال کی ھیں:۔

اوهان ۾ هينئر ڪين پيچي پچونتا ڪڏهن راند جا هئاسون هاري عزيزو!	دوستو! کبھی ہم بھی کھیل میں ھاری تھے لیکن اب تو بھیچی بننے کے قابل بھی نہیں رہے۔(۱)

خالص سندھی کی تشبیہوں کے علاوہ فارسی غزل کی روایتی تشبیہیں بھی استعمال کی ھیں:۔

---

(۱) ھاری = کھلاڑی، اور بھیچی = اس کا حریف۔

سندھی	اردو
گل کي جڏهن چمن ۾ ڏٺو مون	میں نے جب گل کو چمن میں
تہ ياد پئين	دیکھا تو مجھے تم یاد آئے
بلبل کي چمن ۾ ڏٺو مون تہ	بلبل کو چمن میں دیکھا تو تم
ياد پئين	یاد آئے۔

ایک اور غزل میں کہتے ہیں:۔

سندھی	اردو
غزلن جا غزال ان ۾ تهن ٽا ۽	میدان سخن ایک سرے سے
ٽپن ٽا	دوسرے سرے تک سرسبز و
دامن تائين سرسبز ٿيو ميدان	شاداب ہے۔ غزلوں کے غزال
سخن جو	اس میں چوکڑیاں بھرتے ہیں۔

ان خوبیوں اور خصوصیتوں کے علاوہ ان کے شعر میں نازک خیالی اور فکر کی بلندی بھی ہے اور حکمت و دانائی بھی، اور مقصدیت اور پیغام بھی۔ کہتے ہیں:۔

سندھی	اردو
عالم ايجاد ۾ آهن هي لباسن	لباس کا یہ لطف اِس عالم ایجاد
جا مزا	میں ہے
هر ڪوئي عالم ارواح مان	ورنہ عالم ارواح سے تو سبھی
عريان آيو	بے لباس آئے تھے۔

سندھی	اردو
تڏهن جاتم ٿي تہ هيءُ هو آهي،	مجھے جب عرض اور جوہر کا
هو آهي هيءُ	علم ہوا، تب پتہ چلا کہ یہ،
جڏهن معلوم ٿيو عرض ۽ جوهر	وہ ہے، اور وہ، یہ ہے۔
مون کي	

غرضیکہ سانگی ہر اعتبار سے ایک باکمال شاعر تھے۔ ان کے شعر میں فنی پختگی بھی ہے، فکر کی بلندی بھی۔ خیال میں

ندرت اور وسعت بھی ہے اور زبان میں رنگینی اور دلکشی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کی دنیا میں ان کا مقام سب سے اونچا ہے۔ سانگی نے غزل گوئی میں نئے اسلوب اور انوکھے انداز اختیار کئے، اس لئے ان کی غزل نے بعد کے شعرا کے لئے مشعل راہ کا کام دیا، اور سندھی غزل ان کی جدت طرازی کی مرہون منت ہوئی۔

میوں وڈل علوی: قصبۂ سعید پور تحصیل گونی کے باشندہ تھے۔ عالم بھی تھے اور شاعر بھی۔ سانگی کے ہم عصر اور ہم صحبت تھے۔ دیوان سانگی جلد اول کی تصنیف کی تاریخ اس طرح لکھی ہے:-

جڏهن ٻڌم پورو ٿيو ديوان سانگي بي مثل	میں نے جب سنا کہ دیوان سانگی جو بے مثال ہے، مکمل ہو گیا
واسطي تاريخ جوڙڻ جي ڪئي منهنجي طبع تاڻ	تو میری طبیعت میں تاریخ کہنے کا جذبہ پیدا ہوا، اے حیدری!
با سر بيخواسته از لطف مون کي "حيدري" ۲	ہاتف غیب نے از راہ کرم "بیخواستہ" کے سر (ب) کے ساتھ ۲
ٿيو آهي هاتف چيو	مجھ سے کہا کہ
"ديوان سانگي ختم هاڻ"	"دیوان سانگی ختم ہان"
۱۳۰۸+۲=(۱۳۱۰)	۱۳۰۸+۲=(۱۳۱۰)

حکیم محمد واصل درس: سنہ ۱۸۵۲ء میں متولد ہوئے اور سنہ ۱۹۲۰ء میں انتقال کیا۔ بڑے عالم و فاضل تھے اور شاعر بھی۔ ان کی ایک مثنوی ۵۱۸ اشعار پر مشتمل ہے، جس میں سسئی پنھوں کی داستان بیان کی گئی ہے۔ مثنوی کے علاوہ ان کی غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔

دین محمد ساوِنی مسکین: ھالا کے ساوِنی ملاؤں میں سے تھے، جو اپنے علم و فضل کی بنا پر بڑی شہرت رکھتے تھے۔ مسکین خود بھی بڑے صاحب فضل و کمال تھے۔ مولانا رومی کی مثنوی پر سندھی میں حاشیہ لکھا ھے۔ اچھے شاعر تھے۔ غزلیں بھی کہی ھیں اور نظمیں بھی۔ زبان نہایت ھی سلیس، دلکش اور خالص سندھی استعمال کی ھے۔ دنیا کی ناپائداری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ھیں:-

جھليندي ڪيترو هيءَ جاه جھوني	یہ بوسیدہ مکان کب تک قائم رہے گا
جنهين جي پاڙ ئي پٽري پراڻي	جس کی بنیاد، جیسا کہ ظاھر ھے، بہت ھی سال خوردہ ھے
نہ ڪيائين ڪر پلڪ هڪ پائداري آئي ڪر اکڙين ڪي اوجھراٽي	ایک پل کی پائداری بھی نہیں کی اتنی دیر بھی نہیں، جتنی آنکھ جھپکنے میں لگی۔

زمانے کے ستائے ہوئے تھے، جن لوگوں نے ستایا تھا، ان کے جور و ستم اور اپنی مظلومی کا ذکر اور جذبۂ انتقام کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ھیں:-

ظلم، زوري، زبردستي، جفا ۽ جور جن مون ڪيو	جن لوگوں نے میرے ساتھ ظلم، زور، زبردستی، جفا اور جور کیا ھے
قيامت ۾ اهي ڦھري رليا رهزن رلائيندس	حشر کے روز میں ان رھزنوں سے خوب انتقام لونگا
ادا مسڪين کي وه وڻي سانگي سند مصرع	مسکین کو سانگی کا یہ مصرع بہت ھی پسند آیا کہ

"نماڻي نار آهيان، پر وڏن جا وڻ
وڇائيندي يس"

"میں ایک کمزور عورت ہوں لیکن
بڑے بہادر مردوں کے بھی چھکے
چھڑادوں گی۔

مخدوم محمد ابراهیم صوفی: ھالا کے بزرگ مخدوم احمد بھٹی کی نسل سے تھے۔ سنہ ۱۲۸۱ھ میں متولد ہوئے اور سنہ ۱۳۳۱ھ میں انتقال کیا۔ اچھے شاعر تھے اور اچھے نثر نویس بھی۔ ان کی ایک غزل سے نمونتاً دو شعر پیش کئے جاتے ہیں:-

چشم، لب، خال جو هرگز نه اٿم
خام خيال
۽ نه ڪنهن ظالم جي زلف دوتا
جي خواهش
عشق گلرخ جي ڪان آزاد ٿيس
اي صوفي
شڪرالله نه رهي مهر و وفا جي
خواهش

مجھے چشم و لب اور خال کا
خیال خام بالکل نہیں ہے
اور نہ ہی کسی ظالم کی زلف
دوتا کی خواہش
اے صوفی! میں گلرخوں کے عشق
سے آزاد ہو چکا ہوں
اللہ کا شکر ہے کہ اب مجھے مہر
و وفا کی خواہش نہیں رہی۔

حضرت مولانا ھمایونی: اس دور میں حضرت مولانا عبدالغفور ھمایونی کی نعتیہ غزلوں کو بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مولود کا ذکر کرتے ہوئے ان کی ایک نعتیہ غزل پہلے ہی پیش کی جا چکی ہے۔

امام بخش خادم: شکارپور کے داستان نویس امام بخش خادم کی غزلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ ان کی ایک غزل سے دو شعر بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:-

سندھی	اردو ترجمہ
آھو نرگس نيڻ تنھنجا سڀ پسي ٿيا مست خود	تمہاری یہ آنکھیں جو خود آھو اور نرگس ہیں، دیکھ کر سب مست اور بے خود ہوگئے
پٽ ڇڏيو آھو ڪٽي نرگس ڇڏيو گلزار ڪي	ہرن نے بیابان چھوڑدیا اور نرگس نے چمن کو ترک کیا
سال ٿيا سڪندي سڄڻ ساجن سگھيري سار لھہ	اے محبوب! تمہاری یاد اور اشتیاق میں برسہا برس گذر گئے، جلدی آکر خبرگیری کر
اي طبيب قلب ڏي تون ڪا دوا بيمار ڪي	اے دل کے طبیب! اس بیمار کو کوئی دوا دیدے۔

میر علی نواز علوی: میر علی نواز علوی شکارپور کے مشہور و معروف علوی خاندان کے چشم و چراغ تھے، جس کے مورث اعلیٰ شاہ حاجی فقیراللہ علوی کلہوڑہ دور کے نامور عالم اور عارف کامل تھے۔ میر علی نواز کے والد بزرگوار میر فخرالدین، شاہ فقیراللہ کے پوتے تھے۔ میر علی نواز سنہ ۱۸۵۱ء میں متولد ہوئے اور سنہ ۱۹۲۰ء میں انتقال کیا۔ بہت بڑے عالم و فاضل، صاحب کمال اور صحیح معنوں میں علامۂ دوراں تھے۔ تمام علوم و فنون میں ید طولیٰ رکھتے۔ متعدد ضخیم اور اہم ترین کتابوں کے مصنف تھے۔ زیادہ تر تصنیفات فارسی اور عربی میں ہیں۔ اکثر ضخیم ترین کتابیں صرف ایک ایک مسئلہ پر ہیں، اور زیر بحث مسائل پر تحقیق و تدقیق اور استدلال کی انتہا کردی ہے۔ سچے عاشق رسول تھے۔ سندھی، سرائکی اور فارسی کے عظیم شاعر تھے۔ کافی اور بیت بھی کہے ہیں اور غزلیں بھی۔ ان کی ایک نعتیہ غزل سے دو شعر پیش کئے جاتے ہیں:-

حسن تنهنجي جو متا محب! نہ مٽ ٿئي مهتاب	اے پیارے محبوب! ماہتاب تیرے حسن کی برابری نہیں کرسکتا۔
سونهن تنهنجي جو سڄڻ! شمس نہ ثاني جاني	اے محبوب! آفتاب تیرے جمال کا ثانی نہیں ہو سکتا۔
ماسوا تنهنجي سمائي نہ تو خاطر ۾ خيال	تیرے سوا اور کوئی خیال دل میں نہیں سما سکتا۔
سڪ تنهنجي جي سڄڻ ڳل آهي ڳاني جاني	اے محبوب! تیری محبت میرے گلے کا ہار بن چکی ہے۔

رمضان واڈھو: مشہور عوامی شاعر رمضان واڈھو (وفات ۱۳۳۰ھ) کی بھی چند غزلیں ملی ہیں۔ ان کی ایک غزل سے دو بیت پیش کئے جاتے ہیں:-

غواصي غوص غوغا ۾ کين تا تار ۾ غوطا	غواص موجوں کے شور میں گھرے ہوئے ہیں اور پانی میں غوطے کھا رہے ہیں۔
تري ٻاهر نڪي نڪرن کين پاتار ۾ غوطا	تیر کر باہر نہیں نکل سکتے اور پاتال میں غوطے کھا رہے ہیں۔
بحر بازار ۾ بيهي ڏسن چشمان تہ چشمن جا	آپ سمندر کی گہرائی دیکھنا چاہیں تو محبوب کی آنکھوں کے چشمے دیکھئے
زنخ پرين پگهر کائين غبون غب غار ۾ غوطا	محبوب کے چاہ زنخداں میں جب پسینہ آکر جمع ہوتا ہے تو لوگ غب غب کے گرداب میں غوطے کھانے لگتے ہیں۔

آخوند فقیر محمد عاجز: مشہور داستان "گلشن بہار" کے مصنف آخوند حاجی فقیر محمد عاجز (وفات ۱۹۱۸ء) بھی شعر کہتے تھے۔ سانگی اور گدا کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ اپنی بعض غزلوں میں بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں:-

سندھی	اردو
سانگي جو شعر شيرين، موزون، پرنمڪ	سانگی کا شعر شیریں، موزوں اور پرنمک ہے
آهي گدا ہ صاف فضيلت مآب ڪٿ	پتہ نہیں صاف دل اور فضیلت مآب گدا کہاں ہیں۔

ان کا ایک مکمل دیوان موجود ہے، جو اب تک اشاعت پذیر نہیں ہو سکا۔ انہوں نے حافظ شیرازی کی بعض غزلوں کا ترجمہ اور بعض کا سندھی میں تتبع بھی کیا ہے۔ زبان بڑی شستہ اور سلیس استعمال کی ہے۔ ان کی ایک غزل سے دو شعر پیش کئے جاتے ہیں:-

سندھی	اردو
عشق ۾ حاصل ٿيو آزار قسمت کي چوان	عشق سے آزار حاصل ہوا، اپنی تقدیر سے شکوہ کروں
دوستن جو دور ٿيو ديدار قسمت کي چوان	دوستوں کے دیدار سے محرومی ہوئی، اپنی تقدیر سے شکوہ کروں
جنهن جي ڪارڻ هيڏيون سختيون سهايم سر مٿي	جن کی خاطر میں نے اتنی سختیاں برداشت کیں
بند ۾ بيوس ٿيس لاچار قسمت کي چوان	(انہی کے ہاتھوں) بے بس اور ناچار ہو گیا ہوں، اپنی تقدیر سے شکوہ کروں۔

شمس العلما مرزا قلیچ بیگ: مرزا صاحب نے جس طرح نثر کی ہر صنف پر قلم اٹھایا ہے، اسی طرح شعر کی تمام صنفوں پر بھی

طبع آزمائی کی ہے۔ غزل میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں، لیکن ان کی غزلوں میں تغزل کم اور باقی سب کچھ ہے، جس سے ان کی غزل، نظم کے قریب آگئی ہے۔ انہوں نے اپنا تمام تر زور قلم یا تو اخلاقی قدروں کو اجاگر کرنے کی ترغیب و تلقین پر صرف کیا ہے یا نکات تصوف بیان کرنے پر۔ اس کے باوجود ان کی غزل حسب روایت حسن و عشق کے ذکر سے خالی نہیں ہے۔

چو تڙفي نه سيني ۾ هي دل	میرا دل سینہ میں پرندہ کی طرح
منهنجي پکيءَ جان	کیوں نہ تڑپنے لگے
هٿ ۾ ڪمان ان جيءَ تيا تير	محبوب کے ہاتھ میں کمان ہے
بغل ۾	اور بغل میں تیر۔

شمس الدین بلبل: باکمال ادیب اور منفرد شاعر شمس الدین بلبل اگرچہ نظم کے بےنظیر شاعر تھے، لیکن غزل میں بھی اونچا مقام رکھتے تھے۔ ان کا مکمل دیوان موجود ہے۔

ان شعرا کے علاوہ اس دور میں اور بھی متعدد شعرا گذرے ہیں، جن میں ماسٹروں (اساتذہ) کی تعداد زیادہ تھی۔ اگر ان کا شمار کیا جائے گا تو ان کی تعداد ایک سو سے بھی بڑھ جائے گی۔(۱) اکثر شعرا کا کلام غیر معیاری ہے۔ معیاری شعرا میں سے حسب ذیل کے اسما قابل ذکر ہیں:۔

غلام علی سبز پوش ٹھٹوی، محمد اسلم اسلم شکارپوری، غلام سرور فقیر قادری لاڑکانوی، خان بہادر رسول بخش راھی، مولانا بہاءالدین

---

(۱) کلیات سانگی مطبوعہ سندھی ادبی بورڈ سنہ ۱۹۶۹ء مقدمہ از ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ ص ۶۲۔

بھائی، امیر علی آبادی خیرپوری، آخوند عبدالقادر بیدل شکارپوری اور کمال الدین مست شکارپوری وغیرہم۔

آخری دور

آخری دور میں بھی بہت شعرا پیدا ہوئے۔ خاص طور پر مولانا محمد عاقل عاقلی (وفات سنہ ۱۹۴۱ء)، ہدایت علی تارک، آغا غلام نبی صوفی شکارپوری (وفات ۱۹۳۸ء)، محمد ہاشم مخلص، حکیم فتح محمد سہوانی، علی اصغر شاہ علی (وفات ۱۹۳۵ء) غزل کے باکمال شاعر تھے۔ آغا صوفی کی ایک غزل سے دو شعر پیش کئے جاتے ہیں:-

نازنين، نازڪ بدن يا سرو قد تو کي چوان	اے محبوب! میں تجھے نازنین نازک بدن کہوں یا سرو قد کہوں
چا صفت سھڻا ڪريان مان تو سندي سينگار جي	اے صاحب حسن و جمال! میں تیرے سنگھار کی کیا تعریف کروں
روز ريھان يار ڪيھان تو جدائي ڪان ڪريان	اے محبوب! میں روزانہ تیرے فراق میں آہ و زاری اور فریاد و فغاں کرتا رہتا ہوں
ڪير سد سھڻا لھي تو بن مٺا بيمار جي	اے پیارے محبوب! اس بیمار کی خبر گیری تیرے سوا کون کرے گا۔

لعلو رانک ضلع لاڑکانہ کے بلند پایہ شاعر ہدایت علی تارک (وفات ۱۹۴۲ء) کی ایک غزل سے دو شعر پیش کئے جاتے ہیں:-

باغ ۾ محبوب ويو، ٿيو رشڪ ان جي حسن ڪان	محبوب باغ میں گئے تو رشک و حسد کی آگ بھڑک اٹھی
مرغ چٽ، اشجار چٽ، اثمار چٽ، گلزار چٽ	جس سے پرندے، درخت، پھل اور خود باغ بھی جل گئے

سندھی	اردو
تنهنجي زلف عنبرين جي رشڪ کان ٿيو اي پرين	اے محبوب! تیری زلف عنبرین کے رشک سے
عطر چٽ، عود ۽ اگر چٽ، نافهٔ تاتار چٽ	عطر، عود، اگر اور نافهٔ تاتار تباه و برباد ہو گئے۔

محمد ہاشم مخلص اگرچہ نظم کے باکمال شاعر تھے، لیکن غزل گوئی میں بھی بلند درجہ رکھتے تھے۔ ان کی ایک غزل سے دو شعر پیش کئے جاتے ہیں:-

سندھی	اردو
زلفن جي طرح عمر بسر آهي ٿي منهنجي	میری زندگی بھی یار کی زلفوں کی طرح بسر ہوئی ہے
هن خانه بدوشن کي ڪٿي گهر نه مليو ٿو	(میری طرح) ان خانہ بدوشوں کا بھی کہیں ٹھکانہ نہیں ہے
ڇا ساڻ ڏيان يار جي ڏندان کي تشبيهه	میں محبوب کے دانتوں کو کس چیز سے تشبیہہ دوں
ڪنهن جاءِ تي اهڙو ته ڪو گوهر نه مليو ٿو	مجھے ایسا گوہر تو کہیں بھی نہیں ملتا۔

حضرت پیر پاگارہ حزب اللہ شاہ تخت دھنی (صاحب تخت) کے تیسرے صاحبزادہ پیر علی اصغر شاہ علی کی ایک غزل کے دو شعر پیش کئے جاتے ہیں:-

سندھی	اردو
ابرو ڪمان، تير مژه، زلف جو ڪمند	محبوب نے ابروؤں کو کمان، مژگان کو تیر اور زلفوں کو کمند بنالیا ہے
شايد اٿس خيال ٻه مرضي شڪار جي	شاید ان کا ارادہ شکار کا ہے
گهونگهٽ ڪڍڻ، نقاب وجهڻ، منهن پري ڪرڻ	گھونگھٹ کاڑھنا، نقاب ڈالنا اور رخ پھیرنا

پھرين ھسو مبارڪ پرين جي پار جي	محبوب سے ملنے ھی جو پہلی مبارک ملتی ہے، وہ یہی ہے۔

اس دور میں لاڑکانہ کے شعرا نے عروضی شاعری کے فروغ کے لئے بڑی جدوجہد کی۔ ان میں سے حاجی محمود خادم، میاں علی محمد قادری اور نواز علی نیاز کے اسما قابل ذکر ہیں۔ ان شعرا نے مشاعرے رائج کئے۔ جمعیتہ شعرائے سندھ کی بنیاد رکھی۔ ادبی کانفرنسیں منعقد کیں۔ شعر و سخن کی نشر و اشاعت کے لئے لاڑکانہ سے ایک ماھنامہ "گلدستہ" جاری کیا۔ اس کے بعد خادم کی کوشش سے ایک اور ماھنامہ "ادیب سندھ" جاری ہوا، جس نے عروضی شاعری کو فروغ دینے کے سلسلہ میں اہم خدمات انجام دیں۔

سنہ ۱۹۳۹ع میں حاجی محمود خادم کی تحریک سے لاڑکانہ میں "سندھی سدھار سوسائٹی" قائم ہوئی، جس نے شاعروں کی ترقی اور ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بعد سوسائٹی کی طرف سے سندھ کے مختلف شہروں میں اعلیٰ پیمانہ پر ادبی کانفرنسیں منعقد ہونے لگیں، جن میں سندھ کے ادیب اور شاعر کثرت سے شرکت کرتے رہے۔ سنہ ۱۹۴۶ع میں لاڑکانہ میں ساتویں ادبی کانفرنس منعقد ہوئی اور اس موقعہ پر "جمعیتہ شعرائے سندھ" کے نام سے ایک انجمن قائم کی گئی۔ انجمن کے قیام کے بعد سندھ کے مختلف شہروں میں سالانہ ادبی کانفرنسوں کے انعقاد کا سلسلہ شروع ہوا۔ خادم کی کوشش سے سنہ ۱۹۴۰ع میں ماھنامہ "ادیب سندھ" جاری ہوا جو سنہ ۱۹۵۲ع تک شایع ہوتا رہا۔

حاجی محمود خادم کی ان کوششوں کے نتیجہ میں سندھ میں شاعری کے ساتھ دلچسپی میں اور بھی اضافہ ہوا، اور

بیشمار نئے شعرا پیدا ہوئے۔ لاڑکانہ کے مشاعروں سے متاثر ہو کر سندھ کے دیگر شہروں مثلاً جیکب آباد، شکارپور، دادو، حیدرآباد، ہالا اور کراچی وغیرہ میں بھی مشاعروں کا رواج ہوا، اس لئے شعر کی تاریخ میں "لاڑکانہ اسکول" مشہور ہوا۔

جن شعرا نے برطانوی دور میں غزل کی شاعری میں نام پیدا کیا، اور تقسیم ملک کے بعد وفات پائی، ان میں سے نواز علی نیاز لاڑکانہ (وفات ۱۹۵۶ء)، حاجی محمود خادم (وفات ۱۹۶۰ء)، شیخ مراد علی کاظم روہڑی (وفات ۱۹۵۴ء)، محمد صدیق مسافر اور محمد بخش واصف (وفات ۱۹۵۳ء)، قادربخش بشیر ٹھل (جیکب آباد، وفات ۱۹۵۳ء)، لطف اللہ بدوی (وفات ۱۹۶۸ء)، سرور حیدرآبادی اور رشید لاشاری (وفات ۱۹۷۰ء) کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ غلام عباس جوش، ضیاءالدین بلبل اور لعل چند مجروح وغیرہ کا شمار بھی اچھے غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔

ہندو شعرا نے بھی غزل کے میدان میں اچھے جوہر دکھائے۔ اس سلسلہ میں سب سے اول آسورام آسو اور ان کے بعد دیوان لیلارام سنگھ، وطن مل خاکی اور منشی لچھی رام خفتی حیدرآبادی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ آخری دور میں لیکھراج کشن چند عزیز کا نام آتا ہے جو غزل کے نہایت ہی اعلیٰ پایہ کے شاعر ہیں۔ آجکل ہندوستان میں ہیں، اور حسب دستور غزل گوئی ہی ان کا محبوب مشغلہ ہے۔

حسب ذیل شعرا اسی زمانہ سے قدیم رنگ میں غزل کہتے آ رہے ہیں، اور بہترین اور پختہ فکر غزل گو تسلیم کئے جاتے ہیں:-

ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل، حافظ محمد احسن چنہ، شیخ عبداللہ عبد اور عبدالفتاح عبد وغیرہم۔

مرثیہ

یوں تو مرثیہ اس نظم کو کہا جاتا ہے، جس کے ذریعہ کسی کی وفات پر رنج و غم کا اظہار کیا جائے، اور اس کی خوبیوں اور خصوصیتوں پر روشنی ڈالی جائے، لیکن اب اس کا اطلاق سیدالشہدا حضرت امام حسین علیہ‌السلام اور ان کے رفقا کی شہادت کے ذکر پر ہوتا ہے۔

سندھی شاعری میں سب سے پہلے امام عالی مقام کی شہادت کا ذکر شاہ لطیف کے رسالہ میں نظر آتا ہے۔ شاہ لطیف کے رسالہ میں درج اس قسم کے ابیات کے متعلق یہ خیال بھی کیا جاتا ہے کہ ان میں سے متعدد ابیات شاہ لطیف کے ہمعصر شاعر احسان فقیر کے ہیں۔ اس کے علاوہ مخدوم عبدالرؤف بھٹی کے بعض مولودوں میں بھی حضرت امام حسین کی شہادت کا ذکر موجود ہے۔ مخدوم عبداللہ نرئی والے کی تصنیفات "غزوات" اور "خلفائے راشدین" میں بھی واقعۂ کربلا الف اشباع کے قافیہ والی نظم میں بیان کیا گیا ہے۔

کتاب خلفائے راشدین میں سے ایک ٹکڑا پیش کیا جاتا ہے:-

کتاب "نقایہ" الاثر" ۾ آئي تو اها
تان ھي ڪيائون قتال امير سين
منجهہ زمين ڪربلا
تت شير شهادت رسيو، ٻاهتر ٻئا
تيتيهہ سندس آڪاھ منجها، ٻئا
تنئون سوا
ڏهين تاريخ سا هئي سندي محرم ماه

کتاب "نقایہ" الاثر" میں یہ روایت ہے کہ امیر (حضرت حسین) کے ساتھہ (ان کے دشمن) کربلا کی زمین پر قتال کر رہے تھے، جہاں شیر (حضرت حسین) اور ان کے بہتر رفقاء شہید ہوئے۔ ان میں تینتیس حضرت حسین کے خاندان میں سے تھے اور باقی ان کے ساتھی۔ یہ ماہ محرم کی دس تاریخ تھی۔

سنہ ۱۷۹۸ء میں مولوی احمد نے ملا حسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف "روضہ الشہداء" کا سندھی میں ترجمہ کیا، جو طویل ابیات کی صورت میں ہے، اور الف اشباع والے قافیے استعمال کئے گئے ہیں۔ واقعۂ شہادت اس طرح بیان کیا گیا ہے:-

تان جڏهن ٿيو واقعو هيءُ دار ۾ دنيا	یہ واقعہ جب اس دنیا میں صادر ہوا
رت هاربو زمين تي، سندو سپريان	اور زمین پر محبوب کا خون گرا
عرش ڪرسي آپ سڙيوئي لرزي ۾ آيا	تو عرش، کرسی اور تمام آسمان لرز گئے۔

سید خیر شاہ نے اپنے جنگ نامہ میں شہادت کا ذکر اس طرح کیا ہے:-

قلم قضا جو ڪاتب لکيو ري رب تنهن ڪي ڪير رسي خاوند جي گهر جنهن پر جهڙي، پر تهڙو مينهن وسي جيڪي جاڻي جاڻڻ وارو، ٻئي نہ ڪنهن ڪي ڪل قصي ايڏا ڪم ڪريم سندا، جو دشمن سانديو دوست دسي آل عبا سان غيرگناه ڏس ڪيڏو قهرستان ٿيو	کاتب تقدیر نے جو قضا کا قلم چلایا، اسے خود خدا کے سوا کون سمجھے۔ جس طرح اور جس طرف اللہ کی مرضی ہوگی، اسی طرح اور اسی طرف بارش برسے گی۔ جاننے والا جانتا ہے، دوسرے کو اصل حقیقت کا کیا علم ہو سکتا ہے۔ یہ کریم کے کام ہیں جو دشمن کی حفاظت کرتا ہے اور دوست کو زیر کرتا ہے۔ دیکھئے آل عبا کے ساتھ بغیر کسی قصور کے کتنا قہر ہوا۔

حضرت سچل سرمست نے بھی مرثیے کہے ہیں۔ ایک مرثیہ میں حضرت امام حسین کے گھوڑے پر سوار ہو کر میدان کارزار میں آنے کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

سندھی	اردو
شاہ جو گھوڑو پيو ڪاھي گھٽي گھمسان ۾	شاہ (حضرت حسین) کا گھوڑا ہجوم میں گھس گیا۔
ھيءُ ترارن تار ڪيو، ھيءُ جنگ ھو جولان ۾	اسے تلواروں کے پے درپے وار نے بھڑکا دیا تھا لہٰذا وہ جولان میں تھا۔
اسپ جون اکڙيون ھيون ھن نر جي نيشان ۾	شاہ جو نشانہ باندھتے تھے اس کی آنکھیں اس پر ہوتی تھیں۔
آسمان ڌرتي برابر ڌنڌ ڪاري يا حسين	زمین و آسمان پر اندھیرا چھا گیا تھا۔ یا حسین۔

حضرت سچل سرمست نے بعض کافیوں میں بھی امام عالی مقام کا ذکر کیا ھے۔ سندھی شاعری میں مرثیہ گوئی کی یہ ابتدا تھی، بعد میں سید ثابت علی شاہ نے، جو مرثیہ کے خاص شاعر ہوئے، مرثیہ کی صنف کو استواری بخشی اور اسے ترقی و عروج کی آخری منزل پر پنہچایا۔

سید ثابت علی شاہ: دراصل ملتان کے باشندہ تھے۔ وہاں سے ہجرت کر کے سندھ میں آئے، پہلے ٹھٹہ میں اور بعد میں سہون میں آباد ہوگئے۔ ان کی ولادت ملتان میں سنہ ۱۱۵۳ھ (۱۷۴۰ء) میں ہوئی اور ۲۷ جمادی الاخریٰ سنہ ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) کو وفات پائی۔ ان کی تربت سہون میں ھے۔ وہ کلہوڑہ دور میں سندھ میں وارد ہوئے اور کافی عرصہ تک حصول تعلیم میں مشغول رہے۔ جس زمانہ میں مولوی مداح کے یہاں پڑھتے تھے، اس وقت میاں سرفراز

کلھوڑہ ان کے ہم مکتب تھے۔ کلھوڑوں کے بعد میر صاحبان کے دربار میں انہوں نے بڑا اثر و رسوخ پیدا کیا۔ فارسی اور سندھی کے بلند پایہ اور نازک خیال شاعر تھے۔ وہ پہلے شاعر تھے، جنہوں نے عروضی شاعری کو باقاعدہ اظہار خیال کا ذریعہ بنایا اور ہر صنف میں شعر کہا۔ ان کا کلام مرثیہ، سلام، قصیدہ، مثنوی، مخمس، مسدس، غزل اور فرد پر مشتمل ہے۔ انہوں نے مدحیں اور منقبتیں بھی عروضی شاعری میں کہی ہیں۔ سندھی زبان میں مرثیہ کی بنیاد اگرچہ ان کے پیش رو شعرا نے رکھی تھی، تاہم مرثیہ کو ایک مستقل صنف کی حیثیت سے باضابطگی انہوں نے عطا کی، اور اس کو درجۂ کمال تک بھی انہی نے پہنچایا۔ ان کے بعد متعدد شعرا نے مرثیے کہے، لیکن وہ مرثیہ گوئی میں ان کے حریف نہیں بن سکے۔ ثابت علی شاہ کے مرثیوں میں غضب کی منظرنگاری اور حقیقت بیانی ہے۔ وہ کردار اور واقعات کو ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قاری اور سامع اپنے آپ کو ان سے ہم آہنگ محسوس کرتے ہیں۔

سید ثابت علی شاہ کا تعلق اہل تشیعت سے تھا، اور ان کے ہمعصر سید خیر شاہ کا اہل سنت سے۔ مذہبی اختلاف کی بنا پر دونوں نے ایک دوسرے کی خوب ھجو کی۔ ان ھجویہ اشعار کی اشاعت چونکہ مناسب نہیں ہے، لہذا ان کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔

سید ثابت علی شاہ کے بعض مرثیوں میں سے چند بند بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:-

پاڻي بند ڪيو پليد ٿيا ڪرہ تي تيار	پلیدوں نے پانی بند کیا اور ظلم و ستم پر تیار ہو گئے
مارو وڃايا موت جا ڪوفين ۾ ڪارزار	کوفی میدان کارزار میں موت کے فرشتے لے آئے

بڇي ۽ ڀالو، خنجر و سيف و علم، ڪٽار	بڑچھی، بھالا، خنجر، تلوار، علم اور چھرا
تيرن جو مينهن، ترار جي وڄ، ڌرتي ڌڏڪار	تیروں کی بارش، تلوار کی چمک اور زمین میں زلزلہ
از هایٔ هویٔ معرکہ شد شور شے پدید	میدان جنگ کی چیخ و پکار سے ایسا شور برپا ہوا
دانست اهل چرخ کہ روز جزا رسید	کہ خود آسمان والوں نے بھی یہ سمجھا کہ قیامت آگئی۔

شاه گهوڙي تان لهي خيمي ۾ آيو اشڪبار	شاہ (حضرت حسین) گھوڑے پر سے اتر کر آنسو بہاتے ہوئے خیمہ میں داخل ہوئے
طرف سيرانديءَ جي ويهي چيائين منهنجا من قرار	اور (زین‌العابدین کی) بالین کی طرف بیٹھ کر کہنے لگے کہ اے میرے دل کے سکون و قرار
آءٌ هليس عابد مرڻ، تون پٽ اکيون ٿي هوشيار	اے عابد! میں جان دینے جا رہا ہوں، تم آنکھیں کھول کر ہشیار ہو جاؤ
هيءَ نبي ناموس پرٿئي، توتي سڄڻي جو مدار	خاندان نبوت کی ناموس تیرے سپرد ہے، اور اب تو ہی سب کا ذمہ دار ہے
دل کي ڌيرج ڏي مٺا ۽ هيانو ڪر، هشيار ڪر	پیارے! تحمل سے کام لے، اور دل کو مضبوط کر
پنهنجي بابي جو ابا، اٿ آخري ديدار ڪر	بیٹے! اٹھ، اور اپنے باپ کا آخری دیدار کر۔

مرزا فتح علی بیگ: خیرپور میرس کے مرزا مراد علی بیگ سائل (وفات ۱۸۵۱ء) اور ان کے فرزند فتح علی بیگ فتح کے مرثیے بھی ملتے ھیں۔ مرزا فتح علی بیگ کے ایک مرثیہ میں سے ایک بند بطور نمونہ پیش کیا جاتا ھے:

ٿي چوي سر پٽي روئي دلھن نڪ مون نٿ ٻانھين زيور لاھيو	دلہن سر پیٹ کر کہتی ھیں کہ ناک میں سے نتھ، چوڑیاں اور تمام زیور اتاردیجئے
آءٌ رنيس ھڪڙي شب جي سھاڳڻ نڪ مون نٿ ٻانھين زيور لاھيو	میں ایک رات کی سہاگن بیوہ ھوگئی نتھ، چوڑیاں اور تمام زیور اتاردیجئے۔

مرزا بڈھل بیگ: ان کے فرزند مراد علی بیگ بڈھل مرثیہ کے باکمال شاعر گذرے ھیں۔ سید ثابت علی شاہ کے بعد مرثیہ کا باکمال شاعر انھی کو تسلیم کیا جاتا ھے۔ وہ میر نور محمد خان کے وزیراعظم تھے۔ اردو کے مرثیہ گو شعرا میر انیس اور میرزا دبیر سے متاثر تھے، تاھم وہ ان کے متتبع نہیں تھے، بلکہ ان کے مرثیہ میں جدت ھے، اور ان کی اپنی انفرادیت بھی کارفرما نظر آتی ھے۔ حر کے حملہ اور ان کی شھادت کے واقعہ کو بیان کرتے ھوئے کہتے ھیں:-

ڊوڙيو ھتان پوءِ حر جي طرف سيد امم	پھر سیدالامم وھاں سے حر کی طرف لپکے
حر کي ڏسي حسين جي ٿي غم کان پشت خم	حر کو دیکھ کر حسین کی پشت غم سے خم ھوگئی
آئي ندا رسول جي ان وقت دم بدم	اسی وقت حضور رسول اکرم کی آواز گونجنے لگی

سندھی	اردو ترجمہ
هئي هئي ابا هي دوست سندم	ہائے ہائے بیٹے! یہ میرا دوست
جان فدا حسين	اور تیرا جاں نثار تھا
هن لئي كنداسين خلد ۾ ماتم	ہم بہشت میں اس کے غم میں
ٻہ شور و شين	زور شور سے ماتم کریں گے۔

دیگر شعرا: مرزا بڈھل بیگ کے بھائی مرزا قاسم علی بیگ قاسم اور مرزا غلام رسول بیگ مقبل بھی مرثیہ گو تھے۔ ان کے علاوہ مرزا بندہ علی نے بھی مرثیے کہے ہیں۔ خیرپور میرس کے آخوند محمد عالم پنہور (۱۸۰۰ء–۱۸۷۰ء) بھی مرثیہ کے بلند پایہ شاعر گذرے ہیں۔ ان کے مرثیہ میں جذبات نگاری، حقیقت بیانی اور منظر کشی کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ ایک مرثیہ میں سے ایک بند پیش کیا جاتا ہے:-

سندھی	اردو ترجمہ
پوءِ كولي جڏهن منهن شه جو شه اعليٰ	جب شاہ والا نے ان کا چہرہ کھول کر دیکھا
هئين چيائين ٿي صد شكر خدا راضي ٿيو آقا	تو وہ کہہ رہے تھے کہ صد شکر کہ اللہ اور ان کے رسول راضی ہوئے
ليكن منهنجو هڪ عرض آ توسين اي مولا	لیکن اے میرے آقا! آپ سے میری ایک عرض ہے
خيمي ۾ نہ لاشو كڻي وڃجان منهنجو اصلا	کہ میری لاش خیمہ میں مت لیجائیے گا
كجهہ غم نہ كجو، منهنجو حرم خاك بسر ٿئي	اگر میری زوجہ اپنے سر میں خاک ڈال لیں تو آپ فکر نہ کیجئے گا
پر منهنجي كسڻ جي نہ سكينہ كي خبر ٿئي	لیکن یہ خیال رکھئیے گا کہ میرے شہید ہوجانے کی خبر سکینہ کو ہرگز نہ ہونے پائے۔

میر حسن علی خان حسن نے بھی مرثیے اور سلام کہے ہیں۔ ان کے مرثیوں کا مجموعہ شایع ہو چکا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسلم علیہ‌السلام والے مرثیہ میں اپنی غریب الوطنی کے زمانہ کا حال بیان کیا ہے۔ وہی غربت اور اسیری، وہی قید و بند کے مصائب اور وہی دشمن کی فریب کاری اور ستم رانی۔ کہتے ہیں:

جئڙي ڪي تہ جڳ موت آ دنيا ۾ اسيري	دنیا میں ایک زندہ انسان کے لئے قید و بند گویا موت ہے
آزاد گي سان ناهہ برابر ڪا اسيري	اسیری، آزادی کی برابری نہیں کرسکتی
گو فقر ۽ فاقو هجي بهتر سا فقيري	فقیری میں اگرچہ فقر و فاقہ ہے، پھر بھی وہ بہتر ہے
آزادي جو مٽ ناهہ، نہ شاهي نہ وزيري	بادشاهی هو یا وزیری هو، آزادی کی همسری نہیں کرسکتیں
پر قيد ۽ غربت ۾ پوڻ ان کان پڻ بدتر	لیکن غریب‌الوطنی میں اسیری تو نہایت مصیبت ہے
۽ داغ الم پيءُ جو مرڻ ان کان پڻ بدتر	اور پھر اس عالم میں باپ کی دائمی مفارقت کا داغ تو اور بھی مصیبت ہے۔

حضرت قادر بخش بیدل نے بھی مرثیہ کہا ہے۔ اعدائے حسین کے حملہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

وير سان ويري اچي ٿيا سامهان	دشمن اس مرد جان باز کے مقابلہ پر آئے
ڪافرن ڪاهيو مٿن آت ناگهان	کفار نے حسین اور ان کے ساتھیوں پر اچانک یلغار کردی

قربدارن سان وڏا ٿيا امتحان	عشاق سے بڑے امتحان لئے گئے
ڪاملن تي قتل جو فرمان ٿيو	بالاخر کاملین کے قتل کا فرمان صادر ہوا۔

یہ اگرچہ مرثیہ ہے، لیکن شعری محاسن کے اعتبار سے اس میں غزل کی سی دلکشی ہے۔

نوشہرہ کے نقشبندی بزرگ شاہ نصیرالدین (وفات ۱۹۰۰ء) کے بھی چند مرثیہ ملے ہیں۔ ایک مرثیہ میں حضرت علی اصغر کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

هيءَ ٻڌي ڪوفين جو لشڪر تير اچاڻ ٿيو سيو	یہ سنتے ہی کوفیوں کے تمام لشکر نے تیراندازی شروع کردی
ناگھاني تير اچي هڪ حلق اصغر تي لڳو	اچانک ایک تیر اصغر کے حلق پر آن لگا
اوچتو اولاد احمد تي اچي هڪ ڪوس ٿيو	اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے آل رسول کا قتل عام شروع ہوگیا
غير زين العابدين جيڪو هو سو رڻ ۾ ڪُنو	زین العابدین کے سوا صحرائے کربلا میں جو بھی موجود تھا، وہ قتل کردیا گیا
موت هو محبت سندو يا برھ جو بيداد هو	معلوم نہیں یہ مرگ محبت تھا، یا بیداد عشق؟

مثنوی

مثنوی نے بھی اس دور میں خوب ترقی کی۔ متعدد شعرا نے ضخیم مثنویاں تصنیف کیں۔ سندھی میں پہلی مثنوی "سکندر نامہ" ہے، جو نظامی گنجوی کے سکندر نامہ سے ماخوذ ہے، یہ مثنوی سنہ ۱۲۹۰ھ میں لکھی گئی اور سنہ ۱۳۰۶ھ میں طبع ہوئی۔ دوسری مثنوی "گلزار واصل" محمد واصل درس نے سسئی پنہوں کی داستان پر سنہ ۱۲۹۹ھ میں تصنیف کی۔ اس کے بعد سنہ ۱۳۰۶ھ میں عبدالواحد سائل حیدرآبادی نے مثنوی "یوسف و زلیخا" لکھی۔ سنہ ۱۳۰۷ھ میں حافظ ابراهیم دل نے مثنوی "عمر مارئی" لکھی۔ اسی سال مولوی غلام اللہ نے "سیر سلیمان" کے نام سے ایک مثنوی تصنیف کی، جس میں حضرت سلیمان اور بی بی بلقیس کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ سنہ ۱۳۱۰ھ میں آخوند فقیر محمد عاجز نے مثنوی "لیلیٰ مجنوں" لکھی۔ سنہ ۱۳۱۱ھ میں غلام مرتضیٰ شاہ مرتضائی نے مثنوی "سکندرنامہ" لکھی، جو بھی نظامی ھی کے سکندرنامہ سے ماخوذ ہے۔ لیکن اس میں کچھ اضافے بھی کئے گئے ھیں اور انداز بیان ایسا اختیار کیا گیا ہے، جس سے یہ مثنوی ان کی طبعزاد معلوم ہوتی ہے۔ جنگ کی تیاری اور میدان کارزار کی طرف کوچ کرنے کی منظر کشی اس طرح کی گئی ہے (یہ سکندر شاہ روم اور پلنگر شاہ حبش و زنگ کی جنگ کا حال ہے):۔

وڄيا بين واڄا بغل توتريون — نفيرون، نقارا، وڏيون نوبتون

ڪڪر وانگي آواز نوبت جو هو — عجب برق تلوار چمڪو رکيو

وڄيا خوب واڄٽ ڪري قصد جنگ — وڄائي تو حشمت منجهان اهل زنگ

چڙهيو شاه شوقؤن جشن ڏي هلي — تراڙيون ۽ پالا مکي ۽ ملي
مڙيا روم جا مرد دانا دلير — قوي هيڪل آهن عجب مرد شير

ترجم :

بین، باجے، بیوگل اور توتارے، نفیریاں اور نقارے بجنے لگے
نوبت بجنے کی آواز بادل کی گرج کی طرح تھی۔ اور تلواریں بجلی کی طرح چمک رہی تھیں
جب جنگ کا ارادہ کیا تو خوب باجے بجائے گئے۔ جن کی آواز نے اہل زنگم کو خوفزدہ کردیا
بادشاہ رزمگاہ کو جانے کے لئے اس شوق اور مسرت سے سوار ہوئے، گویا جشن منانے کے لئے بزمگاہ کو جا رہے ہوں، اور جانے سے پہلے تلواروں اور نیزوں کو خوب چمکایا
روم کے دانا اور بہادر مرد اکٹھے ہوئے جو سب کے سب قوی ہیکل اور شیر مرد تھے۔

مرتضائی کی اس مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے غلام محمد نظامانی کے سکندر نامہ سے مدد لی ہے۔ نظامانی کی مثنوی سکندر نامہ آج کل نایاب ہے۔ اس کے متعلق صرف اس قدر پتہ چلا ہے کہ وہ سنہ ۱۲۹۹ھ اور سنہ ۱۳۱۱ھ کے درمیان لکھی گئی تھی۔ مرتضائی نے گل محمد رند کی ترجمہ کردہ مثنوی سکندر نامہ بھی دیکھی تھی۔ یہ مثنوی بھی نایاب ہے۔ مرتضائی نے "یوسف و زلیخا" کے نام سے بھی ایک مثنوی لکھی تھی، جس میں میر صاحبان کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

ٻڌيم جيڪا بلوچن بادشاهي — اميرن سنڌ جي سانديا سپاهي
شريفن جو سدائين هت شرف هو — جدا درجي ۾ تن کان ناخلف هو

عدالت سان شريعت مصطفائي — ۽ ملت سان طريقت مرتضائي
زمين سنڌ هئي زرخيز هر جا — ڪٿ هو ڪوڻ، سڀڪو هو توانا

ترجمہ:-

میں نے بلوچوں کی بادشاہی کی بہت سی داستانیں سنی تھیں۔
سندھ کے میر صاحبان نے سپاہی پال رکھے تھے اور ان کی سرپرستی کرتے تھے
ان کے یہاں شرفا کی عزت تھی، اور غیر شرفا کی کوئی قدر و منزلت نہیں تھی
عدالتی کارروائی شریعت محمدی کے مطابق ہوتی تھی، اور مسلک سب کا علی المرتضیٰ کا اتباع تھا
سندھ کی سرزمن تمام کی تمام زرخیز تھی، کوئی بھی مفلس نہیں تھا، سب کے سب خوشحال اور تندرست و توانا تھے۔

مرتضائی نے ایک اور مثنوی "شاھنامہ" بھی لکھی ہے، جو شاھنامۂ فردوسی کی چند داستانوں کے ترجمہ پر مشتمل ہے۔ سنہ ۱۸۹۵ء میں واحد بخش مشتاق شکارپوری نے ایک مثنوی "قصۂ سسئی پنھل" تصنیف کی۔ سنہ ۱۳۱۸ھ میں میر حسن علی خان ٹالپور (وفات ۱۹۰۹ء) نے "شہنشاہ نامہ یا حملۂ حیدری" کے نام سے ایک مثنوی تصنیف کی تھی، جو اب تک شایع نہیں ہوئی۔ میر صاحب کی ایک اور مثنوی "شاھنامۂ سندھ" ہے، جو ایک رزمیہ مثنوی ہے، اور شاھنامہ اور سکندر نامہ کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس میں کلہوڑوں اور میر صاحبان کے جدال و قتال کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ فنی اعتبار سے خواہ محاسن شعری کے لحاظ سے یہ ایک اچھی مثنوی ہے۔ چند ابیات بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:-

اچي مير کي چيائين اي شهسوار — وڙهڻ آيو آهيان ٿي تون هوشيار
مون کي مثل سلطان تصور نہ ڪر — آءٌ آهيان وڏو پهلوان پُر هنر
چيو مير بس بس تڪبر نہ ڪر — نہ هڻ لاف بيهودگي ان قدر
سندم جنگ جو تو کي آهي ڪو تاب — تون سنهن موڙي ويندين پڇي باشتاب

ترجم (١):-

میر صاحب سے آکر کہا کہ اے شہسوار! خبردار ہو جا، میں آپ سے لڑنے آیا ہوں

مجھے سلطان کی طرح نہ سمجھنا، میں بڑا بہادر اور اہل فن ہوں

میر صاحب نے کہا، بس بس، اس قدر غرور نہ کر اور نہ اتنی لاف زنی کر

تو میرے مقابلے کی تاب نہیں لا سکے گا اور جلد ہی پیٹھ دے کر بھاگ کھڑا ہوگا۔

آخوند فقیر محمد عاجز نے "گلشن راز" کے نام سے ایک اور مثنوی تصوف کے مسائل پر تصنیف کی، جس سے دو بیت بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں:-

نہ ڪر تابش انهن گفتن کان انڪار	اے دوست! ان باتوں سے انکار نہ کر
انهن ۾ ڳولهي لهہ مقصود اي يار	تو ان میں سے اپنا مقصد ڈھونڈ کر نکال لے
اها صوفين جي ٻوليءَ جي عبارت	یہ صوفیا کی زبان ہے
پروڙي مغز ان جي ڪر عبادت	تو اس کے لب لباب کو سمجھکر عبادت میں مشغول ہو جا۔

(١) یہاں یہ وضاحت ضروری تھی کہ یہ مکالمہ کس کس کے درمیان ہوا۔ (مترجم)

بعض علماء نے مثنوی میں خطبے بھی لکھے ہیں۔ مولوی محمد عثمان نورنگزادہ (وفات ١٩١٨ء) کے خطبات میں سے نمونہ کے طور پر دو تین بیت پیش کئے جاتے ہیں:-

دنيا اٿئي بيشڪ بلا — تنهن تي م ٿي تون مبتلا
ڪوڙي ڪميني پر دغا — هردم ڪري ٿي سا جفا
ٿي ادا ڪي هوشيار — الله اڪبر ياد ڪر

ترجمہ:-

یہ دنیا بلا شبہہ ایک مصیبت ہے۔ اس میں مبتلا نہ ہونا
جھوٹی، کمینی اور دغاباز۔ ہر وقت ظلم و ستم کرتی رہتی ہے
بھائی کچھ عقل سے کام لے۔ اور اللہ اکبر یاد کر۔

ان کے علاوہ گدا، سید فاضل شاہ، شمس‌الدین بلبل، بچل ھیموں پوتہ اور مرزا قلیچ بیگ نے بھی مثنویاں تصنیف کی ہیں۔ متعدد دیگر شعرا کی مثنویاں بھی ملی ہیں۔ موجودہ دور میں جن شعرا نے اس صنف پر طبع آزمائی کی ہے، ان میں ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل، لیکھراج کشنچند عزیز، حافظ محمد احسن چنہ، عطا محمد حامی، رشید لاشاری اور نور شاہین کے اسما قابل ذکر ہیں۔

باب نہم

فصل اول

قومی اور اصلاحی شاعری

قومی اور اصلاحی شاعری کے بانی اللہ بخش ابوجھو ھیں۔ انھوں نے سنہ ۱۸۸۴ء میں "مسدس ابوجھو" لکھی، جو سندھی زبان کی پہلی مسدس ہے۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ مسدس حالی کا ترجمہ ہے، اور دوسرا ان کا اپنا طبعزاد۔ آخری حصے میں "سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی" کے قیام کا حال بیان کیا ہے، اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے اور سندھ کے ھندوؤں اور مسلمانوں کو بھائی چارہ کی تلقین بھی کی گئی ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک بند پیش کیا جاتا ہے:۔

صلح سانت سان جي سيئي گڏ گذاريو	اگر سب امن و صلح کے ساتھ رہنے لگو
انھيءَ ڳالھ ۾ جي سچي سمجھہ ڏاريو	اور اگر اس بات کو اچھی طرح سے محسوس کرو
نمي ننگ وطني اوھين جي نھاريو	اگر جھک کر ھموطن ھونے کی طرف نظر کرو
انھيءَ ڳالھ کي غور سان جي ويچاريو	اور اگر اس بات پر غور و خوض کرو

تہ کھڑو نہ سک ٿي پوي سپ کنھين کي	تو سب آرام و اطمینان کے ساتھ بسر کریں
ٿئي سنڌ، کشمير وطني پنھين کي	اور سندھ دونوں کے لئے کشمیر بن جائے۔

ان کے بعد سندھی کے عظیم شاعر شمس الدین بلبل ہیں، جنہوں نے طنز و مزاح کے رنگ میں معاشرہ کی برائیوں پر تنقید کی۔ ان کی "کریما نیچرل" خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، جس میں شیخ سعدی کی "کریما" پر گویا تضمین کی ہے اور اس کے مصرعہ ثانی پر اپنی طرف سے سندھی میں مصرعہ اولیٰ لگایا ہے۔ اس میں بلبل نے مغرب زدہ نوجوانوں پر طنز کیا ہے۔ نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

پيارج کو اج بير وسکيءَ جو پيا — کريما بہ بخشائے بر حال ما
متان ھي اسان کي منجھائين ملا — نگھدار ما را ز راہ خطا
سکيو جو نہ گڊ مارننگ، ماءِ ڊيئر — بھشتي نباشد بحکم خبر

ترجمہ:-

آج بیئر اور وھسکی کا جام پلا، کریما بہ بخشائے بر حال ما
مبادا یہ ملا ہمیں الجھادیں، نگھدار ما را ز راہ خطا
جس نے گڈ مارننگ اور مائی ڈیئر کہنا نہیں سیکھا، بہشتی نباشد بحکم خبر۔

یہ پہلے شاعر تھے جنہوں نے ظریفانہ انداز میں اصلاحی شعر کہا اور اس کے ذریعہ مسلمانوں کو بیدار کیا۔ مغربی تہذیب کی مذمت کی اور اپنی تہذیب و ثقافت کے لئے محبت کے جذبہ کو ابھارا۔ یہی وجہ ہے کہ حاجی محمود خادم نے کہا تھا کہ "سندھی ادب کا جدید دور بلبل سے شروع ہوتا ہے"۔

طنز و مزاح اور قومی شاعری کے سلسلہ میں شمس الدین بلبل

کے بعد محمد ہاشم مخلص کا نام لیا جا سکتا ہے، جو ایک کہنہ مشق صحافی اور پختہ فکر شاعر تھے۔ انہوں نے سنہ ۱۹۲۴ء میں میرپورخاص سے ہفتہ وار "مسلمان" جاری کیا، جس کے دو چار صفحات ان کی تازہ ترین نظموں سے مزین ہوتے تھے۔ مخلص نے تحریک خلافت میں زبردست حصہ لیا، اور اپنی نظم و نثر سے پورے سندھ میں آگ لگادی۔ وہ برطانوی سامراج سے علانیہ اظہار نفرت کرتے تھے اور اسے بڑی جرأتمندی سے للکارتے رہتے۔ اس کے نتیجہ میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرتے تھے۔ مسلمان حکمرانوں کی تعریفیں کرتے، اور خوش ہوتے تھے۔ اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے ہمیشہ دعائیں مانگتے تھے۔

برطانوی حکومت نے بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کا اصول سنہ ۱۹۳۲ء کے بالکل اخیر میں تسلیم کرلیا تھا۔ اس کے بعد حیدرآباد میں سنہ ۱۹۳۳ء کے نصف اول میں "سندھ آزاد کانفرنس" منعقد ہوئی، جس کے پہلے اجلاس میں مخلص نے ایک طویل مسدس پڑھا، جس میں سندھ کی علیحدگی پر اظہار مسرت، علیحدگی کی مخالفت کرنے پر ہندوؤں کی مذمت اور سندھ کی تعریف کی گئی تھی۔ اس مسدس میں سے ایک بند بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

کریان آخر تو کجھ احوال ھت مرقوم سنڌڙيءَ جو
خدا جا خلقيو ھو خوبتر مقسوم سنڌڙيءَ جو
برابر شير جي، طاقت ۾ ھر معصوم سنڌڙيءَ جو
شگفتہ چون گل ريحان ھومرز و بوم سنڌڙيءَ جو
نظر ڪٿي سون تہ ھرڪا جنس سستي ۽ سھانگي ھئي
فقط ھڪ زندگي بيمار الفت جي مھانگي ھئي

ترجمہ:-

آخر میں سندھ کا کچھ حال بیان کرتا ہوں

اللہ تعالیٰ نے سندھ کا مقسوم کیا ہی خوب سے خوبتر بنایا ہے

سندھ کا ہر بچہ شیر مرد ہے

سندھ کا ملک گل ریحان کی طرح شگفتہ ہے

ہم جب دیکھتے ہیں تو ہمیں ہر چیز وافر اور سستی نظر آتی ہے۔

صرف ایک بیمار عشق ہی ہے، جس کی زندگی مہنگی ہے۔

مخلص کی، اپنے ہمعصر صحافیوں سے نوک جھونک رہتی تھی۔ ان میں ایک مولوی نور محمد نظامانی بھی تھے۔ انہوں نے مختلف اوقات میں تین اخبار "نور اسلام"، "مرغ فلک" اور "طیراً ابابیل" جاری کئے۔ وہ مخلص ہی کی طرح بڑے پایہ کے صحافی اور شاعر تھے۔ نظم اور نثر پر یکساں قدرت رکھتے تھے اور غضب کے طنز نگار اور ہجوگو تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی علمی اور قلمی صلاحیتیں محض طنزنگاری اور ہجو گوئی ہی میں بے سود ضایع نہیں کیں، بلکہ اپنے تینوں اخبارات کے ذریعہ آریہ سماجی ہندوؤں کے خلاف ایک محاذ برپا کرکے اپنا تماستر زور قلم ان کی بیخ کنی اور ان کی شرارتوں کے قلع قمع پر صرف کیا۔

اس دور میں حکیم فتح محمد سہوانی (وفات ۱۹۴۲ء) نے بھی متعدد قومی نظمیں کہیں۔ ایک نظم میں اپنے وطن سندھ کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

وطن منهنجو آهي وڏي شان وارو	میرا وطن بڑے شان والا ہے
وطن منهنجو داتا سدا دان وارو	میرا وطن داتا اور ہمیشہ دان دینے والا ہے

سندھی	اردو
جو ڏئي مان ان کي سو ٿئي مان وارو	جو میرے وطن کی عزت کرتا ہے، اسے عزت ملتی ہے
وساري وطن کي نہ ايمان وارو	ایمان والا وطن کو فراموش نہیں کر سکتا
ٿيو حب وطن آھ ايمان منھنجو	حب وطن میرا ایمان ہے
اتي ماني منھنجي، اتي مان منھنجو	یہیں مجھے رزق ملتا ہے اور یہیں مجھے عزت ملتی ہے۔

آغا غلام نبی صوفی (وفات ۱۹۳۸ء) اگرچہ صوفی شاعر تھے تاہم انہوں نے متعدد قومی نظمیں بھی کہی ہیں۔ مولانا تاج محمود امروٹی (وفات ۱۹۲۹ء) کی بھی متعدد قومی نظمیں ملی ہیں، جن میں ترکوں کی مدح اور انگریزوں کی مذمت کی گئی ہے۔ انگریزوں کے ظلم و جبر کی وجہ سے عوام کا کیا حال تھا اور خود غرض اور ضمیر فروش لوگوں کی کیا کیفیت تھی، اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں:

سندھی	اردو
ڏٺي در تي تنھنجي کھڙي کريان فرياد مان ھاڻي	اے خدا! میں تیرے دروازہ پر اب کیا فریاد کروں
لڄا تنھنجي. کسي طمع وٺي ويڙھي طمع راڻي(۱)	شرم وحیا نہیں رہی اور خودغرضی اور لالچ نے گھیر لیا ہے
وڏو ھٿ نوکرن نڙ ۾ کيون کرسيون اسان قابو	ملازم پیشہ لوگوں کا ھاتھ ہماری گردن میں ہے اور ہم کرسیوں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں

(۱) مصرعہ ثانی غلط بھی ہے اور غیر موزوں بھی۔ (مترجم)

اسان جا منہ ٿيا سپ بند ٿيا چپ وات سپ ساٽي	نہ عقل کام کرتی ھے نہ زبان ساتھ دیتی ھے
اڳيئون ويھي ڪرسين اتي ايمان ڏنو سارو	کلکٹر کرسی پر جلوہ افروز ہوتے ھیں اور ھم اپنا ایمان ان کو نذر کرتے ھیں
چوي جيڪو محيئون سوئي اڳيئون نھڪر نڪا آٽي	وہ جو کچھ کہتے ھیں، ھم بلا پس و پیش اسے مان لیتے ھیں۔

مولانا امروٹی کے ھمعصر اور ان کے معتقد حبیب‌اللہ خادم شکارپوری نے بھی اس قسم کا شعر کہا ھے۔ حافظ عبداللہ بسمل ٹکھڑائی (وفات ۱۹۵۰ء) اور محمد صدیق مسافر نے بھی اس سلسلہ میں اپنے جذبات کا خوب اظہار کیا ھے۔ بسمل اہل سندھ کے تابناک مستقبل کے متعلق کہتے ھیں:

نظر ۾ پيو اچي ساڳيو اڳيون اقبال سنڌين جو
خدا گھريو تہ ٿيندو جلد بھتر حال سنڌين جو
فلڪ تي بدر ٿيندو ڪوڪب اجلال سنڌين جو
قرين ڪامراني ٿيندو ماہ و سال سنڌين جو
زمانو ٿيندو حيرت ۾ ڏسي سنڌي جلالت کي
سگھو ڳائيندي دنيا ھن اسان جي عز و عظمت کي

ترجمہ:

مجھے اہل سندھ کا پھر وھی پہلا سا اقبال نظر آ رہا ھے
اللہ نے چاھا تو اہل سندھ کا حال جلد بہتر ہوگا
اہل سندھ کے اوج و عروج کا ستارہ پھر بدر کامل بن جائیگا
اور ان کا ماہ و سال کامیابی و کامرانی سے ھمکنار ہوگا

سندھ کی عظمت و شان دیکھ کر زمانہ حیرت زدہ رہ جائیگا اور دنیا عنقریب ہماری عزت و عظمت کے گیت گانے لگے گی۔

مرزا قلیچ بیگ نے بھی متعدد اصلاحی نظمیں کہی ہیں۔ لیکن اس نوعیت کی شاعری میں غلام احمد نظامی کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی بیداری اور تحریک پاکستان کی تائید و حمایت میں متعدد نظمیں کہیں اور اقبال کی متعدد نظموں کا ترجم بھی کیا۔ ان کے کلام کے دو مجموعے "بیاض نظامی" اور "ریاض نظامی" اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ ان کے ایک مسدس سے ایک بند پیش کیا جاتا ہے:-

ٿي ختم اي نظامي! جنهن ديس ۾ جواني
تنهن ۾ قبول آهي سستائي يا گراني
حب وطن ۾ آهي ايمان جي نشاني
سڀ ياد دل سان ڪريو هي بيت برزباني
بلبل کي گل پيارو، گل کي چمن پيارو
مون کي سدائين آهي پنهنجو وطن پيارو

ترجم :

اے نظامی! جس ملک میں جوانی بیت گئی
وہاں سستائی ہو یا گرانی، منظور ہے
حب وطن ایمان کی علامت ہے
دوستو! ہمیشہ اس عقیدہ پر کاربند رہا کرو
بلبل کو گل پیارا ہے، گل کو چمن پیارا ہے
لیکن مجھے ہمیشہ اپنا وطن پیارا رہا ہے۔

ان کے علاوہ دیگر متعدد شعرا نے بھی قومی اور اصلاحی شعر کہے ہیں، جن میں سے محمد بخش واصف، جمعہ خان غریب،

حاجی محمود خادم ، لطف اللہ بدوی ، مولابخش مسکین ، قادر بخش بشیر ، ڈاکٹر خلیل اور حافظ محمد احسن چنہ کے اسما قابل ذکر ہیں۔ مزاحیہ شاعری کے سلسلہ میں امام الدین ضامن اور واحد بخش عاشق کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ہندو شعرا میں سے کشنچند بیوس، ہوندراج دکھایل اور کھیئلداس فانی کا قومی اور اصلاحی شعر قابل توجہ ہے۔

فصل دوم

جدید شاعری

جدت پسندی ہر دور میں موجود رہی ہے۔ لیکن جدت کی نوعیت اور اس کے انداز مختلف ہوتے ہیں۔ گدا اور سانگی کے دور میں عروضی شاعری اور خصوصاً غزل کی شاعری کو جدید تصور کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ سانگی نے شاہ لطیف کے عقیدتمند ہونے کے باوجود غزل کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ اس دور سے لیکر دوسری جنگ عظیم کے زمانہ تک عروضی شاعری اور اس کی قدیم روایات کو بڑی اہمیت حاصل رہی۔ البتہ تقاضائے وقت کے تحت بعض شعرا نے عروضی شاعری کے پرانے انداز بدلنے کی کوشش کی۔

عروضی شاعری میں نیا موڑ پیدا کرنے والے اولین شاعر شمس الدین بلبل ہیں، جنہوں نے اپنی شاعری سے پیغام کا کام لیا۔ انہوں نے معاشرہ کی کمزوریوں پر تنقید کی اور طنز و مزاح کے تیر و نشتر سے ان کی جراحی کی کوشش کی۔ ان کے بعد محمد ہاشم مخلص نے شاعری کے ذریعے معاشرہ کی کوتاہیوں پر نکتہ چینی کی اور برطانوی سامراج کے خلاف باغیانہ خیالات کا اظہار کیا۔ اسی طرح بعض دیگر شعرا نے بھی تقاضائے وقت کے تحت عروضی شاعری ہی کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

بعد میں کشنچند تیرتھداس بیوس (۱۸۸۵ء — ۱۹۴۷ء) نے تحریک آزادی کے سلسلہ میں پر زور قومی نظمیں کہیں اور عروضی شاعری کی قدیمی روایات کو ترک کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے

اپنے شعر میں کسانوں اور مزدوروں سے اظہار ہمدردی کیا اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو موضوع سخن بنایا۔ ان کے مجموعۂ کلام "شیرین شعر" کو سندھی ادب میں وہی حیثیت حاصل ہے، جو انگریزی ادب میں ورڈس ورتھ اور سیموئل کالرج کے مجموعۂ کلام "لریکل بیلڈس" کو حاصل ہے۔ کیونکہ اسی مجموعہ کے منظرعام پر آنے کے بعد سندھی شاعری میں نئے موڑ کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ بیوس نے سندھی شاعری کو نئے رجحانات اور نئے موڑ ضرور دیئے، لیکن فنی اعتبار سے ان کا کلام غیر پختہ ہے اور اس میں زبان و بیان کی خامیاں بھی موجود ہیں۔

بیوس کی ایک نظم "جھونپڑی" کو شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی اس نظم سے ایک بند پیش کیا جاتا ہے:

چانگي چنو اڏيائون جو لامن لکن منجهان
سارو اجھو سٽيائون پراڻن پکن منجهان
ڪاڍوڪڍيائون ڪڙٻ جي ڪانن ڪکن منجهان
مفتي مدد تي آيا، مڃي، مڙس ٿي، مڙئي
الا، جهري م شال غريبن جي جهوپڙي

ترجمہ:

درختوں کی لاکھوں شاخیں کاٹ کر جھونپڑی بنائی
پرانے کاشانے کو درہم برہم کر دیا
جھونپڑی کی تعمیر میں جوار کی تیلیوں اور تنکوں سے مدد لی گئی۔
اور اس کی بناوٹ میں رضاکارانہ تعاون کے لئے سب مرد اکٹھے ہو گئے۔
خدا کرے غریبوں کی جھونپڑی شکست و ریخت سے بچ جائے۔

مشہور سیاسی لیڈر اور کسانوں کے حقوق کے علمبردار حیدربخش جتوئی (۱۹۰۰ء — ۱۹۷۰ء) بھی بلند پایہ شاعر تھے۔ انہوں نے اپنے شعر میں ترقی پسندانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے کلام میں کسانوں کی پست حالی کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے کلام کا پہلا مجموعہ "تحفۂ سندھ" سنہ ۱۹۳۰ء میں شایع ہوا، جس کی ایک نظم "شکوہ" پر زبردست اعتراضات کئے گئے۔ اسی مجموعہ کی ایک اور نظم "درياه شاه" شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے، جس کا ایک بند بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

ٿي ساوڻ ۾ توکي بهاري ٿئي
بهاريءَ ۾ خوش خلق ساري ٿئي
ٿي ساريءَ سان ڌرتي بہ ڪاري ٿئي
ٿي هرڪا زمين برک واري ٿئي
ٻنيون ريج ڪائين، سگهو آن آپائين
پرن واهہ ڀيلا ڪري جهنگ ٻيلا
ٿئي جهنگ جهر ڀاٽي ٿو چار ماه
پلي آئين، جي آئين درياه شاه

ترجمہ:

اے دریا! تجھے ساون میں خوشی و مسرت ہوتی ہے
اس موسم میں تمام مخلوق کو خوشی ہوتی ہے
چاول کی کاشت سے ساری زمین سرسبز و شاداب ہوتی ہے
اور دیگر فصلوں والی زمینیں بھی شاداب ہو جاتی ہیں
زمین کو پانی ملتا ہے، وہ اناج پیدا کرتی ہے
ندی نالے پانی سے بھر جاتے ہیں اور جنگل ہرے بھرے ہو جاتے ہیں

پانی کی کثرت سے چار مہینے تک جل تھل رہتا ھے
اے دریاء شاہ مرحبا، صد مرحبا۔

"تحفۂ سندھ" کے بعد حیدربخش جتوئی کے دیگر دو شاھکار مجموعۂ کلام "آزادیٔ قوم" اور "ھاری گیت" (کسانوں کے گیت) بھی شایع ھوئے۔ ان کے کلام میں انسان دوستی، وطن سے پیار اور محبت، اور کسان اور مزدور کے ساتھ ھمدردی کے جذبات جھلکتے ھیں۔ وہ قادر الکلام شاعر تھے اور انسانی جذبات کی مکمل ترجمانی اور مناظر فطرت کی بھرپور عکاسی پر پوری پوری قدرت رکھتے تھے۔

سنہ ۱۹۳۶ء کے قریب برصغیر کے ترقی پسند ادیبوں نے ترقی پسندی کی جو تحریک شروع کی، اس کا اثر سندھ پر بھی ھوا، اور یہاں کے نوجوان شعرا انقلاب اور بغاوت کا نعرہ بلند کرنے لگے۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں "انجمن ترقی پسند مصنفین" کے نام سے ایک جماعت وجود میں آئی جس کے سکریٹری گوبند مالی ھوئے۔ انہوں نے ترقی پسندانہ رجحانات کو فروغ دیا۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں ماھنامہ "آگے قدم" جاری ھوا، جس میں شیخ عبدالرزاق راز کی آزاد نظم شایع ھوئی۔ اس نظم کو سندھی زبان کی پہلی آزاد نظم تصور کیا جاتا ھے۔ نارائن شیام نے مغربی شاعری کی ایک صنف "سانیٹ" پر تجربے کئے۔ شیخ ایاز نے گیت اور نظم میں نئے تجربے کئے۔ اس کے بعد ترقی پسند نوجوانوں نے دو ماھنامے "پرہ پھٹی" اور "نئی دنیا" جاری کئے۔ شیخ عبدالرزاق راز کی نظمیں گوبند مالی کے رسالہ پرہ پھٹی میں بھی شایع ھوتی رھیں۔ شیخ ایاز نے انقلاب اور بغاوت کے گیت گائے۔ ان کا ایک گیت "میں باغی ھوں، میں باغی ھوں" بہت ھی مشہور ھوا۔ ان کے علاوہ کھیئلداس فانی، ھری دریانی دلگیر اور عبدالکریم گدائی نے بھی ترقی پسندانہ شاعری سے متاثر ھو کر شعر کہا۔

باب دہم

موجودہ دور

تعارف

سنہ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا، اور پاکستان وجود میں آیا۔ ہجرت ہوئی، ہندو سندھ سے چلے گئے اور ہندوستانی سندھ میں آئے، جس سے سندھی ادب کی ترقی متأثر ہوئی اور چند برس تک سندھی ادب پر جمود طاری رہا۔ جو ہندو ادیب ترک وطن کر گئے، ان میں سے کہنہ مشق اہل قلم کا چند ہی برس کے اندر انتقال ہوا۔ جیٹھمل پرسرام سنہ ۱۹۴۸ء میں، کاکو بھیرومل سنہ ۱۹۵۳ء میں اور لعلچند امرڈنومل سنہ ۱۹۵۴ء میں وفات پا گئے۔ اس طرح سندھی زبان کے دو مرکز ہوگئے یا ایک مرکز دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ ایک سندھ میں اور دوسرا ہند میں۔ دونوں خطوں میں ادیب وقت اور نئے حالات سے متأثر ہوئے اور سندھی ادب نے ایک نئی صورت اختیار کرلی، اور سندھی افسانہ نے خصوصیت کے ساتھ ترقی کی۔ معاشرتی مسائل سندھی ادیب اور شاعر کے مطمع نظر بن گئے۔ شاعری میں حسن و عشق اور گل و بلبل کا ذکر کم ہوگیا، اور ان کی جگہ معاشی اور معاشرتی مسائل نے لے لی۔

قیام پاکستان کے بعد "پاکستان پبلیکیشن" کی جانب سے ایک پندرہ روزہ سندھی رسالہ "اطلاعاتی بلیٹن" جاری ہوا، جس نے سنہ ۱۹۵۰ء میں ماہنامہ "نئی زندگی" کے نام سے ایک ادبی رسالہ کی

صورت اختیار کی۔ تقسیم کے بعد ادب میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا "نئی زندگی" نے اسے پُر کرنے کی کوشش کی۔ سنہ ۱۹۵۱ء میں "سندھی ادبی بورڈ" قائم ہوا، جس نے سندھی ادب، سندھی لغت اور سندھ کی تاریخ کی طرف مناسب توجہ دی۔ سنہ ۱۹۵۵ء میں بورڈ کی جانب سے سہ ماہی "مہران" جاری ہوا، جس نے تحقیقی ادب کی طرف توجہ مبذول کی، اور ساتھ ھی ساتھ جدید سندھی افسانہ اور جدید سندھی شاعری کی ترقی کا باعث بھی بنا۔ شیخ عبدالرزاق راز کی کوشش سے سنہ ۱۹۵۲ء میں "حبیب پبلیکیشن" کے نام سے ایک ادارہ قائم ہوا، جس نے جدید ادب سے متعلق نہایت ھی معیاری کتابیں شایع کیں۔ مثلاً شیخ عبدالرزاق راز کا مجموعۂ کلام سارنگ، ان کی کہانیوں کا مجموعہ ڈاک بنگلہ، ان کا ڈرامہ فاتحِ سندھ، شیخ ایاز کے افسانوں کا مجموعہ "پنھل کان پوء" مختلف افسانہ نگاروں کے افسانوں کا مجموعہ "پھول اور غنچے" اور کریم بخش خالد کی تحقیقی کتاب "سندھی صحافت" (۱) وغیرہ۔

نوجوان ادیبوں نے جدید ادب کی ترقی اور سندھی زبان کی خدمت کے جذبہ کے تحت کراچی میں "سندھی ادبی سنگت" برپا کی، جس نے سنہ ۱۹۵۶ء میں "سندھ سنگت" کی صورت اختیار کر لی۔ سنگت کو کامیاب بنانے کے لئے محترم ایاز قادری نے بڑی جانفشانی کی۔ کراچی میں ان کی قیام گاہ پر ہر ھفتہ سنگت کے جلسے منعقد ہوتے، اور تھوڑے ھی عرصہ میں سندھ کے مختلف شہروں میں سنگت کی متعدد شاخیں قائم ھوگئیں۔ ان کے علاوہ وقتاً فوقتاً

---

(۱) یہ کتاب غلط باتوں سے معمور ھے۔ اس کو "تحقیقی کتاب" کہنا "تحقیق" کا مذاق اڑانا ھے (مترجم)۔

متعدد انجمنیں اور اشاعتی ادارے قائم ہوئے، جنھوں نے اپنی استعداد کے مطابق سندھی زبان اور ادب کی خدمت کی۔ ان انجمنوں اور اداروں میں سے حسب ذیل کے نام قابل ذکر ہیں:-

جمعیت الشعراء سندھ، بزم طالب المولیٰ، شاہ لطیف یادگار کمیٹی، انسٹی ٹیوٹ آف سندھالاجی، سندھی ادبی اکیڈمی لاڑکانہ، لطیف اکیڈمی سکھر، سندھی ادبی سوسائٹی اسلامیہ کالج سکھر، ادارۂ آواز ادب، رہبر پبلیکیشن، رونق پبلیکیشن، سندھی زبان پبلیکیشن، سوھنی پبلیکیشن، روح رھان پبلیکیشن، ادارہ ادب نو، سچل سرمست اکیڈمی وغیرہ۔

نئی زندگی اور سہ ماہی مہران کے علاوہ مندرجۂ ذیل رسالے جاری ہوئے، جو کچھ عرصہ کے بعد بند ہوگئے:-

حیدرآباد سے روح رھان، گوٹھ سدھار، مارئی، لطیف، شاعر، گلستان، سرتاج، اسان جی دنیا، طبی میگزین، طبیب، گل پھل، روح ادب، آفتاب، نئی کھیتی، سارنگ، ادب لطیف، شعلہ، انسان، تلیچ۔

کراچی سے پرہ پھٹی، ہمدرد صحت اور شاگرد۔

شکارپور سے مہران ڈائجسٹ، جذبات۔

خیرپور سے گلدستہ۔

نوابشاہ سے ادا، آئینہ، رهنما۔

سانگھڑ سے سانگھڑ پبلیکیشن۔

جیکب آباد سے آمنگ۔

رتوڈیرو سے بادل۔

لاڑکانہ سے ادیب سندھ، مذھب انسانیت۔

دادو سے اسانجی منزل۔

میہڑ سے طالب المولیٰ۔

سکھر سے پارس، تقاضا۔

موجودہ وقت میں حیدرآباد سے سوھنی، رھبر ڈائجسٹ، اگتے قدم، پیغام، ملیر ڈائجسٹ اور دیگر چھوٹے رسالے شایع ھو رھے ھیں۔ شکارپور سے محل پبلیکیشن کی طرف سے کتابی سلسلہ جاری ھے۔ ٹنڈو محمد خان سے بچوں کا کتابی سلسلہ کافی عرصہ سے جاری ھے۔ کراچی سے خواتین کا سندھی ماھنامہ ادیوں باقاعدگی سے شایع ھو رھا ھے۔ ان کے علاوہ بعض اور ادارے بھی ھیں جو کتابی سلسلہ چلا رھے ھیں۔ روزنامہ اور ھفت روزہ اخبارات نے بھی زبان اور ادب کی بڑی خدمت کی ھے۔ روزنامہ مہران کے ضخیم سالنامے، عبرت اور ھلال پاکستان کے ماھوار ایڈیشن یادگار پرچے ھیں۔ ھفتہ وار اخبارات میں سے ذوالفقار گھوٹکی، آزاد کراچی، صبح سندھ کراچی اور صفدر کندھ کوٹ وقتاً فوقتاً معیاری مضامین، افسانے اور شعر شایع کرتے رھتے ھیں۔

ادبی رجحانات

تقسیم کے بعد سندھی ادیبوں نے نیا رخ اختیار کیا۔ جدید دور کے شعرا نے تقلیدی شاعری کو ترک کر کے شاعری کو ایک نیا رنگ روپ دیا۔ فنی اعتبار سے انہوں نے عروضی شاعری کی صنفوں غزل اور نظم میں نئے تجربے کئے اور انہیں سندھی شاعری کے مزاج سے ھم آھنگ کرنے کی کوشش کی، اور اس کے ساتھ ھی قدیم سندھی شاعری کی صنفوں بیت، وائی اور کافی پر طبع آزمائی کر کے ان میں نئے انداز سے نئے مضامین بیان کئے۔ ھندی شاعری کی صنف گیت میں بھی متعدد کامیاب تجربے کئے گئے۔ اسی طرح انہوں نے

مغربی صنفوں آزاد نظم، غیر مقفیٰ نظم، سانیٹ، ترائیل اور جاپانی صنف "ھائیکو" اور پنجابی صنف "ماھیا" میں بھی اپنے جذبات و خیالات بیان کئے۔

زبان کے اعتبار سے فارسی اور عربی کے الفاظ کو ترک کرنے کی کوشش کی گئی، اور خالص سندھی کے الفاظ کے استعمال پر زور دیا گیا۔ اصطلاح، محاورے، ضرب الامثال، اور تشبیہات و استعارات بھی سندھ کے ماحول سے اور قدیم سندھی شاعری سے اخذ کئے گئے۔

مضمون اور موضوع کے لحاظ سے بھی جدید دور کے شعرا کی فکر نے نیا رخ اختیار کیا اور انہوں نے ماحول اور معاشرہ کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد حقیقت پسندانہ انداز میں معاشی اور معاشرتی حالات کی ترجمانی بھی کی اور ان پر تنقید بھی۔ سندھ، سندھی زبان، سندھی ادب اور سندھی ثقافت کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئیں، ان کے رد عمل کے طور پر وطن دوستی اور سندھی زبان و ادب کے تحفظ و بقا کا جذبہ بیدار ہوا۔ شعرا اور ادیبوں نے اس جذبہ کے تحت وطن کے گیت گائے، نوجوانوں کو بیدار کیا اور ان میں سندھی زبان اور سندھ کے ساتھ محبت کا جذبہ پیدا کیا۔ بعض شعرا نے بین الاقوامی مسائل پر بھی اظہار خیال کیا اور دنیا کے مظلوموں کی حمایت کرتے ہوئے سامراجی قوتوں کی مذمت کی۔

اس دور میں سندھی افسانہ نے بھی بڑی ترقی کی۔ افسانوں میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کے جبر و تشدد کو نمایاں کیا گیا۔ کسان اور مزدور کی بدحالی کا نقشہ موثر انداز میں پیش کیا گیا، اور سندھی ماحول، ثقافت اور مزاج کی صحیح عکاسی کی گئی۔ اس دور کے افسانوں میں انسان دوستی کے جذبات، حب وطن کے احساسات

اور بین الاقوامی سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظریات واضح اور نمایاں نظر آتے ھیں۔

ذیل میں نثر اور نظم کے مختلف اصولوں کا جائزہ پیش کیا جاتا ھے۔

ناول نگاری

تقسیم کے بعد ناول کی ترقی خاصی متاثر ھوئی اور ناول نگاری کی رفتار کم ھوگئی۔ اس کے باوجود بعض اداروں مثلاً: فردوس پبلیکیشن ھالا، ادارۂ سندھی ادب ٹنڈو محمد خان، ادبی ادارہ حیدرآباد، پرہ پھٹی حیدرآباد اور ادارۂ آواز ادب حیدرآباد نے چند ناولیں شایع کیں، جن میں سے انجم ھالائی کی ناول "کاروان زندگی"، حسینی محمد حافظ کی ناول "تباھی"، سید حیدر شاہ کی "زمیندار"، رسول بخش خمار کی "حسنہ"، حافظ حیات شاہ کی "سلطانہ"، قاضی عبدالکریم کی "نوراں"، فضل احمد بچانی کی "نازبو"، لطف اللہ بدوی کی "ابیلا"، خواجہ غلام علی کی "لاش"، ڈاکٹر منظوراحمد عرسانی کی "کلب اور گھر"، سندری آتمچندانی کی "پریت پرانی ریت نرالی"، اور "کرندڑ دیوارون" اچھی ناولیں ھیں۔ محمد بخش جوھر نے متعدد جاسوسی ناولیں لکھیں، جو سب کی سب ترجمہ ھیں۔

محمد عثمان ڈیپلائی نے تقسیم کے بعد بھی چند اسلامی تاریخی ناولیں لکھیں مثلاً "انور پاشا"، "آزادی کی جنگ" اور "دکھن کے مجاھدین" وغیرہ۔ ان کی ضخیم ناول "سانگھڑ" نہایت ھی اھم ھے، جس میں حر مجاھدین کے کارنامے بیان کئے گئے ھیں۔ یہ ناول اگرچہ فنی تقاضوں سے ھم آھنگ نہیں ھے، تاھم ایک اچھی کوشش ھے، کیوں کہ اس میں سندھ کے مجاھدین کے کارنامے بیان کرکے قومیت

ور وطنیت کے جذبہ کو بیدار کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ موجودہ دور کی یہی ایک ناول ہے، جو غیر معمولی ضخامت کی حامل ہے۔

حال ھی میں سندھ کے ادیبوں اور شاعروں نے سندھیت کے جذبات کو ابھارنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس قسم کا جذبہ جگانے کے لئے سراج نے "پڑاڈو سو مڈ" (صدائے بازگشت بڑی گویا پکار ھی ہے) کے عنوان سے ایک ناول لکھی ہے، جس کا پلاٹ سندھ کی تاریخ کے ایک حصہ ترخان دور سے متعلق ہے۔ ترخان اجنبی تھے۔ انہوں نے اہل سندھ پر بڑے ستم ڈھائے۔ نتیجہ کے طور پر اہل سندھ بیدار ہوئے اور انہوں نے بغاوت کردی۔ اس ناول میں یہی واقعات بتائے گئے ہیں۔

بعض غیر سندھی ناولوں کا سندھی میں ترجمہ بھی شایع کیا گیا، جن میں سے فضل احمد بچانی کی ترجمہ کردہ ناولیں "عاشی" اور "روح کی تلاش" قابل ذکر ہیں۔

افسانہ

تقسیم کے بعد کچھ عرصہ کے لئے تخلیقی کوششوں میں کمی پیدا ہو گئی تھی۔ اس خاموشی کو شیخ عبدالرزاق راز کی طرف سے سکھر میں قائم کردہ ادارہ حبیب پبلیکیشن نے توڑا، جس نے شعر اور افسانوں کے چند مجموعے شایع کئے۔ ان افسانوں میں معاشرتی عدم مساوات اور سماج کے مختلف رخ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سنہ ۱۹۳۶ء کے بعد حیدر بخش جتوئی نے بھی چند افسانے لکھے، جن میں کسانوں کی مظلومیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے، لیکن

ان افسانوں میں مقصد پر اس قدر زور دیا گیا ھے کہ فن بڑی حد تک متاثر ھوا ھے۔

تقسیم کے جلد ھی بعد سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے جو سہ ماھی مہران جاری کیا گیا، اس کا ایک حصہ محض افسانوں کے لئے مخصوص کردیا گیا۔ مہران میں بہترین افسانے شایع ھوئے، جن میں سندھی ماحول کی عکاسی کی گئی۔ کردار نگاری کے لحاظ سے بھی بہت اچھے افسانے شایع ھوئے۔ ڈاکٹر غلام حسین جعفری نے جو ایک ماھر تعلیم ھیں، ابتدا میں چند افسانے بھی لکھے۔ ڈاکٹر محمد ابراھیم خلیل (ولادت ۱۹۰۰ء) ایک بلند پایہ شاعر اور نقاد ھیں، لیکن اس قریبی دور میں انھوں نے بھی چند افسانے لکھے ھیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "عبرت کدہ" دو حصوں میں شایع ھو چکا ھے۔ ڈاکٹر خلیل دماغی امراض کے ھسپتال میں ڈاکٹر رھے ھیں۔ ملازمت کے دوران میں انھوں نے انسانی زندگی کا جو مشاھدہ کیا، اس کا عکس افسانوں میں پیش کیا ھے۔ اس لئے ان کے افسانے زندگی کے متعدد مسائل اور پریشانیوں کے آئینہ دار ھیں۔

سنہ ۱۹۵۰ء کے بعد افسانہ نے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی شروع کی۔ اس وقت جمال ابڑو ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ابھرے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "پشو پاشا" کے نام سے شایع ھوا۔ ان کے اسلوب بیان میں جو دلکشی ھے، وہ چھوٹے چھوٹے فقروں، خالص سندھی محاوروں اور سندھ ھی کے ماحول سے اخذ کردہ تشبیہات و استعارات کی مرھون منت ھے۔ افسانوں میں معاشرہ کے مظلوم و مجبور انسان کا حال زار بیان کیا گیا ھے، اور سماج کی روایات کے خلاف آواز بلند کی گئی ھے۔ ان کے افسانوں کے مرکزی کردار

غریب اور مظلوم ہونے کے باوجود سرکش ہیں۔ "شاہ جو پھر" اور "بدمعاش" ان کے شاہکار افسانے ہیں۔

جمال کے ساتھ ساتھ ایاز قادری کا نام بھی آتا ہے، جن کے افسانے مہران کی ابتدائی اشاعتوں اور نئی زندگی میں شایع ہوئے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "بلو دادا" کے نام سے شایع ہوچکا ہے۔ انھوں نے معاشرہ کے بدنام اور غیر معمولی افراد پر بہترین افسانے لکھے ہیں۔ غلام ربانی کے افسانے بھی مہران اور نئی زندگی میں شایع ہوتے رہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "آبحیات" کے نام سے اشاعت پذیر ہوچکا ہے۔ افسوس ہے کہ کافی عرصہ سے مذکورہ تینوں افسانہ نگاروں کی کوئی تخلیق منظر عام پر نہیں آئی۔

ان سے قبل کے افسانہ نگاروں میں سے ابن الیاس سومرو اور دلدار حسین شاہ موسوی نے بھی اچھے افسانے لکھے۔ ان کے افسانے بھی مہران اور نئی زندگی میں شایع ہوتے تھے۔

بشیر موریانی اچھے شاعر بھی ہیں اور اچھے افسانہ نگار بھی۔ ان کے افسانوں میں سے "چھوڑی"، "پربم"، "ٹکری" اور "زندگی کا روگ" اچھے افسانے ہیں۔ علی احمد بروھی نے طنزو مزاح کے رنگ میں عام کرداروں پر اچھے افسانے لکھے ہیں۔ وہ مزاح ھی مزاح میں اور ایک ھی افسانہ میں معاشرہ کے متعدد پہلوؤں پر طنز کرتے ہیں۔ طنز و مزاح کے رنگ میں افسانہ لکھنے والوں میں سے دوسرا نام محمد حسین "کروڑپتی" کا پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کے افسانے کچھ عرصہ تک نئی زندگی میں شایع ہوتے رہے، لیکن کافی عرصہ سے انھوں نے کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ رشید بھٹی نے بھی مزاحیہ افسانے لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "گھڑی گھڑی ھک گھاؤ"

کے نام سے شایع ہوچکا ہے سراج مضمون نگار بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ وہ افسانہ کے ذریعہ معاشرہ کے غلط نظام کا احساس دلاتے ہیں۔ "بُہِنِي" ان کا اچھا افسانہ ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "اے درد هلي آ" شایع ہوچکا ہے۔

موجودہ نوجوان افسانہ نگاروں میں سے امر جلیل کے افسانے بہت مقبول ہیں۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے "دل جي دنيا" اور "جڏهن مان نہ هوندس" (جب میں نہ ہوں گا) شایع ہوئے ہیں۔ وہ عموماً سندھ کے پیر اور زمیندار کو نوک قلم کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان کی بد کرداریوں کو منظرعام پر لاتے ہیں اور یہ تأثر دیتے ہیں کہ وہ رہزنوں اور ڈاکوؤں سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔

آغا سلیم بھی موجودہ دور کے بہترین افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے زیادہ تر رومانی ہوتے ہیں، لیکن ان میں معاشرہ پر طنز بھی ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "چنڊ جا تمنائي" اور ایک ناولٹ "روشنيءَ جي تلاش" شایع ہوئے ہیں۔ نسیم کھرل نے بھی سندھ کی دیہاتی زندگی پر اچھے افسانے لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "شبنم شبنم، کنول کنول" کے نام سے شایع ہوا ہے۔

نئے افسانہ نگاروں میں سے غلام نبی مغل مسلسل لکھ رہے ہیں اور اچھا لکھ رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کے تین مجموعے "نئون شهر"، "رات جا نيڻ" اور "رات منهنجي روح میں" شایع ہوئے ہیں۔

ان کے علاوہ نجم عباسی، انیس انصاری، طارق اشرف، جمال رند، مراد علی مرزا، حمید سندھی اور علی بابا نے اچھے افسانے لکھے ہیں۔ طارق اشرف کے افسانوں کا مجموعہ "سونهن، پتھر اور پیار" شایع ہوا ہے۔ نجم عباسی تقسیم ملک سے قبل سے لکھ رہے ہیں۔ ان کے

افسانوں کے پانچ مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ حمید سندھی کے افسانوں کا مجموعہ بھی "اداس وادیوں" کے نام سے شایع ہوا ہے۔

مذکورہ بالا افسانوں کے مجموعوں کے علاوہ نئی زندگی میں شایع شدہ افسانوں کا انتخاب "مہران جون چھولیوں" کے نام سے شایع ہوا ہے۔ نئی زندگی ہی کے ادارہ "پاکستان پبلیکیشن" کی طرف سے حال ہی میں افسانوں کا ایک اور انتخاب شایع ہوا ہے، جس میں نئی زندگی کے علاوہ دیگر رسالوں سے بھی افسانے لئے گئے ہیں۔

سندھی خواتین میں سے بیگم زینت عبداللہ چنہ ایک کہنہ مشق اہل قلم ہیں۔ انہوں نے مضامین بھی لکھے ہیں اور افسانے بھی۔ ثمیرہ زرین کافی عرصہ سے مسلسل لکھ رہی ہیں۔ انہوں نے فنی اعتبار سے بہترین افسانے لکھے ہیں۔ حال ہی میں ان کے افسانوں کا مجموعہ "گیت آچایل مورن جا" (پیاسے موروں کے گیت) شایع ہوا ہے۔ مہتاب محبوب نے بھی اچھے افسانے لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعے "چاندی کے تار"، "پرہ کان پھرین" اور "مٹي مراد" کے نام سے شایع ہوئے ہیں۔ قریبی دور میں مرحومہ سعیدہ سومرو نے فن خواہ زبان و بیان کے اعتبار سے اعلیٰ پایہ کے افسانے لکھے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی خواتین افسانے لکھ رہی ہیں۔ مثلاً بادام ناتواں، رشیدہ حجاب، ثریا یاسمین، اقبال پروین سومرو، نور شاھین، رشیدہ شیخ، فریدہ مغل اور حسن بانو میمن وغیرہ۔

موجودہ دور میں غیر ملکی افسانوں کے ترجمے بھی شایع ہوئے ہیں اور ان کے مجموعے بھی۔ ایسے مجموعوں میں سے "دیس دیس کی کہانیاں" (مترجم و مرتب میمن عبدالمجید سندھی)، "آمریکی افسانے" اور خلیل جبران کے افسانے قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ بالا افسانہ نگاروں کے علاوہ اور بھی متعدد نوجوان افسانے لکھ رہے ھیں، لیکن ان کی افسانہ نگاری کے متعلق ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ھے۔

موجودہ دور میں سندھی افسانہ نے جو ھمہ گیر اور ھمہ جہت ترقی کی ھے، اس کے پیش نظر دعویٰ کیا جا سکتا ھے کہ سندھی زبان کے افسانے کسی صورت میں بھی دنیا کے بہترین افسانوں سے کم نہیں ھیں۔ سندھی افسانہ میں جہاں سنجیدگی اور متانت ھے، وھاں جنسی جھلک سے بھی اسے پاک و صاف نہیں کہا جا سکتا۔ سندھی افسانہ میں سندھ کے ماحول کی عکاسی بھی نظر آتی ھے اور معاشرہ کے مسائل بھی زیر بحث لائے گئے ھیں، اور بعض افسانوں میں بین الاقوامی مسائل پر بھی اظہار خیال کیا گیا ھے۔

ڈرامہ

افسانہ کے مقابلہ میں ڈرامہ پر بہت ھی کم توجہ دی گئی ھے۔ تاھم اس سلسلہ میں کہنہ مشق اھل قلم میں سے محمد عثمان ڈیپلائی اور محمد اسماعیل عرسانی کے نام قابل ذکر ھیں۔ ڈیپلائی کے ڈراموں میں سے "نورجھان جو پٽ" (نورجھاں کا بیٹا)، "سجائي موڙي" (کارآمد سرمایہ)، "کانگریسی جال"، "شاھدی"، "نجومی" بہترین ڈرامے سمجھے جاتے ھیں۔ عرسانی کا ڈرامہ "بد نصیب تھری" جو سنہ ۱۹۳۹ء میں شایع ھوا، سندھی زبان کا شاھکار ڈرامہ ھے۔ تقسیم کے بعد ان کے مختصر ناٹکوں کا مجموعہ "ڈزن ڈایالاگ" کے نام سے شایع ھوا ھے۔ ان کے ڈراموں کا تیسرا مجموعہ "حسن پروین" ھے، جس میں مختصر ناٹک ھیں۔

شیخ عبدالرزاق راز نے بھی ایک ڈرامہ "فاتح سندھ" لکھا ھے،

جس میں محمد بن قاسم کا کردار پیش کیا گیا ہے۔ لطف اللہ بدوی نے بھی نثر اور نظم کی مختلف صنفوں کے ساتھ ساتھ ڈرامہ نگاری کی طرف بھی توجہ دی۔ ان کا ڈرامہ "دودو چنیسر" سندھی زبان کے بہترین ڈراموں میں شمار کیا جاتا ہے۔

نوجوان اہل قلم میں سے چند شبیر ناز کو ڈرامہ نگاری سے بڑی دلچسپی ہے۔ ان کے دو ڈرامے "سچا سیج پلنگ" (سونی سیج) اور درخان شایع ہو چکے ہیں۔ ریڈیائی ڈرامے بھی اچھی خاصی تعداد میں لکھے گئے ہیں۔ ریڈیائی ڈراموں کا ایک انتخاب "ادارۂ آواز ادب حیدرآباد" کی جانب سے "پاچا ۽ پڑلاء" (مائے اور صدائے بازگشت) کے نام سے شایع ہوا ہے۔ ریڈیائی ڈراموں کے سلسلہ میں آغا سلیم، مرادعلی مرزا، ممتاز مرزا، امر جلیل اور امداد حسینی کامیاب فنکار ہیں۔ ان کے علاوہ مصطفیٰ قریشی، محمد خان جمالی، ایاز قادری، الاھی بخش بلوچ، محبوب علی جوکھیو، ابن حیات، سراج، ظہور انصاری اور بعض دیگر اہل قلم نے مختصر ناٹک لکھے ہیں۔

مضمون نگاری

تقسیم کے بعد خالص مضمون نگاری کی جانب بھی کم توجہ کی گئی۔ موجودہ دور کے بلند پایہ مضمون نگار مرحوم سید عطاحسین شاہ موسوی تھے، جن کے مضامین کا مجموعہ "کچ کوڑیون" (کچی کوڑیاں) شایع ہو چکا ہے۔ موسوی نے اپنے مضامین میں زندگی کے تلخ حقائق دلچسپ انداز میں پیش کئے ہیں۔ گویا زندگی کی تلخی پر لطافت اور ظرافت کی شیرینی کی تہہ چڑھا کر پیش کیا ہے۔ عثمان علی انصاری بھی بنیادی طور پر مضمون نگار تھے۔ سہ ماہی مہران میں شایع شدہ ان کا مضمون "سندھ کی تہذیب" شاہکار کی حیثیت

رکھتا ہے۔ سید میران محمد شاہ شاعر بھی تھے اور ایک منفرد مضمون نگار بھی۔ ان کے دو مضامین "دل جي طلب" اور "گنجے پہاڑ کا سیر" ادب کے اعلیٰ شہپارے ہیں۔

ڈاکٹر علی احمد قاضی بھی اچھے مضمون نگار تھے۔ ان کے مضامین میں فلسفیانہ خیالات اور سائنسی باتیں بڑے آسان اور دلکش انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ ان کے مضامین میں سے "عشق اور عقل"، "سچ اور جھوٹ" اور "آسائی اور نراسائی" بہترین مضامین ہیں۔ ڈاکٹر دائود پوتہ مرحوم نے اگرچہ بہت سے مقالے لکھے ہیں، لیکن ان میں زبان و بیان پر اس قدر زور دیا گیا ہے اور وہ اس قدر رسیلے اور دلکش ہیں کہ انہیں مقالہ کے ساتھ ساتھ مضمون بھی کہا جا سکتا ہے۔ علامہ آئی۔ آئی۔ قاضی اگرچہ فیلسوف تھے، لیکن انہوں نے اپنے فلسفیانہ خیالات سلجھے ہوئے انداز میں، مضمون کے اسلوب میں اور دلکش اور لطیف زبان میں قلم بند کئے ہیں۔ اس لئے ان کی سندھی کی تقریریں اور تحریریں مضمون کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں سے "کامیاب زندگی کا قاعدہ" اور "علم و ادب کی ترقی کے طریقے" سندھی علم و ادب کے شاہکار ہیں۔

محترم سید غلام مصطفیٰ شاہ نے خلوص اور دانشمندی سے آراستہ مضامین لکھے ہیں، جن میں فکر کی گہرائی بھی ہے اور قلب و روح کی سچائی بھی۔ شاہ صاحب موصوف نے ان مضامین میں اپنے تعلیمی تجربات کا نچوڑ انتہائی دیانتداری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نیز قومی مسائل کا تجزیہ بھی حقیقت پسندانہ انداز میں کرتے ہوئے ان کا صحیح اور عملی حل پیش کیا ہے۔ کافی عرصہ ہوا سندھی ادبی بورڈ نے ان کی ایک کتاب "سیر و سفر" شایع کی تھی۔ اس

میں وہ خطوط درج تھے جو شاہ صاحب موصوف نے ولایت سے تحریر کئے تھے اور جنہیں مرحوم احسان بدوی نے مرتب کیا تھا۔ یہ خطوط مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں، اور ان میں انہوں نے اپنے مشاہدات اور جذبات پیش کئے ہیں۔

حال ھی میں انہوں نے طویل مضامین کتابچوں کی صورت میں شایع کئے ھیں، جو تقاضائے وقت اور قومی ضروریات کے عین مطابق ھیں۔ مثلاً: کتاب، استاد اور سندھالاجی کے سنگ بنیاد رکھنے کے موقع پر پڑھا ھوا خطبہ اور دیگر متعدد خطبات اور مضامین۔

پروفیسر جھامنداس بھاٹیہ بھی ایک منفرد مضمون نگار تھے، جنھوں نے اپنے مضامین میں اشاراتی اور علاماتی انداز اختیار کیا۔ کریمڈنہ راجپر نے بھی سلیس اور لطیف سندھی میں بہترین مضامین لکھے ھیں۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "کک ھیٹان لک" کے نام سے شایع ھوا ھے۔

مرحوم محمد بخش بلوچ مجنوں اس دور کے عظیم اور منفرد مضمون نگار تھے۔ ان کا اپنا انداز بیان ھے جو نہایت ھی دلکش ھے۔ ان کے مضامین میں معلومات بھی ھے، دلچسپی اور تفریح کا عنصر بھی، طنز و مزاح بھی، تھرپلی زندگی کا عکس بھی اور کردار نگاری بھی، ان کی کتاب "مسکین جھان خان کھوسو" دو بار شایع ھو چکی ھے۔ اس میں غریب اور مخلص سماجی کارکن مسکین جھان خان کھوسہ کی عملی زندگی پیش کی گئی ھے، اور اس کے ساتھ تھرپلی زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ھے۔ ان کی مذکورہ کتاب کا ہر باب اپنے طور پر ایک مضمون ھے۔ اس کے علاوہ ان کے دیگر مضامین بھی شایع ھوئے۔ مثلاً "مانین جھڑا متا" (روٹی جیسے گول سر) وغیرہ۔

پیر علی محمد راشدی مشہور صحافی ہونے کے ساتھ بہترین مضمون نگار بھی ہیں۔ ان کی کتاب "اهي ڏينهن اهي شينهن" میں مختلف شخصیتوں پر تاثراتی مضامین ہیں۔ زبان بہت رسیلی اور مٹھاس بھری استعمال کی ہے، جیسے مصری کی ڈلیاں۔ محترم محمد اسماعیل عرسانی، محترم ڈاکٹر نبی بخش بلوچ اور پیر حسام الدین راشدی نے بھی چند مضامین لکھے ہیں۔ ڈاکٹر بلوچ نے مہران میں "پارس کاٹ" (پارس کی کان) کے عنوان سے مضامین کے ایک سلسلہ کا آغاز کیا تھا۔ لیکن اس کی صرف ایک ہی قسط شایع ہوئی۔

تنقید

موجودہ دور میں تنقید نے بڑی ترقی کی ہے۔ تنقیدی بحثیں بھی ہوئی ہیں اور نظریاتی تنقیدیں بھی کی گئی ہیں۔ کلاسیکی شاعری پر تشریحی اور توضیحی تنقیدیں بھی ہوئیں اور عروضی شاعری پر فنی تنقیدیں بھی کی گئیں۔ عروضی شاعری پر جن تنقید نگاروں نے فنی اور فکری تنقیدیں کی ہیں، ان میں سے حاجی محمود خادم، محمد بخش واصف، ڈاکٹر شیخ محمد ابراهیم خلیل، حافظ خیر محمد اوحدی، مولانا غلام محمد گرامی اور رشید لاشاری کے اسما قابل ذکر ہیں۔ حاجی محمود خادم نے ماهنامہ "ادیب سندھ" میں اس قسم کی تنقید کے سلسلہ میں بڑا کام کیا۔ تعمیری تنقید کے لحاظ سے کئی تنقیدیں فرضی ناموں سے بھی شایع کیں۔

عروضی شاعری کے سلسلہ میں بعض نقادوں نے فنی پہلو کے ساتھ فکری پہلو کو بھی نمایاں کیا۔ ان میں سے محترم حافظ خیر محمد اوحدی (ولادت ۱۹۱۱ء) کا نام سب سے بلند ہے۔ اس قسم کی تنقید میں ڈاکٹر شیخ محمد ابراهیم خلیل کو بڑی مہارت حاصل

ہے۔ سندھی شعرا کے کلام پر ان دونوں حضرات کی تنقیدیں روزنامہ مہران میں شایع ہوئیں۔

اس دور میں کلاسیکل شعرا کے کلام کے مجموعے بھی شایع ہوئے۔ ان کی ابتدا میں شاعری پر تنقید اور تبصرہ بھی کیا گیا، اور شاعر کی ادبی حیثیت بھی متعین کی گئی۔ علامہ ڈاکٹر داؤد پوتہ کی مرتب کردہ کتاب "کلام گرھوڑی" کے دیباچہ میں شاعر کے سوانح حیات بھی درج کئے گئے ہیں اور ان کے کلام پر توضیحی اور تشریحی نوعیت کی تنقید بھی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ علامہ مرحوم نے شاہ لطیف، رمضان کمھار اور دیگر شعرا کے کلام پر تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں، جو "نئی زندگی" میں شایع ہو چکے ہیں۔

محترم ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے متعدد کلاسیکی شعرا کے کلام کے مجموعے مرتب کر کے شایع کئے ہیں۔ مثلاً: کلیات حمل، کلام فقیر ولی محمد لغاری، رسالہ نبی بخش لغاری، رسالہ شاہ عنایت رضوی، میین لطف اللہ قادری کا کلام، دائرہ والوں کی سندھی، کلیات سانگی اور لوک ادب کے سلسلہ کی مختلف کتابیں۔ ان کتابوں میں شعرا کے کلام پر تنقیدی تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ خاص طور پر شاہ عنایت، میین لطف اللہ قادری اور سانگی کے کلام پر تنقیدیں، تنقیدی ادب میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

ان کے علاوہ عبدالحسین شاہ موسوی کے مرتب کردہ "دیوان بیدل"، "دیوان بیکس"، رشید احمد لاشاری کی مرتب کردہ "کلیات گدا"، محترم عبدالکریم سندیلہ کی تالیف اور ترتیب "سندھ کا سینگار" اور "کلیات حسین دیدڑ"، اور محترم محبوب علی چنہ کی مرتب کردہ

"کلیات امین" میں شعرا کے کلام پر کی ہوئی تنقیدیں، تنقیدی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

شاہ لطیف، سچل سرمست، بیدل اور سانگی وغیرہ پر جن حضرات نے مقالے لکھے ہیں، ان میں سے محترم پیر سعید حسن، محترم عبدالرزاق راز، ڈاکٹر شیخ محمد ابراھیم خلیل، مولانا غلام محمد گرامی، محترم خواجہ غلام علی الانا، محترم علی نواز جتوئی، قاضی علی اکبر درازی اور عطامحمد حامی کے اسما قابل ذکر ہیں۔

نئے رجحانات کے مطابق شاعری کے ساتھہ ساتھہ افسانوی ادب پر بھی تنقیدیں ہوئیں، اور تنقید میں ایک نئے موڑ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس قسم کی تنقیدوں میں محمد ابراھیم جویہ نے نمایاں کردار ادا کیا، اور نوجوانوں کو نئے رجحانات کی جانب راغب کرنے کی کوشش کی۔ ان کے علاوہ شیخ ایاز، رشید بھٹی، رسول بخش پلیجو، شیخ عبدالرزاق راز، ایاز قادری، ڈاکٹر غلام‌علی الانا، مولانا غلام محمد گرامی اور دیگر نقادوں نے بھی جدید ادب پر تنقید کرنے میں اھم حصہ لیا۔

تنقیدی مضامین کے بہت ھی کم مجموعے شایع ہوئے ھیں۔ مثلاً: احسان بدوی کا "تنقید اور تنقید نگاری"، شیخ عبدالرزاق راز کا "تنقید اور تجزیہ" اور میمن عبدالمجید سندھی کا "مانک، موتی، لعل"، "پرکھہ اور پروڑ" اور "سکھر کی سو کھڑی" اور عبدالجبار جونیجو کا "کنز اللطیف"۔

کلاسیکل نثر پر جن نقادوں نے تنقیدیں کی ھیں، ان میں سے خواجہ غلام علی الانا (سندھی نثر کی تاریخ)، احسان بدوی (تنقید اور تنقید نگاری) اور میمن عبدالمجید سندھی (مانک، موتی، لعل اور

پر کھہ اور پروڑ) کے نام قابل ذکر ہیں۔ جدید سندھی افسانہ پر شیخ عبدالرزاق راز، مراد علی مرزا، آغا سلیم، ثمیرہ زرین، طارق اشرف اور بعض دیگر نقادوں نے تنقیدیں کی ہیں۔

تحقیق اور تاریخ

اس دور میں سندھ کی تاریخ پر بڑا تحقیقی کام ہوا ہے۔ محترم پیر حسام الدین راشدی نے متعدد تاریخی ماخذ نہایت ہی محنت سے مرتب کئے اور مفید معلوماتی حواشی کے ساتھ مزین کرکے شایع کئے ہیں۔ ان کی مرتب کردہ کتابوں میں سے "مقالات الشعرا"، "تکلمۂ مقالات الشعرا"، "مکلی نامہ" اور "تحفۃ الکرام" قابل ذکر ہیں، جن کے حواشی میں سندھ کی تاریخ پر اچھا خاصا مواد فراہم کیا گیا ہے، اور سندھ کی جامع تاریخ کے لئے ایک راہ ہموار کی گئی ہے۔ خاص طور پر "حواشی مکلی نامہ" ارغون، ترخان اور مغل دور پر انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے بنیادی تاریخی کتابوں مثلاً "چچ نامہ" اور "تاریخ معصومی" پر مفید اور معلوماتی حواشی لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد کلاسیکل شعرا کا کلام ایڈٹ کرکے شایع کیا ہے۔ لوک ادب کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے متعدد کتابیں مرتب کرکے شایع کی ہیں۔ سندھی عوامی شاعری پر ان کی ضخیم کتاب "پیلاین جا بول" شایع ہوئی ہے، جس میں "لس بیلو" (بلوچستان) کی سندھی عوامی شاعری کو پہلی مرتبہ پیش کیا گیا ہے۔ سندھی زبان کی تاریخ کے سلسلہ میں ان کی تحقیقی کتاب "سندھی بولی کی تاریخ" شایع ہوئی ہے۔ سندھی زبان کی "جامع لغات" پر بھی بڑا کام کیا ہے۔ پہلی جلد شایع ہو چکی ہے۔ سندھی موسیقی پر بھی ان کے تحقیقی

مقالات سندھی اور انگریزی میں شایع ہوئے ہیں۔ سندھ کی تاریخ پر بھی انہوں نے کام کیا ہے۔ خاص طور پر "چچ نامہ" کے سندھی ترجمہ پر ان کے حواشی قابل ذکر ہیں۔

میر رحیمداد خان مولائی شیدائی نے بھی سندھ کی تاریخ پر نہایت ہی مفید کتابیں لکھی ہیں مثلاً "جنۃ السندھ" اور "تاریخ تمدن سندھ" وغیرہ۔ ان تصنیفات کے علاوہ مولائی شیدائی نے سندھ کی تاریخ پر بے شمار مضامین بھی لکھے ہیں۔ احسن کربلائی نے میر صاحبان کے دور اور ان کے علمی ذوق سے متعلق نہایت ہی تحقیقی مقالے لکھے ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز پٹھان اور میمن عبدالمجید سندھی نے خصوصی طور پر عربوں کے دور پر تحقیقی مقالے لکھے ہیں۔ لطف اللہ بدوی اور چیتن ماڑی والا نے خصوصیت کے ساتھ برطانوی دور پر مضامین لکھے ہیں۔ محترم جی۔ ایم۔ سید اور پیر علی محمد راشدی نے اپنے زمانہ کی شخصیتوں اور ماضی قریب کی تاریخ سے متعلق "اهي ڏينهن آهي شينهن" اور متعدد مضامین لکھے ہیں۔ محترم غلام مصطفیٰ قاسمی نے سندھ کی علمی شخصیتوں، علمی مرکزوں اور سندھ کے علماء کی عربی اور فارسی تصنیفات پر تحقیقات کی ہے۔

لوک ادب اور لغت کے سلسلہ میں محترم عبدالکریم سندیلہ، میمن عبدالمجید سندھی اور عبدالحسین شاہ موسوی نے بھی کام کیا ہے۔ اس دور میں سندھی زبان کی تاریخ اور علم اللسان پر بھی کافی کام ہوا ہے۔ علم اللسان کے سلسلہ میں محترم خواجہ غلام علی الانا اور محترم پروفیسر علی نواز جتوئی نے باقاعدہ لندن سے تعلیم حاصل کی ہے۔ غلام علی الانا نے اس علم میں ایم۔ اے۔ کی ڈگری بھی لی ہے۔ علم اللسان پر ان کی تصنیفات "سندھی صورت خطی" اور

"سندھی صوتیات" اور پروفیسر علی نواز جتوئی کی کتاب "علم اللسان اور سندھی زبان" بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، اور سندھی زبان میں پہلی بار اہل علم کو ایک نئے علم سے روشناس کراتی ہیں۔

سندھی زبان کی تاریخ سے متعلق کاکو بھیرومل کی تصنیف کے بعد محترم ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ کی تصنیف "سندھی زبان کی مختصر تاریخ" ایک تحقیقی تصنیف ہے اور نیا نظریہ پیش کرتی ہے۔ اس کے بعد سراج، خواجہ غلام علی الانا اور میمن عبدالمجید سندھی نے سندھی زبان کی تاریخ سے متعلق مقالے لکھے ہیں۔

نوٹ

چونکہ یہ سندھی ادب کی مختصر تاریخ ہے، لہذا موجودہ دور کے ادب پر ایک سرسری سی نظر ڈالی گئی ہے۔ ورنہ موجودہ دور میں اسقدر ادبی کام ہوا ہے، اتنے موضوعات پر لکھا گیا ہے اور اتنا زیادہ لکھا گیا ہے کہ اس کی تفصیلات قلمبند کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ اس دور میں اگرچہ ہر صنف نے ترقی کی ہے، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ڈرامہ اور ناول کی رفتار بہت ہی سست رہی ہے۔ اس دور کا ضخیم ناول صرف ایک ہی ہے "سانگھڑ"، جو محمد عثمان ڈیپلائی کی تصنیف ہے۔ مختصر ڈراموں کے چند مجموعے فقط چنہ شبیر ناز نے شایع کئے ہیں۔

شاعری

اس دور میں شاعری کے میدان میں بڑی وسعت پیدا ہوئی ہے۔ فنی نقطۂ نگاہ سے بھی متعدد تجربے ہوئے ہیں، لیکن فکری اعتبار سے اتنے تجربے کئے گئے ہیں، جن کا کوئی شمار نہیں ہے۔

بیت

سندھی شاعری کی قدیم صنف بیت میں صوفی شعرا نے بھی اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا اور ترقی پسند شعرا نے بھی اپنا مفہوم و مقصد بیان کیا۔ صوفی شعرا میں سے قاضی علی اکبر درازی، عبدالرحمان عاصی، فقیر محمد عثمان اور محمد مانک سندرانی کے نام قابل ذکر ہیں۔ عوامی شعرا نے بھی لوک ادب کی مختلف صنفوں اور رومانی داستانوں پر روایتی انداز میں بیت کہا ہے۔ اس سلسلہ میں عمر موندرو، پھل کوراڑ، غلام رسول رند، جام خان چانڈیہ، سلیمان ملاح، گل محمد کھوسہ، لکھانو خان کپری، سکھر فقیر ساکھانی، گلو میانو، فقیر اللہ ڈنو ماچھی، فرید گڈانی، صابر درس اور دیگر متعدد شعرا کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

بعض شعرا نے بیت کے روایتی مضمون میں جدت اور انفرادیت پیدا کرکے اسے نیا رنگ دیا ہے۔ عبدالرزاق راز نے حسن و عشق کا مضمون بیت کے ذریعہ ایک انوکھے انداز میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح طالب المولیٰ نے بھی اسلوب بیان میں جدت اختیار کی ہے۔ حضرت طالب المولیٰ کا ایک بیت بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:۔

کڈھن ویھن نہ ویجھڑو کڈھن قرب کمال	کبھی قریب بھی نہیں بیٹھتے، کبھی قرب حد کمال کو پہنچ جاتا ہے

ڪڏھن نظرون مھر جون ڪڏھن	کبھی نظر کرم ہے، کبھی اپنی
موھين ساڻ مقال	گفتگو سے موہ لیتے ہیں
ڪڏھن ھلن ھجر ڏي ڪڏھن	کبھی فراق کی راہ اختیار کرتے
واہ وصال	ہیں، کبھی وصال کی
جنساري جمال، طالب مولیٰ	اے طالب المولیٰ! ان کا حسن و
تن جو.	جمال بھی عجیب و غریب ہے۔

اس سے معلوم ہوگا کہ مضمون اور رنگ وہی قدیم اور روایتی ہے، لیکن اس میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حافظ احسن، محمد خان غنی، لطف‌اللہ بدوی، احمد خان آصف، انیس انصاری اور رحیم بخش قمر نے بھی روایتی رنگ میں بیت کہے ہیں۔ وہ اگرچہ عروضی شاعر ہیں، تاہم انہوں نے بیت کے روایتی رنگ کو نبھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ترقی پسند شعرا میں سے شیخ ایاز نے بیت کو اپنے خیالات کے اظہار کا موثر اور نہایت ہی موزوں ذریعہ قرار دیا ہے، اور بیت کی ساخت کی فنی خصوصیت کو قائم رکھتے ہوئے اپنے فکر و خیال اور نظریات کا اظہار کیا ہے، یعنی انہوں نے بیت کی ساخت اور ہیئت کو تو قبول کیا ہے، لیکن اس کے روایتی رنگ کو ترک کردیا ہے۔ سندھی زبان کے اس بلند پایہ شاعر نے سندھی بیت میں نئی زندگی پیدا کی ہے، جس کی وجہ سے متعدد جدید شعرا ان کا اتباع کرتے ہوئے سندھی بیت میں قومی رنگ بھرنے لگے ہیں۔ شیخ ایاز کے دو بیت پیش کئے جاتے ہیں، جن میں روایت اور انفرادیت کا حسین امتزاج جھلکتا ہوا محسوس ہوگا:-

(۱)

هن گهڙيءَ، هن وير، هلندي
ڪائي هوت ڏي
پوءِ نہ پنهونءَ جا پير، لهندءِ
لهندي سج ۾

(۱)

کوئی ہے جو ابھی اور اسی وقت
ہوت کے پاس چلے
سورج غروب ہوا تو پنھوں کے پاؤں
کے نشانات ملنا محال ہو جائیں گے

(۲)

ڪاريون راتيون ڪنبٽي، آتر
اوتون ڏئي
ساهڙ پو بہ سڏي، سهڻي توکي
سير ۾

(۲)

کالی راتیں، سخت سردی اور شمال
کی سرد اور تیز ہوائیں
اے سوھنی! اس کے باوجود محبوب
تجھے بیچ دریا میں بلا رہا ہے۔

کافی اور وائی

اس صنف پر عوامی شعرا اور ترقی پسند شعرا نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ شیخ ایاز نے جس طرح سندھی بیت کو نئے رنگ میں پیش کیا، اسی طرح وائی اور کافی میں بھی جدت اور ندرت پیدا کی، اور قومی جذبات کو ابھارنے والے خیالات کا اظہار کیا۔ ان کی مشہور وائی "سنڌڙيءَ ڪي سر ڪير نہ ڏيندو" (کون ہے جو سندھ پر سے جان قربان نہ کرے) نے سندھی نوجوان ذہن کو بہت ھی متاثر کیا ہے۔ شیخ ایاز کے علاوہ تنویر عباسی، شمشیر الحیدری، امداد حسینی، ذوالفقار راشدی، شیخ عبدالرزاق راز اور بردہ سندھی نے بھی اپنے جذبات و احساسات وائی کے ذریعہ پیش کئے ھیں، اور وائی کے فنی تقاضوں کو پورے طور پر نبھانے میں کامیاب ہوئے ھیں۔ رشید احمد لاشاری، محمد خان غنی، طالب المولیٰ اور نور شاھین نے کلاسیکل رنگ میں کافیاں کہی ھیں۔

نئی صنفیں

اس دور میں ہندی شاعری کی صنف گیت، پنجابی شاعری کی صنف ماھیا، جاپانی شاعری کی صنف ھائیکو اور مغربی شاعری کی صنفوں آزاد نظم، سانیٹ اور ترائیل پر متعدد شعرا نے طبع آزمائی کی ھے۔ گیت بہت زیادہ لکھے گئے ھیں اور اکثر گیتوں میں رس رچاؤ اور روانی ھے۔ خاص طور پر شیخ ایاز، شیخ راز، تنویر عباسی، عبدالقیوم صائب، نواز علی شوق، امداد حسینی اور قلندر بخش بدوی نے گیتوں میں تاثر، روانی اور نغمگی پیدا کی ھے۔ گیت چونکہ ہندی شاعری کی صنف ھے، اس لئے سندھی شعرا نے سندھی کے گیت میں ھندی شاعری کی تشبیہات کو زیادہ تر قائم رکھا ھے اور ھندی کے الفاظ بھی کثرت سے استعمال کئے ھیں۔

پنجابی شاعری کی صنف ماھیا پر صرف رشید لاشاری اور نور شاھین نے طبع آزمائی کی ھے۔ ھائیکو پر طبع آزمائی کا رجحان بڑھ رھا ھے۔ ذوالفقار راشدی اور ولی داؤد پوتہ کے ھائیکو ایک کامیاب کوشش اور اچھے تجربے کہے جا سکتے ھیں۔ سانیٹ کے سلسلہ میں بشیر موریانی، ھری دریانی دلگیر، نارائن شیام اور نور شاھین کے نام لئے جا سکتے ھیں۔ ترائیل کی ساخت کچھ مشکل ھے، اس لئے بہت ھی کم شعرا نے اسے اپنے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ھے۔ ھری دریانی نے نہایت ھی اچھے اور کامیاب ترائیل لکھے ھیں، ترائیل کی ساخت کو قائم رکھنے میں بھی کامیاب ھوئے ھیں اور روانی اور رنگینی پیدا کرنے میں بھی۔ آزاد نظم میں بہت سے شعرا نے اپنے جوھر دکھائے ھیں، اسقدر کہ بعض متشاعروں نے بھی الٹی سیدھی نظمیں لکھ کر اپنا شمار شعرا کی قطار میں کرانے کی کوشش کی ھے۔ اس کے باوجود بعض شعرا نے شاعری کی روح کو قائم رکھتے ھوئے

آزاد نظم لکھی ہے، اور اس میں اچھی روانی بھی ہے۔ ان شعرا میں سے شیخ راز، شیخ ایاز، ذوالفقار راشدی اور نارائن شیام کے نام قابل ذکر ہیں۔

غزل

اس دور کے کہنہ مشق شعرا میں سے مرحوم نواز علی نیاز لاڑکانوی (وفات ۱۹۵۱ء) غزل کے با کمال شاعر تھے۔ انہوں نے غزل کے لوازمات کو بھی اور روایات کو قائم رکھتے ہوئے اس میں جدت اور مزید رنگینی پیدا کی۔ کہنہ مشق شاعروں میں سے حاجی محمود خادم بھی غزل کے اچھے شاعر تھے۔ مذکورہ دونوں شعرا کے مکمل دیوان موجود ہیں، جو ابتک شایع نہیں ہوئے۔ خادم کی غزل میں تغزل کے ساتھ ساتھ قومی رنگ بھی ہے۔ ان کے علاوہ شیخ مراد علی کاظم، محمد صدیق مسافر، محمد بخش واصف، حافظ عبداللہ، بسمل ٹکھڑائی، قادر بخش بشیر، لطف اللہ بدوی، سرور حیدرآبادی، رشید لاشاری غزل کے بلند پایہ شاعر تھے۔

موجودہ غزل گو شعرا میں سے بعض روایتی رنگ میں غزل کہتے ہیں۔ ان میں سے ڈاکٹر خلیل کو استاد کی حیثیت حاصل ہے۔ طالب المولیٰ، مظفر حسین جوش، عبدالحلیم جوش، حافظ احسن چنہ، نور شاھین، عبدالفتاح عبد، عبداللہ عبد، ایاز قادری، عبداللہ اثر، انیس انصاری، سلیم گاڑھوی، مولانا نورالدین نور، اظہر گیلانی، علی محمد مجروح، احمد خان آصف اور عبدالقیوم صائب روایتی رنگ کے بلند پایہ شاعر ہیں۔

شیخ عبدالرزاق راز کی غزل میں ندرت فکر نے ایک انفرادیت پیدا کی ہے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے روایت کی پابندی بھی

کی ہے۔ ذوالفقار راشدی کی غزل میں جدت اور انفرادیت کے ساتھ داخلی کیفیت کی ترجمانی نظر آتی ہے۔

ترقی پسند شعرا نے غزل کی ہیئت اور مضمون میں رد و بدل کر کے سندھی غزل میں ایک نیا موڑ پیدا کیا ہے۔ بعض مواقع پر انہوں نے غزل کی روایات کی بھی نفی کی ہے اور متعدد نئے اور انوکھے تجربے کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں شیخ ایاز تمام ترقی پسند غزل گو شعرا کے قائد ہیں۔ انہوں نے متعدد مقامات پر غزل کی ساخت ہی بدل کر رکھ دی ہے۔ اس کے باوجود ان کی متعدد غزلیں بڑی پیاری ہیں۔ اس سلسلہ کے دیگر غزل گو شعرا میں سے تنویر عباسی، تاج بلوچ، نیاز ہمایونی، شمشیر الحیدری، عبدالکریم گدائی، محسن ککڑائی اور امداد حسینی کے نام قابل ذکر ہیں۔

نظم

رباعی، مسدس، مثنوی وغیرہ پر بھی کسی حد تک طبع آزمائی کی گئی ہے۔ محمد صدیق مسافر، ڈاکٹر خلیل اور بسمل ٹکھڑائی نے مثنویاں لکھی ہیں۔ نئے شعرا میں سے محترمہ نور شاہین نے مختصر، لیکن بہت ہی اچھی مثنویاں لکھی ہیں۔

رباعی چونکہ ایک مشکل صنف ہے، لہذا بہت ہی کم شعرا نے اس میدان میں قدم رکھا ہے۔ محمد بخش واصف اور ڈاکٹر خلیل رباعی کے اچھے شاعر ہیں۔ قطعات متعدد شعرا نے کہے ہیں، لیکن عبدالفتاح عبد قطعہ کے بلند پایہ شاعر ہیں۔ انہوں نے قطعات کے ذریعہ ملک کے سیاسی اور سماجی حالات، اور مادیت پرستی اور مغرب کی تقلید پر سخت تنقید کی ہے۔

قصیدہ کے سلسلہ میں ڈاکٹر خلیل، حافظ احسن چنہ، عبداللہ اثر اور مولانا نورالدین نور کے نام قابل ذکر ھیں۔ عبداللہ اثر نے عربی کے بعض نعتیہ قصائد مثلاً "قصیدہ بردہ" اور "بانت سعاد" وغیرہ کے منظوم ترجمے کئے ھیں۔ مسدس کے سلسلہ میں بھی ان ھی کہنہ مشق شعرا کے نام لئے جا سکتے ھیں۔ مثلاً خلیل، مسافر اور مسرور وغیرہ۔ فقیر غلام علی مسرور کا ایک مسدس کتابی صورت میں اشاعت پذیر ھو چکا ھے۔

ماخذ

۱- ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ- سندھی بولی جی مختصر تاریخ، ۱۹۶۲ء

۲- " " "- میین شاہ عنات جو کلام، ۱۹۶۳ء

۳- " " "- لطف اللہ قادری جو کلام، ۱۹۶۸ء

۴- " " "- بیلاین جابول، دوسری ایڈیشن، ۱۹۷۰ء

۵- " " "- لوک ادب کے سلسلہ کی کتابیں: مداحوں اور مناجاتوں، معجزا، گھن سان گالھیوں، بیت، نڑ جا بیت، لیلا چنیسر-

۶- " " "- واعظ العاشقین (کلام فقیر ولی محمد خان لغاری)، ۱۹۶۸ء

۷- " " "- دائرے وارن جی سندھی، ۱۹۷۱ء

۸- " " "- کلیات سانگی، ۱۹۶۹ء

۹- ڈاکٹر عمر بن محمد داؤد پوتہ: ابیات سندھی، ۱۹۳۹ء

۱۰- " " "- شاہ کریم جو رسالو

۱۱- " " "- کلام گرہوڑی، ۱۹۵۶ء

۱۲- " " "- سندھی شاعر اور ان کا شعر

۱۳- ڈاکٹر ھوتچند سولچند گربخشانی - شاہ جو رسالو، تین جلدیں

۱۴- لالچند امرڈنو مل جگتیانی - " سندھی ساھت جی کچھہ ماپ " مقالہ شایع شدہ "کہانی"، ماہ مارچ - اپریل ۱۹۵۵ء

۱۵- پير حسام الدين راشدي - سنڌي ادب (اردو)
۱۶- " " " - ترخان نامہ (فارسي)، ۱۹۶۵ء
۱۷- " " " - مکلي نامہ، ۱۹۶۸ء
۱۸- " " " - تحفتہ الکرام (فارسي)، ۱۹۷۱ء
۱۹- " " " - تاريخ مظهر شاهجهاني
۲۰- " " " - مهران جون موجون، ۱۹۵۶ء
۲۱- ڊاڪٽر خواجہ غلام علي الانا - سنڌي نثر جي تاريخ، ۱۹۶۷ء
۲۲- " " " - سنڌي صورتخطي، ۱۹۶۴ء
۲۳- " " " - لاڙ جي ادبي ائين ثقافتي تاريخ، ۱۹۷۷ء
۲۴- ڪاڪو ڀيرومل - سنڌي ٻولي جي تاريخ
۲۵- منگهارام ملڪاڻي - سنڌي نثر جي تاريخ، ۱۹۶۸ء
۲۶- مولانا غلام محمد گرامي - ٽماهي مهران ڪا شاعر نمبر، ۱۹۶۹ء
۲۷- مخدوم امير احمد - چچ نامہ (سنڌي ترجمہ)، ۱۹۵۴ء
۲۸- " " - تحفتہ الکرام (")، ۱۹۵۷ء
۲۹- " " - تاريخ معصومي (")، ۱۹۵۳ء
۳۰- محمد صديق ميمڻ - سنڌ، جي ادبي تاريخ، ٻہ حصا
۳۱- لطف الله بدوي - تذڪرهٔ لطفي، ٽي جلدون
۳۲- ڊاڪٽر امداد الله شاه ٽکڙائي - تذڪرهٔ شعرائے ٽکڙ، ۱۹۵۹ء
۳۳- شمس العلماء مرزا قليچ بيگ - سائو پن ائين ڪارو پنو، ۱۹۶۵ء
۳۴- مولانا عزيز الرحمان - تاريخ قلعہ مروٹ (اردو)، ۱۹۵۲ء
۳۵- محمد حفيظ الرحمان - ذڪر ڪرام (اردو)
۳۶- عبدالجبار جوڻيجو - سنڌيون، ۱۹۷۰ء

۳۷- ڈاکٹر شیخ محمد ابراھیم خلیل - بلبل سندھ، ۱۹۵۱ء
۳۸- " " " - رھنمائے شاعری، تین جلدیں
۳۹- عبدالکریم سندیلو- سندھ جو سینگار، ۱۹۵۶ء
۴۰- " " - کلیات شاہ محمد دیدڑ، ۱۹۷۲ء
۴۱- رشید احمد لاشاری - کلیات گدا، ۱۹۵۷ء
۴۲- محبوب علی چنہ - کلیات امین، ۱۹۶۶ء
۴۳- قاضی علی اکبر درازی - دولھہ درازی
۴۴- آغا غلام نبی صوفی- سچل سر مست جو رسالو، ۱۹۳۳ء
۴۵- علی نواز جتوئی - علم لسان ائیں سندھی زبان، ۱۹۶۸ء
۴۶- محمد صدیق مسافر - دیوان فاضل
۴۷- سید خادم حسین شاہ - سوانح اصغر، ۱۹۶۷ء
۴۸- میر علی نواز علوی - کلیات علوی
۴۹- سید سلیمان ندوی - عرب و ھند کے تعلقات (اردو) ۱۹۳۹ء
۵۰- مولانا مسعود علی ندوی - ھندوستان عربوں کی نظر میں (اردو)، جلد اول ۱۹۶۰ء، جلد دوم ۱۹۶۲ء
۵۱- لیلا رچندانی - سندھو جی جھلک، ۱۹۶۳ء
۵۲- غلام دستگیر نامی- تاریخ جلیلہ (اردو)، ۱۹۶۰ء
۵۳- میر رحیمداد خان مولائی شیدائی - جنۃ السندھ، ۱۹۵۸ء
۵۴- " " " - تاریخ تمدن سندھ، ۱۹۵۹ء
۵۵- محمد اسماعیل عرسانی - چار مقالا، ۱۹۶۷ء
۵۶- شیخ محمد فاضل - سرے جا سر موڑ (غیر مطبوعہ)
۵۷- موتی رام راموانی - رتن جوت، دو حصے، ۱۹۵۸ء اور ۱۹۵۹ء
۵۸- محمد سومار شیخ - کلام مرکھاں شیخن، ۱۹۷۱ء
۵۹- " " - بیت ورندو، ۱۹۷۲ء

۶۰- رچرڈ برٹن - سندھ ائین سندھو ماتھر میں وینڈڙ قومون، سندھی ترجمہ - حنیف صدیقی، ۱۹۷۱ء
۶۱- مخدوم عبداللہ نرئے وارو - کنزالعبرت
۶۲- " " - قمرالمنیر
۶۳- مرزا علی قلی بیگ - سچل سر مست جو رسالو، ۱۹۰۲ء
۶۴- مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوی - قوت العاشقین، ۱۹۱۵ء
۶۵- " " - بناء الاسلام، ۱۹۰۶ء
۶۶- گدومل ھرجانی - دیوان بیدل، ۱۹۴۰ء
۶۷- عبدالحسین شاہ موسوی - دیوان بیدل، ۱۹۵۴ء
۶۸- " " - دیوان بیکس، ۱۹۶۵ء
۶۹- انندرام طوطلداس - فقیر بڈھل جو رسالو، ۱۹۶۶ء
۷۰- لطف اللہ بدوی - کنڈڑی وارن جو کلام
۷۱- مقبول احمد بھٹی - کلیات مصری شاہ
۷۲- سید فاضل شاہ - کافین جو کتاب
۷۳- اشرف شاہ کامارائی - رسالو اشرف شاہ
۷۴- سید رکھیل شاہ صوفی - بحرالعشق (رسالو رکھیل شاہ)، ۱۹۶۸ء
۷۵- عبدالکریم پلی - ونجارن وایون، ۱۹۶۱ء
۷۶- ھدایت علی نجفی - رسالو فقیر دریا خان (غیر مطبوعہ)
۷۷- " " - رسالو نشان علی فقیر (")
۷۸- میمن عبدالمجید سندھی - تذکرۂ شعرائے سکھر، ۱۹۶۵ء
۷۹- مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی - سہ ماھی الرحیم، سوانح نمبر
۸۰- " " - الرحیم، ۱۹۶۸ء نمبر ۱
۸۱- روزنامہ الوحید، سندھ آزاد نمبر - ۱۹۳۶ء
۸۲- "پورب" - مخزن سندھی شعبہ، سندھ یونیورسٹی، ۶۹-۱۹۶۸ء
۸۳- ماھنامہ نئیں زندگی - سندھ نمبر، سال ۱۹۷۰ء
۸۴- مختلف قلمی بیاضیں۔

اشاریہ

ظ

ع

ک

ن

تیار کردہ
اعجاز محمد صدیقی
منیجر، سندھ یونیورسٹی پریس،
حیدرآباد سندھ۔